The Future of Freedom

کا ترجمہ

جمہوریت کا مستقبل

فرید زکریا

ترجمہ: باسط اعجاز

مشعل

تعارف

عہد جمہوریت

ہم عہد جمہوریت میں زندہ ہیں۔ گذشتہ ایک صدی کے دوران اس واحد رجحان نے عالمی حالات کے تعین میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔1900ء میں کسی ملک میں ایسی کسی چیز کا کوئی وجود نہ تھا جسے آج ہم جمہوریت کہتے ہیں۔ ایسی حکومت جسے ہم لوگ انتخاب کے ذریعے سامنے لاتے ہیں اوران میں ہر بالغ شہری اپنی رائے کا اظہار کرسکتا ہے۔ آج یہ نظامِ حکومت119 ممالک تک پھیل چکا ہے جو ساری دنیا کا62 فیصد ہیں۔ کسی زمانے میں جو وطیرہ شمالی اٹلانٹک(North Atlantic) کی چند ریاستوں کا تھا۔نوع انسان کے لیے ایک مثالی طرز حکومت قرار چکا ہے۔ بادشاہت عہد رفتہ کا حصہ ہے' فاشزم اور کمیونزم ترک کیے جا چکے ہیں۔ دنیا میں بسنے والے بیشتر افراد کے خیال میں ایک ہی راستہ ہے جس سے وہ اپنی حکومت کا جواز ثابت کر سکتے ہیں: جمہوریت۔ اسی لیے مصر کے حسنی مبارک(Hosni Mubarak) اور زمبابوے کے رابرٹ موگابے(Rober Mugebe) جیسے آمر ہزاروں منتیں کر کے انتخابات کرواتے ہیں۔ یہ علیحدہ بحث ہے کہ ان میں بالآخر کامیاب وہ خود ہی قرار پاتے ہیں۔ جب جمہوریت کے دشمن بھی اس کی زبان بولنے لگیں اور اس کے طور طریقے اپنانے لگیں تو جان لیں کہ جمہوریت نے میدان مار لیا ہے۔

ہم ایک دوسرے مفہوم سے بھی عہد جمہوریت میں زندہ ہیں اور یہ مذکورہ بالا مفہوم سے کہیں وسعت کا حامل ہے۔ یونانی زبان کے مادہ کے لفظ''ڈیموکریسی'' (اردو مترادف جمہوریت) کا مطلب ہے''(لوگوں) جمہور کی حکومت''۔اور آج ہم ساری دنیا میں طاقت و اختیارات کا نیچے کی طرف مستقبل دیکھ رہے ہیں۔ میں اس سارے عمل کو''جمہوریتانا'' کہتا ہوں کیونکہ اگرچہ یہ عمل صرف سیاست تک محدود نہیں رہا مگر اسکی نوعیت ایک ہی ہے: طبقاتی

تقسیم مٹ رہی ہے، سماج کے جن پہلوؤں اور نظاموں تک عوام کی رسائی نہیں تھی وہ ان پر آشکار ہورہے ہیں اور عوامی دباؤ سماجی تبدیلی کا محرک قرار پایا ہے۔ جمہوریت ایک نظام حکومت سے بدل کر طرز زندگی کا روپ دھار چکی ہے۔

اقتصادیات کے میدان کو ہی لیجیے۔ آج کا سرمایہ دارانہ نظام ماضی کی طرح عالمگیر، معلومات افزاء اور مشینوں اور آلات پر منحصر نہیں مگر یہ جمہوری ہے، اور اس میں نیا پن ہے۔ گزشتہ پچاس برسوں کی اقتصادی ترقی نے بچت اور سرمایہ کاری کو عوامی رنگ دیکر صنعتی ممالک کے کروڑوں افراد کو دولت سے نہال کر دیا ہے۔ اور سماجی ڈھانچے خود کو ان حالات کے مطابق ڈھالنے پر مجبور ہیں۔ سماجی اقتصادیات کی طاقت جو صدیوں تک گنے چنے تاجروں، بنکاروں اور بیوروکریٹ کے قبضے میں تھی نیچے کی طرف منتقل ہو رہی ہے۔ آج کی بیشتر کمپنیاں— بلکہ بیشتر ممالک بھی— چند امیروں کو گھاس ڈالنے کی بجائے متوسط طبقے کو پسند کرتے ہیں۔ اس میں حق بجانب بھی ہیں کیونکہ بڑے بڑے سرمایہ کاری اداروں کے اثاثے کارکنوں کی پنشن نے بہت ہی گھٹا دیئے ہیں۔

ثقافت بھی جمہوری ہوگئی ہے۔ ایک زمانے میں جسے امیروں کا فیشن کہا جاتا تھا آج سماج کی ثقافتی زندگی کا محور نہیں رہی۔ اب اس کا تعین پاپ موسیقی، فلمیں اور ٹی وی کرتے ہیں۔ ان تین کے ملاپ نے جدید دنیا کے لیے نیا ضابطۂ اخلاق اور ثقافتی حوالے ترتیب دیے ہیں جن سے سماج کا ہر فرد واقف ہے۔ حتیٰ کہ معاشرے میں برپا جمہوری انقلاب نے ثقافت کی تعریف ہی بدل ڈالی ہے: مثلاً پرانے نظام میں ایک گلوکارہ کی شہرت و عزت کا اندازہ اس سے لگایا جاتا تھا کہ اسے ''کون'' پسند کرتا ہے مگر آج شہرت کا معیار یہ ہے کہ اسے ''کتنے'' لوگ پسند کرتے ہیں۔ اس اصول پر میڈونا (Madonna) ہمیشہ جیسی نارمین (Jessye Norman) سے آگے رہے گی کیونکہ مقدار ہی معیار قرار پا چکی ہے۔

اس ڈارامائی تبدیلی کے محرکات کیا ہیں؟ کسی بھی دوسرے نمایاں سماجی مظہر کی طرح جمہوریت کی اس لہر کے پس پردہ بہت سی قوتیں کارفرما ہیں: ٹیکنالوجی کی انقلابی ترقی، متوسط طبقے میں بڑھتی ہوئی دولت اور سماج کو منظّم کرنے والے متبادل نظامات و نظریات کی ناکامی۔ ان نظامی محرکات میں ایک اور شامل کیجیے— امریکہ— جس کی سیاست و ثقافت تک جمہوری ہے۔ امریکہ کے عروج اور غلبے سے دنیا میں جمہوری انقلاب ناگزیر نظر آنے لگا

ہے۔ بہر حال اسکے محرکات کچھ بھی ہوں یہ طے ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں جمہوری لہر نے ایسے اثرات چھوڑے ہیں جن کے آثار ان کے رونما ہونے سے پہلے ہی دکھنے لگتے ہیں۔ طبقاتی تقسیم مٹ رہی ہے' فرد مضبوط ہو رہا ہے اور سماج سیاست کی حدوں سے کہیں آگے تک نیا روپ دھار رہا ہے۔ بلکہ اصل بات تو یہ ہے ہم جس دنیا میں سانس لے رہے ہیں اس کی خاص بات جمہوریتانے کا تصور ہی ہے۔

90ء کی ہنگامہ خیز دہائی میں ہم اکثر پڑھا کرتے تھے کہ ٹیکنالوجی اور انفارمیشن کو عام کر دیا گیا ہے۔ یہ قدرے نیا تصور ہے۔ کیونکہ ماضی میں ٹیکنالوجی یک مرکزیت اور طبقاتی و درجاتی تقسیم کو مضبوط کرتی تھی۔ مثال کے طور پر1910ء کے آخری انقلاب میں ریڈیو، ٹی وی، فلموں اور میگا فونز نے سماج کو ان مراکز کے تابع کر دیا۔اس ٹیکنالوجی نے معاشرے کو کسی خاص فرد یا گروہ کی رسائی میں کر دیا۔اسی لئے دشمن ملک کے ٹی وی اسٹیشن اور ریڈیو پر قبضہ کرنا اکیسویں صدی کی جنگی حکمت عملی کا کلیدی ہتھیار قرار پایا۔لیکن معلومات کے معاصر انقلاب نے حالات حاضرہ جاننے کے اس قدر سرچشمے مہیا کر دیئے ہیں کہ مرکزی کنٹرول ناممکن ہو کر رہ گیا ہے۔ انٹرنیٹ اس عمل میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ صحافی تھامس فریڈمین کے بقول، ''ہر کوئی رابطے میں تو ہے لیکن کسی کے کنٹرول میں نہیں۔''

ٹیکنالوجی اور انفارمیشن کو جمہوریانے کا مطلب ہے کہ کوئی بھی ان پر ہاتھ ڈال سکتا ہے؛ جیسا کہ بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں تک۔ ہم جانتے ہیں کہ اسامہ بن لادن 90ء کی دہائی میں حیاتیاتی ہتھیار کرنے کے منصوبے پر کام کر رہا تھا لیکن حیران کن امر یہ ہے کہ کابل میں القاعدہ کی الماریوں میں پڑی ہوئی سائنسی معلومات اور کتابچے کسی حکومت کی سرکاری تجربہ گاہ سے نہیں چرائے گئے تھے۔ یہ تمام دستاویزات انٹرنیٹ سے ڈاؤن لوڈ کی گئی تھیں۔ اگر آپ بھی انتھرکس یا زہر بنانے کے طریقے یا کیمیکلز کو ہتھیاروں میں استعمال کرنے کے طریقے جاننا چاہتے ہیں تو محض ایک بہترین سرچ انجن درکار ہے۔ پرزوں کا حصول بھی پہلے سے کہیں زیادہ سہل ہو چکا ہے۔ بیشتر اوقات آپ کو صرف معلومات ہی درکار ہوتے ہیں اور گزشتہ دہائی سے بڑے پیمانے پر ارد گرد بکھری پڑی ہیں۔ اب تو کیمیائی ٹیکنالوجی بھی عام دستیاب ہے۔ اسے تشدد کا جمہوریانہ کہہ لیجئے۔

یہ محض ایک پرکشش فقرہ نہیں ہے۔ تشدد کا عام ہو جانا بھی عصری دنیا کا ایک اساسی

—اور خوفناک—پہلو بن چکا ہے۔ سماج پر طاقت کے جائز استعمال کا اختیار صدیوں سے ریاست کے ہاتھ میں تھا۔فرد اور ریاست کے مابین طاقت کا یہی عدم توازن' امن اور جدید تہذیب کے شیرازے کی یکجائی کا ضامن تھا۔لیکن گزشتہ چند دہائیوں سے ریاست کا یہ اختیار بھی کمزور پڑ گیا ہے۔ اب چھوٹے چھوٹے گروپ بھی خوفناک کارروائیاں کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایک طرف تو دہشت گردی ریاست کے لیے ایک بڑا خطرہ بن کر ابھری ہے اور دوسری طرف اس وجہ سے اسے دوسرے محاذوں پر بھی سخت مقابلے کا سامنا ہے۔کاروبار، عوامی حکومتیں، غیر سرکاری تنظیمیں، ریاست کو کمزور کر کے مضبوط ہو رہی ہیں۔ ریاستوں کے مابین افراد، منشیات، دولت اور ہتھیاروں کی غیر قانونی آمدورفت اس کمزوری پر مہر تصدیق کرتی ہیں۔طاقت کے اس پھیلاؤ کے آگے بند نہیں باندھا جا سکے گا کیونکہ بڑے پیمانے پر ٹیکنالوجی، سماجی اور اقتصادی تبدیلیاں اس کی محرک ہیں۔ تاہم 11 ستمبر کے بعد ریاست اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ میدان جنگ میں واپس آ گئی ہے۔ پس دہشت کا یہ عہد سماج کے مقتدروں کو جمہوریانے والی قوتوں اور ریاست کے مابین سے عبارت ہو گا۔

ان باتوں کا مقصد جمہوریت کا کمتر نظام ثابت کرنا نہیں بلکہ بعض حالات میں اس نے حیران کن نتائج دیئے ہیں۔ ہم میں سے کون ایسے دور میں واپس جانا چاہے گا جب فرد کے پاس بہتر زندگی کے مواقع کم تھے اور وہ انتہائی مشکل اور مجبور زندگی گزار رہا تھا؟ تاہم کسی بھی بھرپور انقلاب کی طرح جمہوریت کے بھی کچھ تاریک پہلو تو ہیں لیکن ہم شاذ و نادر ہی ان پر بات کرتے ہیں۔ اگر کوشش بھی کریں تو فوراً ''پرانے خیالات'' کے الزام کے نیچے دھر لیے جائیں گے۔ اس کا مطلب ہے ہم کبھی بھی وقت سمجھنے کی کوشش سے باز نہیں آتے۔ کیونکہ ہمیں خود پر ''غیر جمہوری'' ہونے کے الزام کا خوف ہوتا ہے اسلئے یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ہماری زندگیوں میں جمہوریت کے اس بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے کیا کیا مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ ہم نے یہ فرض کر لیا ہے کہ جمہوریت کسی بھی مسئلے کو جنم نہیں دے سکتی۔ اس لیے جب ہمیں اپنے اردگرد سماجی، سیاسی اور اقتصادی مسائل کے انبار نظر آتے ہیں تو ان سے آنکھیں چرانے لگتے ہیں، انہیں کسی دوسرے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کا الزام دوسروں پر دھرتے ہیں لیکن اس انقلاب کا ذکر نہیں کرتے جو ہماری سیاسی' سماجی اور

اقتصادی زندگیوں کا محور بن چکا ہے۔

جمہوریت آزادی

امریکی ڈپلومیٹ رچرڈ ہالبروک (Richard Holbrooke) نے 1990ء میں یوگوسلاویہ کے متعلق کہا تھا، ''فرض کریں شفاف منصفانہ انتخابات میں نسل پسند، جنگجو اور علیحدگی پسند منتخب ہو جائیں تو کیا ہوگا۔'' یہی سوال گونگوں کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔'' صرف یوگوسلاویہ میں نہیں پوری دنیا میں یہی صورتحال ہے۔ مثال کے طور پر عالم اسلام کو درپیش مسائل چیلنجز کا جائزہ لیں۔ ان استحصال زدہ ممالک میں جمہوریت کی ضرورت تو محسوس ہوتی ہے مگر انتخابات کے نتیجے میں ملوکیت یا ایسے ہی حالات پیدا ہونے پر کیا کریں گے؟ جمہوریت کے نتیجے میں قائم ہونے والی حکومتیں ریفرنڈم کے ذریعے اپنے اقتدار کو طول دے کر یا دوبارہ منتخب ہو کر بیشتر حالات میں آئینی حدود کو بھی خاطر میں نہیں لاتیں اور اپنے شہریوں کو بنیادی حقوق سے محروم رکھنے لگتی ہیں۔ ساری دنیا میں ایسا ہی ہے۔ پیرو سے فلسطین، گھانا سے وینزویلا تک پھیلی اس صورت حال کو ''غیر لبرل یا غیر روشن خیال جمہوریت'' کہا جا سکتا ہے۔

مغرب کے لیے جمہوریت کا مطلب ہے ''روادار جمہوریت۔'' ایسا سیاسی نظام جس میں انتخابات نہ صرف شفاف ہوں بلکہ قانون کی حاکمیت، تقسیم اختیارات اور اظہار رائے، اجتماع، مذہب اور جائیداد جیسے بنیادی حقوق کی ضمانت دے۔ لیکن ان تمام آزادیوں اور حقوق، جنہیں ''آئینی رواداری'' کہا جا سکتا ہے، کا جمہوریت سے کوئی خاص سروکار نہیں اور ان کا ساتھ ـــ مغرب میں بھی ـــ دیرپا نہیں رہا۔ ہٹلر بھی تو آزاد انتخابات کے نتیجے میں ہی جرمنی کا چانسلر بنا تھا۔ مغرب میں گزشتہ پچاس برسوں کے دوران جمہوریت اور آزادی ایک دوسرے میں گھل مل گئے ہیں۔ لیکن روادار جمہوریت کے یہ دو پہلو جو مغربی کے سیاسی تانے بانے میں بُنے ہوئے تھے، ساری دنیا میں ان کا شیرازہ بکھرنے لگا ہے۔ جمہوریت تو پھل پھول رہی ہے ـــ مگر آزادی نہیں۔

وسطی ایشیا جیسے دنیا کے بعض حصوں میں انتخابات نے آمریت کی راہ ہموار کی جبکہ بعض میں یہ فرقہ وارانہ نسلی تصادم کا باعث بنی ہے۔ مثال کے طور پر یوگوسلاویہ اور انڈونیشیا

آج کے جمہوریت میں اس دور کی نسبت کہیں زیادہ کم جمہوری اور عدم روادار ہیں جب ان آمر (مطلق العنان حکمرانوں ''ٹیٹو اور سہارتو کے دور میں'') حکومت کرتے تھے۔اسی طرح اور بہت سی موجودہ غیر جمہوری ریاستوں میں انتخابات حالات میں خاطر خواہ بہتری نہیں لا پائیں گے۔ اگر آج عرب دنیا میں انتخابات کروائیں جائیں تو عین ممکن ہے موجودہ آمریت سے زیادہ عدم روادار، مغرب مخالف اور سامی کش قوتیں اقتدار میں آ جائیں۔

تیزی سے جمہوری ہوتی اس دنیا میں تبدیلی میں رکاوٹ بننے والی حکومتیں نیم فعال معاشروں کو جنم دیتی ہیں جیسا کہ عرب دنیا میں ہوا۔ایسے ممالک کی عوام اپنی سماجی حقوق کی صورتحال کے حوالے سے احساسِ کمتری محسوس کرتے ہیں کیونکہ سی این این' بی بی سی اور الجزیرہ جیسے ٹی وی چینلز پر متبادل نظامات کو دیکھتے رہتے ہیں۔لیکن نئ جمہوریتیں بھی ناکام ثابت ہوئی ہیں اور ان سے انتشار' گمراہی' تشدد اور استحصال کی نئ صورتوں نے جنم لیا ہے۔ ایران اور وینزویلا دیکھیں۔ یقیناً ان وجوہات کی بنیاد پر انتخابات ترک نہیں کر دینے چاہئیں' لیکن یہ منظر سوال ضرور اٹھاتا ہے کہ ان پریشان کن حالات کا سبب کیا ہے؟ ترقی پذیر ممالک کو مستحکم اور حقیقی جمہوری معاشروں کے قیام میں اس قدر رکاوٹوں کا سامنا کیوں ہے؟ کیا ہم عراق میں جمہوریت کے قیام جیسے چیلنج کا سامنا کریں اور اس میں کیونکر کامیاب ہوں گے؟

اولاً یہ واضح کیا جائے کہ سیاسی جمہوریت سے کیا مراد ہے؟ ہیروڈوٹس کے وقت سے اب تک اس کی تعریف ''لوگوں کی حکومت'' ہی کیا جاتا رہا ہے۔ بیشتر ہم عصر سکالر بھی جمہوریت کو حکومت کے انتخاب کا عمل ہی گردانتے ہیں۔آج کے سرکردہ سیاسی سائنسدان سیموئیگل پی ہنٹگٹن (Samuel P. Huntington) اپنی کتاب The Third Wave میں لکھتے ہیں:

> ''عام، آزاد اور منصفانہ انتخابات ہی جمہوریت کا عین ہیں اور اس شناختی علامت سے جان نہیں چھڑائی جا سکتی۔ انتخابات کے نتیجے میں غیر فعال، کرپٹ، تنگ نظر، غیر ذمہ دار اور مخصوص ایجنڈا رکھنے والی اور عوامی مفاد کی پالیسیاں اپنانے میں ناکام حکومتیں وجود میں آ سکتی ہیں۔ ایسی پالیسیاں انہیں ناپسندیدہ تو بنا دیتی ہیں مگر غیر جمہوری نہیں ہوتیں۔ جمہوریت عوامی

بھلائی کا محض ایک راستہ ہے' نہ کہ بذات خود بھلائی ہے۔ دوسری سماجی بھلائیوں اور برائیوں سے جمہوریت کا رشتہ اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جب دوسرے سیاسی نظام کی بنیادی خصوصیات سے فرق واضح کیا جائے۔''

یہ تعریف جمہوریت کے متعلق رائے عامہ سے بھی مطابقت رکھتی ہے۔ جب کوئی ملک کثیر الجماعتی انتخابات منعقد کرائے تو ہم اسے ''جمہوری'' کہتے ہیں اور جب ملکی سیاست میں عوامی شمولیت بڑھ جائے— مثلاً عورتوں کو ووٹ کا حق دینا— تو یہ اور زیادہ جمہوری کہلانے لگتا ہے۔ یقیناً انتخابات کا آزاد اور منصفانہ ہونا بہت ضروری ہے مگر اس کے لیے آزادی رائے اور اجتماع کی ضمانت دینا لازم ہے۔ لیکن ان بنیادی شرائط کو نظر انداز کر کے کسی ریاست کو مخصوص سیاسی' اقتصادی اور مذہبی نظام کی ضمانت دینے سے ہی جمہوری کہنا ''جمہوریت'' کو بے معنی کر دیتا ہے۔ سویڈن کا اقتصادی نظام انفرادی جائیداد کی محدود اجازت دیتا ہے' فرانس میں کچھ عرصہ قبل تک ٹی وی ریاست کے زیر اثر تھا اور برطانیہ میں بھی ایک سرکاری مذہب ہے۔ لیکن یہ سب جمہوری ریاستیں کہلاتے ہیں۔ ''جمہوریت'' ہونے کا مطلب ہے، موضوعی لحاظ سے، ''اچھی حکومت'' اسے بے معنی بنا دیتی ہے۔

دوسری طرف آئینی آزاد خیالی حکومت کے انتخاب کا طریقۂ کار نہیں بلکہ اس کے منتہائے مقصود کا نام ہے۔ یہ مغرب کی اس قدیم روایت کی طرف اشارہ ہے کہ حکومت استحصال کی کسی بھی صورت--- ریاست' مذہب یا سماج--- کے خلاف فرد کی آزادی اور عزت نفس کی حفاظت کرے۔ اس اصطلاح میں دو کم و بیش مماثل تصورات کو اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ یہ اپنے فلسفیانہ ماخذ، جس کا آغاز یونانی اور رومیوں سے ہوئی جس میں میں فرد کی آزادی پر زور دیا گیا، کے حوالے سے آزاد خیال (لبرل)* ہے۔ جب کہ اس لحاظ سے آئینی ہے کہ قانون کی حاکمیت کو سیاست کا محور گردانتی ہے۔ آئینی آزاد خیالی کا آغاز مغربی یورپ اور امریکہ میں زندگی' جائیداد' مذہب اور تقریر کے حق کے لیے فرد کی حفاظت کے طور پر

---

*میں نے یہاں لبرل ازم یا آزاد خیال کی اصطلاح کو 19 ویں صدی کے معنوں میں استعمال کیا ہے نہ کہ ''جدید امریکی'' مفہوم میں۔ اول الذکر میں فرد کی معاشی، سیاسی اور مذہبی آزادی سے سروکار رکھا جاتا ہے، اسے ''کلاسیکل لبرل ازم'' بھی کہتے ہیں۔ جبکہ موخر الذکر میں اسے سے مراد فلاحی ریاست، مثبت اقدامات اور دوسری حکمت عملیاں لی جاتی ہیں۔

ہوا تھا۔ اس کے لیے حکومتی اختیارات پر قدغن، قانون کی حاکمیت، غیر جانبدار عدلیہ اور مذہب اور سیاست میں تقسیم پر زور دیا گیا۔ معمولی فرق کے ساتھ' آئینی آزاد خیالی کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ ہر انسان بعض فطری حق رکھتا ہے جنہیں اس کی ذات سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اور حکومت کو ان کی حفاظت کے لیے ایک بنیادی قانون منظور کرنا چاہئے جس میں اسکے اپنے اختیارات کو محدود کیا گیا ہو۔ اس طرح 1215ء میں رنیمیڈ کے مقام پر برطانوی جاگیرداروں نے بادشاہ کو اپنے اختیارات پر قدغن لگانے پر مجبور کر دیا۔ امریکی مقبوضہ علاقوں میں 1638ء میں ہارٹ فوڈ قصبے نے جدید تاریخ کا پہلے تحریری آئین پر عمل درآمد کا آغاز کر دیا۔ 1789ء میں امریکی آئین نے نئی ریاست کے لیے ایک نظری ڈھانچہ تشکیل دیا۔ 1975ء میں مغربی اقوام نے غیر جمہوری ریاستوں کے لیے بھی ایک ضابطۂ اخلاق مرتب کر دیا۔ میگنا کارٹا (Magna Carta)، ریاست کونکٹیکٹ کے بنیادی قوانین (Fundamental Orders of Connecticut)، امریکی آئین (American Constitution) اور ہیلسنکی کا فائنل ایکٹ (Helsinki Final Act) سب آئینی آزاد خیالی کا مظہر ہیں۔

1945ء سے لے کر مغرب حکومتوں نے بیشتر اوقات جمہوریت اور آئینی آزاد خیالی کو ، بیک وقت اپنایا ہے۔ اس لیے ان دونوں کو علیحدہ تصور کرنا مشکل ہے-- چاہے یہ غیر آزاد خیال جمہوریت کی شکل میں ہو یا آزاد خیال مطلق العنائیت کے روپ میں۔ دراصل یہ دونوں کسی نہ کسی صورت میں نہ صرف ماضی میں موجود تھے بلکہ حال میں بھی وجود رکھتے ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز تک مغربی یورپ کی بیشتر ریاستیں یا تو آزاد خیال آمریتیں تھیں یا نیم جمہوریتیں۔ آبادی کا محدود حصہ ووٹ ڈال سکتا تھا اور قانون ساز اداروں کے منتخب اراکین کے اختیارات بھی محدود تھے۔ 1830ء میں برطانیہ، جو یورپ کی جمہوری ترین ریاست تھی، میں پارلیمنٹ کے انتخاب کے لیے کل آبادی کے بمشکل 2 فیصد حصے کو ووٹ کا حق تھا۔ بیشتر مغربی ریاستیں 1940ء کی دہائی کے آخر میں مکمل جمہوریتیں بنیں اور بالغ حق رائے دہی کو متعارف کرایا۔ لیکن اس سے ٹھیک ایک سو برس قبل، 1840ء میں، ان میں سے بیشتر نے قانون کی حاکمیت، ذاتی جائیداد، اظہار رائے اور اجتماع کا حق تسلیم اور اختیارات کو تقسیم کر کے آئینی آزاد خیالی کو اپنا لیا تھا۔ جدید تاریخ کے بیشتر حصے میں یورپ اور شمالی امریکہ کی

بنیادی خصوصیت آئینی آزاد خیالی تھی اور اسی خصوصیت نے ان ریاستوں کو باقی جمہوریتوں سے ممتاز کیا۔ مغربی طرز حکومت کی ''نمائندہ خصوصیات'' عوامی انتخابات نہیں، غیر جانبدار عدلیہ ہے۔

جزیرہ ہانگ کانگ کی ننھی منی ریاست کئی دہائیوں تک اس کا منہ بولتا ثبوت رہی کہ شہری آزادی کا تعلق جمہوریت سے قطعاً نہیں ہے۔ اس میں آئینی آزاد خیالی کا معیار تو دنیا میں سب سے بلند تھا مگر یہ کسی بھی صورت میں جمہوریت نہ تھی۔ حتی کہ 1990ء میں ہانگ کانگ کی چین کو حوالگی کا وقت قریب آنے پر کئی مغربی اخبارات اور رسائل اول الذکر کی جمہوریت کو پہنچنے والے نقصان کی باتیں کرنے لگے۔ لیکن اس میں کوئی جمہوریت تھی ہی نہیں جس کی بات کی جاتی دراصل یہ خطرہ ہانگ کانگ کی آزادی کی روایات کو تھا۔ آئندہ بھی ہم آج ان دونوں تصورات کو گڈ مڈ کرنا جاری رکھیں گے۔ امریکی اور اسرائیلی سیاستدان اکثر فلسطین اتھارٹی کو غیر جمہوری ہونے پر تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ مگر پوری عرب دنیا میں یاسر عرفات ہی واحد رہنما تھے جو قدرے آزادانہ انتخابات کے ذریعے منتخب ہوئے ہوں۔ فلسطینی اتھارٹی کا مسئلہ جمہوریت نہیں۔۔۔ جو بری طرح ناکام ہونے کی وجہ سے ادھوری ہے۔۔۔ بلکہ آئینی آزاد خیالی یا اس کا غیر موجود ہے۔

دنیا میں جہاں کہیں بھی جمہوریت اور شہری آزادی میں تصادم کا خطرہ ہوتا ہے امریکی خاص طور پر اس سے پریشان ہو جاتے ہیں۔ جمہوری نظام کے تحت جنوبی امریکہ میں غلامی کو جائز قرار دیا گیا تھا، جب جمہوریہ کا وجود عمل میں آیا تو غلامی کے مخالفین گومگوں کی کیفیت سے دوچار ہو گئے کیونکہ جنوب کے تمام رائے دہندگان اس کے پرجوش حامی تھے۔ بالآخر اس کا خاتمہ رائے عامہ سے نہیں کیا گیا بلکہ شمال نے جنوب کو شکست دے کر اسے فتح کر لیا۔ اور پھر جنوب میں غلامی کی جگہ لینے والے ''جم کرو نظام (Jim Crow)'' کا خاتمہ بھی 1950ء سے 60ء کی دہائی میں جمہوریت سے نہیں بلکہ اس کے برعکس حالات میں ہوا۔ اگرچہ 1964ء کا شہری حقوق کا قانون، جو آزادی کے لئے حرف آخر ثابت ہوا، کانگرس نے منظور کیا لیکن ماضی میں اس قسم کی پیش قدمیاں ہمیشہ افسرانِ بالا کے توسط سے ہوتی تھیں، جیسا کہ فوجوں میں امتیازی سلوک، سپریم کورٹ میں درخواست دائر کرنا وغیرہ۔ آزادی اور جمہوریت کا آپس میں متصادم حالت آنا امریکہ کا ایک المیہ رہا ہے۔

امریکی ماڈل

1990ء کی دہائی میں ایک امریکی دانشور کازکستان کی نئی پارلیمنٹ کو انتخابی قوانین کی تشکیل میں مدد دینے کی غرض سے روانہ ہوا۔ اس نے بہت سی تجاویز پیش کیں لیکن اس کا کازک ہم منصب یہ کہہ کر رد کرتا چلا گیا ''ہم اپنی پارلیمنٹ بالکل ویسی ہی چاہتے ہیں جیسے تمہاری کانگریس ہے۔'' وہ امریکی خوفزدہ ہوگیا اور آج بھی وہ واقعہ یاد کرتا ہے: ''میرے ذہن میں یہی الفاظ آئے: ''نہیں تم نہیں کرو گے!'' یہ تصور غیر معمولی نہیں۔ در اصل جمہوریت کے کاروبار میں امریکی اپنے نظام کو ایسا ناقابل استعمال خیال کرتے ہیں کہ کوئی دوسرا ملک اسے کام میں نہیں لاسکتا۔ امریکی آئین کے پس پردہ کارفرما فلسفہ، اجتماعی قوت کا خوف، معاصر حالات پر اسی قدر لاگو ہوتا ہے جس قدر 1789ء میں۔ کازکستان میں امریکی کانگریس کی طرز پر مضبوط پارلیمنٹ وجود میں آجاتی تو اس کا انتظام انصرام میں کافی حد تک آسان رہتی کیونکہ صدر کی ہوس پر کڑی نظر رکھنا ممکن ہوتا۔

بہت عجیب بات ہے کہ امریکہ نے دوسرے ممالک میں لامحدود جمہوریت کا حامی رہا ہے۔ اس کے اپنے نظام کی امتیازی خصوصیت اس کا جمہوری ہونا نہیں بلکہ یہ ہے کہ یہ کس قدر غیر جمہوری ہے، کہ اس میں منتخب اکثریتوں پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ حقوق کا بل ان کاموں کی فہرست ہے جو حکومت اکثریتی مطالبے کے باوجود انجام نہ دینے کا حق رکھتی ہے۔ امریکی حکومت کے تین شعبہ جات میں سے سپریم کورٹ--- جو یقیناً اہم ترین ہے--- کے سربراہ نو غیر منتخب مرد اور خواتین ہیں جو اس کے تاحیات رکن ہیں۔ امریکی سینٹ دنیا کا غیر نمائندہ ترین ایوان بالا ہے۔ ہر ریاست، آبادی سے قطع نظر، دو سینیٹر واشنگٹن بھیجتی ہے۔ اس طرح 30 ملین آبادی کی ریاست کیلیفورنیا کی سینٹ میں وہی نمائندگی ہے جو 3.7 ملین کی ریاست ایری زونا ہے، اس طرح بمشکل فی شہری ایک ووٹ آتا ہے*۔ امریکہ کے وفاقی اور ریاستی قانون سازی کے متعلق جہاں کہیں امر اکثریتی جماعت کی طاقت نہیں، بلکہ

*امریکی جمہوریت کے اس پہلو نے بہت تباہ کن اثرات مرتب کئے ہیں۔ کیونکہ کم آبادی والی چھوٹی ریاستوں کو سیاسی اثر و رسوخ اور مالی سبسڈی کا حق دار بنا دیا ہے۔ آج بھی امریکی جمہوریت ان ''غیر جمہوری'' خصوصیات سے بہت فائدے حاصل کرتی ہے۔

وہ تحفظات ہیں جو اقلیتی جماعت کو فراہم کیے جاتے ہیں، اور یہ فائدے عموماً ہر فرد کو حاصل ہوتے ہیں۔ ذاتی کاروبار اور دوسرے غیر سرکاری ادارے--- جسے ایلکس دی ٹوکویل ''انٹر میڈیٹ ایسوسی ایشن کہتا ہے— سماج کی ایک اور فیصلہ کن قوت کا تعین کرتے ہیں۔ پس سول سوسائٹی کے اس بھر پور تانے بانے نے امریکی جمہوریت کی شکل وصورت بنانے تاہم وقت کے ساتھ ساتھ یہ کمزور ہو

جمہوریت کا سیدھی راہ دکھانے والی تمام قوتیں تیزی سے ختم کی جارہی ہیں۔

ان سب قوتوں کی جگہ رائے عامہ کے جائزوں نے لے لی ہے۔کل کا مورخ ہمارے دور کا ذکر کرتے ہوئے لوگوں کے مزج تلاش کرنے کی مسلسل اور نہ ختم ہونے والی پیاس پر بھونچکا رہ جائے گا۔ سیاستدان، کاروباری ادارے، صحافی، سوشل سکیورٹی سے لے کر حیات بعد الموت اور کاربونیٹڈ مشروب تک عوامی رائے جاننے کی کوشش میں اپنا وقت' پیسہ اور توانائیاں صرف کرتے ہیں۔ دراصل یہ ایک دوڑ ہے یہ ثابت کرنے کی کہ کون لوگوں کو سب سے پہلے ان کا خیر خواہ ہونے کا یقین دلاتا ہے۔ رائے شماری کرانے والے ادارے ہمارے نئے خیر خواہ ہیں جو عوامی رائے کی تشریح وتوضیع اسی تندہی سے کرتے ہیں جس سے ان کے پیشترو مرغی کے اعضا کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ لیکن انتڑیوں کی طرح کبھی کبھار رائے شماری بھی مبہم ہوسکتی ہے یا لوگ اپنی رائے بدل سکتے ہیں۔--اور اکثر ایسا ہوتا— پھر نئے رجحان کا پتہ چلانے کے لئے چوہوں کی طرح نئی دوڑ شروع ہو جاتی ہے۔2000ء میں جن اشخاص کو کاروبار کا نابغہ سمجھ کر پوجا گیا2002ء میں دھوکے باز اور بدمعاش تصور کیے جانے لگے۔1994ء کے انتخابات کی فتح کا منصوبہ ساز نیوٹ جنگرک ایک برس بعد ہی انتہا پسند بن گیا۔ اور جب صدر بل کلنٹن کا تاثر ایک بدمعاش سے سیاسی دیوتا میں تبدیل ہوا۔ اس ساری بھیڑ چال میں صرف ایک قدر ہی مشترک ہے: امریکی عوام کو اپنی خیر خواہی کا یقین دلانا۔ ٹیکس کم کرنے اور زیادہ حکومتی مراعات کے عوامی مطالبے کی وضاحت کرتے ہوئے بھی ایک سیاستدان یہی کہتا رہے گا''امریکی عوام احمق نہیں ہے۔'' دوسرا کہے گا،''لوگ جاننا چاہتے ہیں،'' لیکن دراصل یہ سوال صرف اسی ایک سیاستدان کا ہے اور صرف وہی جاننا چاہتا ہے۔ تیسرا اعلان کرے گا،''ہم امریکی عوام سے سنا ہے''، اور یوں لگتا ہے جیسے اسے کوئی الہام ہوا ہے۔آج کے دور میں ایک عام سے بات کو اگر امریکی عوام سے منسوب کر دیا جائے تو بائبلی پیشن گوئی کے برابر اہم ہوسکتی ہے۔*

آزادی اور پابندی

دوسری طرف عوام کسی مسئلے کا بہت جلد ادراک کر لیتے ہیں۔ آج امریکی اپنے سیاسی

*امریکہ کے بارے میں تمام تصورات کی طرح (باقی حاشیہ اگلے صفحے کے آخر پر)

نظام سے جس قدر نفرت کرنے لگے ہیں پہلے کبھی ایسا نہیں تھا اور اس میں وہ تنہا نہیں۔ یورپ کے بیشتر ممالک کے شہریوں کی اپنی سیاست کے بارے میں رائے بدل گئی ہے۔ دراصل موجودہ حالات میں انتظامیہ مخالف عوامی رائے کا ظہور بتاتا ہے کہ یہ رجحانات پہلے ہی جڑ پکڑ چکے تھے اور اب منظر عام پر آئے ہیں۔ لیکن ان سب کے سامنے آنے کا وقت کچھ اچھا نہیں ہے۔ مغربی جمہوری ریاستیں دہشت گردی، امیگریشن اور ثقافتی تصادم جیسی اساسی للکاروں کے دباؤ میں ہیں۔ حکومتوں کا فرض ہے سماج کو نئے خطرات محفوظ رکھیں، فلاحی ریاست کی تعمیر نو کریں اور ثقافتی حالت جنگ میں آئے بغیر امیگریشن کی حوصلہ افزائی کریں۔ لیکن سیاسی نظام عدم فعلیت کی حالت میں جس قدر آج ہے پہلے کبھی نہیں تھا۔ کسی خاص مسئلے پر مسلسل مہم چلانا، سیاسی دلالی، پیسہ اکٹھا کرنا، ذاتی مفادات اور ایک دوسرے کی کردار کشی کرنا، ان سب عوامل نے سیاسی عمل کو لوگوں کی نظروں میں بہت گرا دیا ہے۔ اس کا نتیجہ ووٹوں کی شرح میں کمی کی صورت میں نکلا ہے۔ مغرب کا جمہوری نظام ساری دنیا کے لیے لائق تقلید ہے لیکن دور آسمان میں کسی تابندہ ستارے کی مانند ممکن ہے مغربی جمہوریتیں اپنی جڑوں سے کھوکھلی ہو رہی ہیں؟

بہت سے لوگوں کی رائے اس کے برعکس ہے۔ ان کا خیال ہے سماج کے ہر شعبے میں بڑھتے ہوئے جمہوری رجحانات اسکے لئے بے مثال خیر ہیں۔ پرانے نظام کے خاتمے اور ہر فرد کے بااختیار ہونے کا لازمی نتیجہ بالآخر انفرادی آزادی اور مسرت کی صورت میں نکلے گا۔ 1990ء کی دہائی کے آخر میں ایک مشاوراتی ادارے ایسنچوئر نے اپنے ایک دوربین تجزیہ کی تعریف میں چند اشتہارات شائع کیے۔ ان میں سے ایک تھا ''انٹرنیٹ چین میں جمہوریت لائے گا'' اور اس کے بعد یہ جملہ تھا ''اب یہ دلچسپ ہے'' اب جب کہ ڈاٹ کام دور کا جوش و

(حاشیہ صفحہ 12) ٹوکولی نے یہ بات سب سے پہلے اور بہترین انداز میں کہی تھی: ''قدیم بادشاہت کے دور میں فرانسیسیوں نے ایک سنہری اصول قائم کر رکھا تھا کہ بادشاہ کوئی غلطی نہیں کر سکتا اور اگر وہ کرے تو اسے وزیروں سے منسوب کیا جائے گا۔ . . . امریکی یہی اصول اکثریت کی نسبت سے لاگو کرتے ہیں۔'' کم وبیش اسی انداز میں مائیکل وین نے ''نیو ری پبلک'' میں لکھے اپنے مضامین ایک کتاب میں جمع کئے ہیں اور انہیں امریکی عوام سے مخاطب ہوتے ہوئے ایک دلچسپ عنوان دے دیا ہے ''بڑے بچے۔''

خروش ٹھنڈا پڑ گیا ہے ٹیکنالوجی ماہرین کہتے ہیں کہ ابھی انٹرنیٹ اپنے بچپن میں ہے۔ لیکن وقت ایسا آئے گا جب یہ چین میں جمہوریت' ہندوستان میں خوشحالی لائے گا اور ہم سب کو بینکار' وکیل' ایڈیٹرز حتی کہ قانون ساز بھی بنا دے گا۔ یہ آخری رجحان کیلیفورنیا جیسی ریاستوں میں پہلے ہی سامنے آچکا ہے۔ یہاں ریفرنڈم کے ذریعے حکومت کے اصول پر عمل ہو رہا ہے۔ دوسرے لوگ ان کی تقلید کر رہے ہیں' تو آپ مزید جمہوریت کے خلاف کیونکر بحث کر سکتے ہیں؟

لیکن کیسا رہے گا اگر آزادی انتشار سے نہیں منظّم انداز سے آئے۔۔۔ بے قابو اور براہ راست طریقے سے نہیں بلکہ کنٹرول اور نمائندہ جمہوریت بن کر؟ کیا ہو کہ ہمیں قواعد وضوابط اور پابندیوں کی ضرورت ہو؟ اور کیا ہو جب آزادی کی ضمانت اسی صورت میں دی جا سکے ہے جب قواعد کا نظام مضبوط ہوں؟ جدید آزاد خیال جمہوریت اسی متبادل نظریہ کی پیداوار ہے۔ مغرب میں ہم جس جمہوریت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں ارسطو ''ملی جلی حکومت'' کہتا ہے۔ یقیناً اس میں منتخب حکومت تو ہے لیکن آئینی قوانین اور حقوق ہیں، آزاد عدلیہ ہے، مضبوط سیاسی جماعتیں، مذہب، کاروبار، غیر سرکاری ادارے اور خدمات مہیا کرنے والوں کا اعلیٰ طبقہ ہے۔ سیاسی جمہوریت اس پورے نظام کا لازمی اور فیصلہ کن حصہ تھی۔ اقتدارِ اعلیٰ عوام کے پاس تھا۔ لیکن یہ پیچیدہ نظام ضرور تھا جس کے سارے نہیں تو بیشتر شعبہ جات انتخابات کے ماتحت تھے۔ یقیناً ان متعدد غیر جمہوری اداروں اور گروہوں کا مقصد عوامی جذبات کو ٹھنڈا کرنا' شہریوں کو باشعور بنانا اور جمہوریت کی راہنمائی کر کے آزادی کی ضمانت دینا ہے۔ ہارورڈ لاء سکول اپنے طلباء کو گریجویٹ کی ڈگری دیتے ہوئے یاد دلاتا ہے کہ ''قانون پر حکمت پابندیاں ہیں جو انسان کو آزاد کرتی ہیں'' قومی ترانہ ''خوبصورت امریکہ'' بھی یہ اعلان کرتا ہے ''امریکہ امریکہ! خدا تمہاری ہدایت کرے اپنے آپ پر قابو رکھو، تمہاری آزادی قانون کی اطاعت میں ملی ہے۔''

یہ کتاب خود اختیاری اور جمہوریت و آزادی کے درمیان توازن کی بحالی کا مطالبہ ہے۔ یہ جمہوریت کے خلاف نہیں۔ لیکن یہ ضرور کہا گیا ہے کہ ایسی صورتِ حال پیدا ہو سکتی ہے جسے جمہوریت کی زیادتی کہا جا سکتا ہے۔۔۔ ایک اچھی چیز کا حد سے تجاوز کر جانا۔ آزاد خیال جمہوری سیاست کا منتہائے مقصود متنوع عناصر سے بھرپور سماجی نظام کا قیام ہے نہ کہ

ایسا معاشرہ قائم کر دیا جائے جس میں ایک ہی طرزِ فکر کے لوگ غالب ہوں۔ امریکہ کے بانی بھی ایک ایسے وقت میں متنوع مزاج معاشرہ قائم کرنا چاہتے تھے جب اکثریت یک مذہبی سماج کی قائل تھی۔ جمہوریت بھی ایک کلی تصور ہے اور دوسرے تمام تصورات کی طرح اس کی بھی حدود ہیں۔ یقیناً ایک قانون ساز ادارہ جس طرح کام کرتا ہے کارپوریشن اس طرح نہیں کرتی۔

بحالی کا مطلب یہ نہیں کہ پرانے نظام کی تجدید کی کوشش کی جائے۔ ہم ان جمہوری تبدیلیوں کو پسند کرتے ہیں جو ہماری زندگیوں میں رونما ہوئیں اور ان کی کامیابیوں کی تعریف بھی کرتے ہیں۔ لیکن میرا منتہائے مقصود انیسویں صدی کی آزاد خیال جمہوریت نہیں بلکہ وہ ہے جس پر اکیسویں صدی میں عمل درآمد ہونا چاہیئے۔ جمہوری معاشروں کو نئے راہنما اصولوں اور رنگ ڈھنگ درکار ہیں جو جدید دور اور اس کے پیدا کردہ مسائل کے لیے ہوں۔ لیکن اس کے لیے ہمیں ماضی میں لوٹنا ہوگا--- اس دور میں جب مغرب میں آزادی اور جمہوریت کی جدو جہد کا آغاز ہوا اور وہاں سے یہ ساری دنیا میں پھیل گئی۔ اگر ہم زندگی، آزادی اور خوشی کی ازلی خواہش کو پانا چاہتے ہیں تو ان قوتوں کو واپس لانا ہوگا جنھوں نے ان کو اولین جنم دیا۔ آزادی کا ماضی سمجھ کر ہم اس کا مستقبل محفوظ بنا سکتے ہیں۔

باب اول

انسانی آزادی کی جامع تاریخ

یہ اس وقت کی بات ہے جب قسطنطین نے نقل مکانی کا فیصلہ کیا۔234ء میں دنیا کی سب سے بڑی طاقت کے سربراہ نے اپنا پایۂ تخت روم سے بحیرہ اسود کے کنارے واقعہ قدیم یونانی آبادی میں بازنطین لے جانے کا فیصلہ کرلیا اور اس کا نام قسطنطنیہ رکھا۔ روم جو سلطنت کی عظمت کی نشانی تھا' کو کیوں چھوڑا گیا؟ اس کا جواب قسطنطین کے پاس صرف ایک ہی تھا: ''حکم خداوندی۔'' اس قسم کی دلیل کو آپ رد نہیں کر سکتے۔ اگرچہ اس کے پس پردہ نمود و نمائش اور نقل مکانی کی خواہش تو کارفرما ہوگی۔ یقیناً قسطنطنین دنیا میں اپنا نشان چھوڑنا چاہتا تھا اور جنگ جیتنے کے بعد اس کا بہترین طریقہ کیا ہوسکتا ہے کہ نیا دارالحکومت تعمیر کر دیا جائے۔ سیاسی حوالے سے بھی یہ تبدیلی بہت مفید تھی۔ قسطنطنیہ معاصر ثقافتی و اقتصادی مراکز 'ایتھنز اور انطاکیہ وغیرہ سے زیادہ قریب تھا۔ جغرافیائی حوالے سے بھی یہ ایسے مقام پر تھا جہاں سے دشمنوں خصوصاً جرمانک قبائل اور ایرانی فوج سے مقابلہ زیادہ آسان تھا۔ چوتھی صدی میں طاقت کا توازن مشرق کے حق میں ہو چکا تھا۔

بادشاہ کبھی بھی چھوٹا موٹا سفر نہیں کرتے۔ قسطنطین بھی کوئی فرشتہ نہیں تھا۔ اس نے صرف دارالحکومت ہی منتقل نہیں کیا بلکہ ہزاروں شہری بھی اپنے ساتھ لے آیا اور ان کے کھانے کے لیے مصر، ایشیاء کوچک اور شام کے علاقوں سے اناج اور شراب درآمد کرنے کا حکم جاری کیا۔ پوری سلطنت میں ماتحت پھیلا دیے گئے تاکہ نئے روم کے لیے فن پارے جمع کریں۔ اس پر مورخ جیکب برداخت تبصرہ کرتا ہے: ''یہ تاریخ میں فن پر بڑا اور شرمناک ترین ڈاکہ تھا ...... جو صرف (قسطنطنیہ کی) آرائش و زیبائش کے لیے ڈالا گیا(1)۔''

درباریوں اور دوسرے امرائے ریاست کو نئے شہر میں منتقل ہونے کے لیے تمام سہولیات دی گئیں اور نئے شہر میں ان کے گزشتہ مکانات کی ہو بہو نقل تیار کروائی گئی۔ قسطنطین اپنے دربار کی بیشتر اشیاء لے گیا لیکن ایک وہیں رہنے دی: روم کا اسقف اعظم۔ مذہب اور ریاست میں اس تاریخی تقسیم نے نوع انسانی پر مفید اور ناگزیر اثرات مرتب کیے۔

اگرچہ روم کے اسقفِ اعظم کو برائے نام تقدس حاصل تھا— کیونکہ ان کے پیشرو پطرس مسیح کے رسول اور اس عہدے کے پہلے مالک تھے--- لیکن اس وقت تک مسیحیت غیر مرکزی مذہب بن کر سلامت تھی اور گرد و نواح میں خود مختار کلیسا قائم ہو گئے تھے۔ لیکن روم دارالحکومت سے بہت فاصلے پر جا چکا تھا۔ بازنطین کے اسقف اور اس کے قرب و جوار--- انطاکیہ، یروشلم اور سکندریہ--- کے کاہن بادشاہ کے زیرسایہ ہو جانے کے باعث بہت جلد ریاست کے آلہ کار بن گئے۔ دوسری طرف محلاتی سازشوں اور اثر و رسوخ سے محفوظ رومن کلیسیا پھلنے پھولنے اور اپنی خودمختاری کا اظہار کرنے لگا اور بالآخر اس نے اپنے کندھوں پر مسیحیوں کی روحانی پیشوائی کی خلعت اوڑھ لی۔ اس تقسیم پر تبصرہ کرتے ہوئے عظیم انگریز دانشور اور ارنسٹ بارکر (Ernest Barker) کہتے ہیں کہ مشرق (بازنطین) ریاست کے جبکہ مغرب (روم) مذہب کے ماتحت آ گیا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہے کہ مغرب میں اقتدار اعلیٰ کے حصول کے لیے جنگ شروع ہوگئی۔ قسطنطنیہ کی منتقلی کے 15 سو برس بعد تک کا دور مذہب اور ریاست کے درمیان کھینچا تانی سے عبارت ہے۔ کوششوں کی انہی چنگاریوں سے انسانی آزادی کے شعلے بھڑکے۔

آزادی کے نئے اور پرانے روپ

انسانی آزادی کے ارتقاء جیسے پیچیدہ تاریخی حقیقت کے آغاز کی تلاش کے لیے ایک ہی واقعہ کا انتخاب کرنا یقیناً اسے غیرضروری سادہ کر دینا ہے۔ لیکن کہانی کہیں سے تو شروع کرنا ہی پڑتی ہے۔ میرے خیال میں مغرب میں کلیسیا کا ظہور آزادی کے ورود کا اہم ترین منبع ہے۔ اس سرچشمہ سے یہ پھل ساری دنیا تک پھیل گیا۔ اس باب کا مرکزی خیال یہی ہے کہ مغرب میں آزادی، جمہوریت سے صدیوں پہلے پہنچ چکی تھی اور مقدم الذکر نے بھی موخرالذکر کو جنم دیا نہ کہ جمہوریت نے آزادی کو۔ اسی سلسلے میں وہ مقصد بھی جنم لیتا ہے جو

اس سارے تذکرہ میں رواں دواں ہے: مغرب میں شہری آزادی (ریاست اور مذہب کے مابین) کشمکش کا شاخسانہ ہے، چاہے اس کے ظہور میں سماجی ڈھانچے نے کتنا ہی اہم کردار ادا کیا ہو اس کی حیثیت ثانوی ہے۔ مذہب اور ریاست خدا اور بادشاہ پروٹسٹنٹ اور کیتھولک تجارت اور ریاست کے مابین کھینچا تانی کے اثرات مغربی دنیا میں رچ بس گئے اور برطانیہ اور پھر امریکہ میں بھی فرد کی زیادہ سے زیادہ آزادی کے لیے دباؤ ڈالنے لگے۔

انیسویں صدی میں برطانیہ اور جرمنی کی یونیورسٹیوں میں پڑھائے جانے والے سلیبس میں یہ تسلیم کرلیا گیا تھا کہ نوع انسانی کی بیشتر کامیابیاں پانچویں صدی قبل مسیح کے لگ بھگ یونان کی شہری ریاستوں میں بھی انجام پائیں لیکن یونان کے متعلق وکٹوریہ عہد کا یہ جنونی تصور محض خیالی ثابت ہوا۔ قدیم یونانی ثقافت یقیناً مثالی تھی۔ فلسفہ' سائنس اور ادب میں یہ زمین بہت زرخیز واقع ہوئی تھی۔ اس علاقے میں جمہوریت اور اس سے منسلک دوسرے تصورات نے پہلا جنم لیا لیکن ان پر عملدرآمد چند چھوٹی چھوٹی شہری ریاستوں میں بھی کیا جاتا تھا پھر عمل محض ایک سو برس تک رہا اور 338 قبل مسیح میں مقدونیہ کے ہاتھوں ایتھنز کی فتح کے ساتھ ہی ترک کر دیا گیا۔ اگرچہ ایک ہزار برس بعد یونان نے جمہوریت پسندوں کے لیے محرک کا کام کیا لیکن اس طویل عرصے کے دوران یہ یورپ کی سیاست اور اس کے اداروں پر قابل مشاہدہ اثرات مرتب کرنے میں ناکام رہا۔

مزید یہ کہ شہری آزادی کا جو تصور آج ہمارے پاس ہے۔ یونان اس کی بھی جائے پیدائش نہیں۔ جدید دنیا میں شہری آزادی کی اساسی صفت فرد کو ریاست کی ظالمانہ اور خودساختہ طاقت سے محفوظ رکھنا ہے۔ اس میں فرد کے چند حقوق پر زور دیا جاتا ہے جو اس کے پیدائش سمجھتے جاتے ہیں: اظہار رائے' تعلقات بنانے، عبادت کرنے کا حق وغیرہ۔ لیکن جیسا کہ عہد روشن خیالی کا فلسفی بینجمن کانسٹنٹ نے تصریح کی، شہری آزادی کا قدیم تصور کچھ مختلف تھا: ریاست کا ہر فرد (دراصل صرف مرد) معاشرے کے انتظام وانصرام میں حصہ لینے کا حقدار تھا۔ عموماً قانون ساز ادارے میں تمام شہریوں کو نمائندگی دی جاتی اور اگر یہ ممکن نہ ہوتا تو نمائندوں کا انتخاب لاٹری کے ذریعے کیا جاتا جیسا کہ امریکی جیوری میں آج بھی ایسا ہوتا ہے۔ قدیم یونان کی عوامی اسمبلیوں کو لامحدود اختیارات حاصل تھے۔ انفرادی حقوق نہ تو نظریاتی حوالے سے مقدس تصور ہوتے اور نہ ہی عملی طور پر ان کی حفاظت کی جاتی۔ یونانی

جمہوریت کا مطلب کانسٹنٹ کے بقول ''فرد کو سماج کی حاکمیت کے ماتحت لانا تھا(2)۔''
چوتھی صدی قبل مسیح کے ایتھنز کا وہ واقعہ یاد کریں جب عوامی اسمبلی نے رائے دہی سے اپنے
دور کے عظیم فلسفی سقراط کو اس کی تعلیمات کے باعث موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کی موت
جمہوری تو تھی لیکن آزاد خیال نہیں۔

اگر مغربی شہری آزادی کے یونانی تصور میں مبالغہ آرائی سے کام لیا جاتا ہے تو دوسری
طرف رومی اثرات کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ ہیروڈوٹس نے لکھا کہ ''یونانی آزاد ہیں'' تو
اس کا مطلب تھا کہ وہ کسی بیرونی طاقت کے غلام نہیں...... اسے ہم آج ''قومی آزادی'' یا
''حق خودارادیت'' کہتے ہیں (اس تعریف کی رو سے شمالی کوریا کو آزاد کہا جا سکتا ہے)۔
رومیوں نے آزادی کے نئے پہلو پر زور دیا: قانون کے تحت تمام شہریوں سے مساوی سلوک
کیا جائے گا۔ آزادی کا یہ تصور مغرب کے ہم عصر خیال اور لاطینی لفظLiberlas کے بہت
قریب ہے۔ یونان نے جہاں دنیا کو فلسفہ، ادب، شاعری اور فنون کے تحائف دیے وہیں
روم نے ہمیں محدود حکومت اور قانون کی حاکمیت کا تصور دیا۔ جمہوریہ روم کاروبارِ حکومت کو
(تین) شعبوں میں تقسیم کرنے، محدود مدت تک حکام کے انتخاب اور قانون کے تحت سب
کے مساوی ہونے پر تاکید کی وجہ سے اپنے قیام کے دن سے ایک مثال رہی ہے اور جمہوریہ
امریکہ کے قیام میں اسے ایک مشعلِ راہ کی حیثیت حاصل تھی۔ مغربی دنیا میں روم کے سیاسی
نظریات اور اصطلاحات کا تسلط آج بھی قائم ہے: سینٹ، جمہوریہ، آئین، کمشنری۔ مغربی
ریاستوں کے قوانین رومی باقیات سے اس قدر بھرے پڑے ہیں کہ بیسویں صدی کے آغاز
تک وکلاء کے لیے لاطینی زبان پر عبور لازمی تھا۔ دنیا میں طے پانے والے جائیداد، قرض،
وراثت، منقولہ جائیداد، عدالتی کارروائی اور گواہوں کے بیان کی بیشتر تحریریں تھوڑے تھوڑے
فرق کے ساتھ رومی تحریروں کا ہی عکس ہیں۔ ہربرٹ ریسکوتھ(Herbert Asquith)،
کلاسیکی ادبیات وفنون کا ماہر جو بعد میں برطانیہ کا وزیراعظم بن گیا' کے خیال میں روم کا عظیم
ترین تحفہ یہ تھا کہ ''اس نے عالمگیر علم قانون کی بنیاد رکھی، اسے ترقی دی اور قواعد وضوابط طے
کیے(3)۔''

تاہم رومی قانون میں سب سے بڑا سقم یہ تھا کہ عملی طور پر اس کا اطلاق حکمران طبقہ پر
نہیں ہوتا تھا اور یہ خلا اس وقت مزید کھل کر سامنے آ گیا جب جمہوریہ پہلی صدی کی آمد تک

ملوکیت میں تبدیل ہوگئی۔ نیرو، ویٹیلینس اور گلبا جیسے بادشاہوں کے ہاتھوں بنامقدمہ لوگوں کی موت، مکانات وعبادت گاہوں کی تباہی اور رعایا کے ساتھ زنا کاری اور قتل معمول کی بات تھی۔ مشہور ہے کہ بادشاہ کیلیگولا نے اپنے گھوڑے کوایک سینیٹر بنا دیا تھا اور یہ کارنامہ اگر ظاہری نہیں تو ان پوشیدہ قوانین کی خلاف ورزی تھی جو کسی دور میں محترم سمجھے جاتے تھے۔ روم جمہوری دور میں احتیاط کے ساتھ قائم کی ہوئیں قانون کی روایات سلطنت کے زوال کے ساتھ لڑکھڑانے لگے۔ روم کی تباہی نے انسانیت کو یہ سبق دیا کہ اگر قانون کی حاکمیت درکار ہے تو صرف بادشاہوں کی نیک نیتی کافی نہیں کیونکہ یہ دونوں (نیت اور بادشاہ) کسی بھی وقت بدل سکتے ہیں۔ آپ کو ان اداروں کی ضرورت ہے جن کی طاقت کا انحصار ریاست پر ہو۔ مغرب نے بادشاہوں کو اس طاقت کا توڑ کیتھولک کلیسیا کی صورت میں دیا ہے۔

کیتھولک پرستی کا معضلہ

کیتھولک کلیسیا روم کی قدیم ترین یادگار ہے جسے انگریز فلسفی تھامس ہابز (Thomas Hobbes) نے ''روم کی بدروح'' کہا جو''تاج پہنے اس کی قبر پر بیٹھی ہے(4)۔'' روم کی ثقافت اور رسم و رواج کیتھولک کی ثقافت بن گئی۔ کلیسیا کے ذریعہ بہت سی روایات اور نظریات آگے منتقل ہوئے۔ خصوصاً اس نے یورپ کو لاطینی کا تحفہ دیا جس نے وہاں کے باسیوں میں ایک قوم ہونے کا احساس پیدا کیا۔ آج بھی کیتھولک کلیسیا کے نظریات اور انتظامی ڈھانچے' اس کی عالمگیریت' مراتبی نظام' قواعد وضوابط اور قوانین کا مطالعہ کریں تو رومی سلطنت کی مشابہت صاف نظر آئے گی۔

شہری آزادی کی تاریخ کا آغاز کیتھولک کلیسیا سے شروع کرنا عجیب سا لگتا ہے کیونکہ بحیثیت ادارہ یہ آزادی فکر کے حق میں نہیں ہے بلکہ کچھ عرصہ قبل تو اس میں متنوع عقائد کی بھی گنجائش نہیں تھی۔ عہد وسطیٰ میں جیسے جیسے اس کی طاقت بڑھتی گئی اس کا رویہ غیر روادار اور استحصالی ہونے لگا۔ اختلافِ رائے کو دبانے اور اپنے عقائد لوگوں پر مسلط کرنے کے لئے پرتشدد راستے اختیار کرنے لگا۔ آج بھی اسکا سارا نظام مطلق العنانی پر مبنی ہے۔ شروع دن سے کلیسیا نے اپنے نظام میں انفرادی آزادی کو بڑھانے کی گنجائش نہیں رکھی۔ بلکہ یہ

ریاست کی مخالفت کر کے بادشاہ کی اختیارات پر قدغن لگانے میں ضرور کامیاب ہوا ہے۔ شادی' پیدائش اور موت کی رسومات جیسے روزمرہ زندگی کے اہم شعبے اس نے خود دبا رکھے ہیں۔ کلیسیا کی جائیداد اور کاہن محصول سے مستثنیٰ تھے۔ اور یہ چھوٹی بات نہیں کیونکہ عروج کے دور میں یورپ کا ایک تہائی رقبہ کلیسیا کے قبضہ میں تھا۔ کیتھولک کلیسیا انسانی تاریخ میں پہلا ادارہ تھا جو نہ صرف ریاست کے اختیار میں نہیں تھا بلکہ کبھی کبھار اسے للکار بھی دیتا تھا۔ اس طرح اس نے ریاست کی طاقت کا بت پاش پاش کر دیا اور کونوں کھدروں تک میں انفرادی آزادی پھلنے پھولنے لگی۔

کلیسیا اور ریاست کے درمیان تصادم کا آغاز قسطنطین کی منتقلی کے پچاس برس بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔ اس کے جانشینوں میں سے ایک، تھیوڈوسیس کا یونانی قبیلے تسالونیکیوں کے ساتھ جھگڑا چل رہا تھا۔ تھیوڈوسیس نے پورے قبیلے کو ایک دعوت پر بلایا اور کھانے کے بعد عورتوں، بچوں اور بوڑھوں سمیت سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس واقعہ پر میلان کا آرچ بشپ، جس کا نام ایمبر وز تھا، دہشت زدہ رہ گیا۔ اس نے شہنشاہ کو علی الاعلان عشائے ربانی میں شریک ہونے سے روک دیا۔ تھیوڈوسیس نے بہت احتجاج کیا اور اپنے فعل کے حق میں بائبلی دلائل تلاشنے لگا۔ اس نے اپنی صفائی میں کہا' ''مجھ پر مردم کشی کا الزام لگایا گیا ہے، لیکن کیا بائبل کے ایک سورما داؤد کو نہ صرف قتل بلکہ حرام کاری کا ملزم نہیں ٹھہرایا گیا تھا؟'' اس پر آرچ بشپ نے گرج دار آواز میں' انگریز مورخ ایڈورڈ گبن (Edward Gibbon) کے مشہور بیان کے مطابق جواب دیا، ''تم نے اپنے جرم میں تو داؤد کی نقل کی' اب اس کی معافی میں بھی اس کی نقل کرو(5)۔'' لوگ اس وقت ششدر رہ گئے جب اگلے آٹھ ماہ دنیا کا طاقتور ترین شہنشاہ بھکاری کے لباس میں (کیونکہ بائبل بیان کے مطابق داؤد نے بھی ایسا ہی کیا) میلان کے کلیسیا کے دروازے پر کھڑا آرچ بشپ سے معافی کی بھیک مانگتا رہا۔

مشرق میں جیسے جیسے روم کی حکومت کمزور ہونے لگی کلیسیا کی طاقت میں اضافہ ہونے لگا۔ تھیوڈوسیس کلیسیا کا پہلا شہزادہ تھا جس نے اپنے لیے ''پوپII'' مقدس باپ کا لقب اختیار کیا۔ 800ء میں یورپ میں پوپ لیوسوم کو مجبور کیا گیا کہ شارلیمان کی بطور شہنشاہ روم تاجپوشی کرے۔ اس حرکت سے اس نے ''نوازے جانے'' کی مقدس رسم کا آغاز کر دیا

جس میں کلیسیا ہر نئے بادشاہ برکت دیکر اس کی حکومت کے سر پر ہاتھ رکھنے کا پابند تھا۔ بارہویں صدی تک پوپ کے اختیارات بہت بڑھ چکے تھے اور وہ یورپ کی سیاسی چالوں کا ایک مرکزی کردار بن چکا تھا۔ کلیسیا کے پاس طاقت تھی، ایک جائز طاقت تھی' دولت حتیٰ کہ فوج بھی تھی۔ اس کو ریاست کے خلاف ایک اور فتح 1077ء میں ہوئی، جب رومی شہنشاہ ہنری چہارم نے پوپ گریگوری ہفتم کی طرف سے مقدس رسم کا دائرہ بڑھانے کی کوششوں کو روکنے کی کوشش کی۔ لیکن ناکام رہا۔ نتیجہ، مورخ بتاتے ہیں، اسے کنوسا شہر میں برف پر ننگے پاؤں کھڑا کر دیا گیا تا کہ مقدس باپ کی توہین پر اس سے معافی مانگے۔ کہانی درست ہے یا نہیں، بہرحال، بارہویں صدی تک پوپ اپنی قوت و اختیار میں یورپ کے کسی بھی بادشاہ کے سامنے کھڑا ہو سکتا تھا اور ویٹیکن براعظم کے عظیم ترین دربار کا منہ چڑا رہا تھا۔

آزادی کا جغرافیہ

مغرب میں کلیسیا کے طاقت ور ہونے کی صرف ایک وجہ تھی۔ رومی سلطنت کے زوال کے بعد کوئی ایک شہنشاہ پورے علاقے زیرِ نگیں نہ لا سکا تھا۔ اس کے بجائے کیتھولک کلیسیا یورپ کے بادشاہوں کو ایک دوسرے سے لڑا کر ان کے درمیان فیصلہ کن رائے کی حیثیت اختیار کر جاتا۔ یہی طریقہ طاقت کی کش مکش کی روح رواں تھا۔ اگر پورے براعظم کو واحد مطلق العنان بادشاہ نصیب ہو جاتا تو وہ مذہب کی خودمختاری کچل کر اسے یقیناً ریاست کی باندی بنا لیتے ہیں کامیاب ہو جاتا۔ یونان اور پھر روس کے قدامت پرست کلیسیا کے ساتھ یہی ہوا۔ لیکن بدقسمتی سے کوئی بھی نہتا حکمران پورے یورپ یا اس کے بیشتر حصے کو فتح کرنے میں کامیاب نہ ہو پایا۔ ایک ہزار برس میں چند ایک نے یہ کوشش کی: شارلیمان، چارلس پنجم، نپولین، کیسرولہیم اور ہٹلر۔ لیکن سب کے سب شکست کھا گئے اور بعض تو تھوڑی دیر ہی مقابلے کر پائے۔

یہ صورتحال کس کی غماز ہے؟ بعض رکاوٹوں نے یورپ کے فرازی علاقوں کو دریائی وادیوں میں تقسیم کر دیا ہے جنہیں پہاڑی سلسلوں نے محصور کر رکھا ہے۔ یورپ کو مختلف رکاوٹوں نے حصے بخرے کر رکھا ہے جو اسکے نشیبی علاقوں کو، پہاڑوں کے حصار میں گھری دریائی وادیوں میں بدل دیتے ہیں۔ لہٰذا یورپ کی تاریخ متعدد خودمختار ممالک سے بھری پڑی

ہے۔ ان کو فتح کرنا مشکل ہے لیکن استعمال میں لانا نہایت آسان۔ ان کے دریا اور سمندر تجارت کے بنے بنائے راستے ہیں۔ اس کے برعکس ایشیا میدانوں سے بھرا ہوا ہے--- جیسا کہ روس اور چین کے سرسبز میدان--- جن میں فوجیں بلا رکاوٹ پیش قدمی کر سکتی ہیں۔ اس لیے حیران کن بات نہیں اگر ہزار سال تک یہاں مرکزی حکومت کا راج بھی رہا۔*

یورپ کے جغرافیہ نے متنوع حجم کے علاقوں کے قیام کو ممکن بنایا--- شہری ریاستیں، ڈیوک، جمہوریائیں، اقوام اور بڑی بڑی سلطنتیں۔ 1500ء میں یورپ 500 سے زائد چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم تھا اور اکثر کا رقبہ ایک شہر سے زیادہ نہیں تھا۔ اس اختلاف کے دو حیران کن نتائج برآمد ہوئے۔ ایک تو اس نے تنوع لایا۔ تصورات، فنون حتیٰ کہ ٹیکنالوجی جو ایک علاقے میں تو کارآمد تھی دوسرے معروف ہو جاتی تھی۔ دوسرا اس تنوع نے ریاستوں کے مابین مقابلے کی فضا قائم کی جس سے سیاسی تنظیم اور کارکردگی، عسکری ٹیکنالوجی اور اقتصادی پالیسیوں میں جدت کا سبب بنی۔ کامیاب طریقہ کار کو دوسری ریاست بھی اپنا لیتی اور ناکام ترک کر دی جاتی۔ یورپ کی حیران کن سیاسی اور اقتصادی ترقی--- جسے معاشیات کا مورخ ایرک جانز ''یورپی معجزہ'' کہتا ہے--- اس کے عجیب و غریب جغرافیہ کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے (6)۔

سردار اور بادشاہ

جغرافیہ اور تاریخ نے مل کر یورپ کے سیاسی ڈھانچے کے تعین میں کلیدی کردار ادا کیا۔ رومی سلطنت کی حالت نزع اور اسے تباہ کرنے والے جرمانک قبائل کی بدتہذیبی کے نتیجہ پورے براعظم میں یک مرکزی حکومت کا قیام ممکن نہ ہو سکا۔ کسی حکمران میں یہ انتظامی

---

*اس لحاظ سے افریقہ بہت بدقسمت ثابت ہوا ہے۔ گو کہ یہ دنیا کا دوسرا بڑا براعظم ہے لیکن اس کے ساحل مختصر ترین ہیں۔ اور ان میں سے بیشتر حصہ اس قدر کھوکھلا ہے کہ اس پر بندرگاہ تعمیر نہیں ہو سکتی۔ اسی وجہ سے اس میں تجارت بھی تھوڑی رہی ہے۔ اس کے دریا بھی سفر کے قابل نہیں ہیں، کیونکہ یا تو کم گہرے ہیں اور جہاں کہیں ان میں گہرائی ہے وہاں سے ان کی تہہ میں تیز ڈھلوانیں ہیں اور بعض جگہوں پر یہ آبشاروں کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ یہاں کا موسم بھی گرم ہے جو اپنے ساتھ بیماریاں بھی لاتا ہے۔ اسے افریقہ کی غیر ترقی یافتگی کی ساختی وضاحت کہا جا سکتا ہے۔

صلاحیت نہ تھی کہ دور دراز علاقوں میں بسنے والے متنوع قبائل پر حکم چلا سکتا۔ اس کے برعکس چین میں ینگ اور ینچو، ہندوستان میں مغل اور عثمانی سلطنت اپنے دورِ عروج میں وسیع رقبہ اور مختلف الخیال لوگوں پر حکومت کر رہے تھے۔ لیکن یورپ میں مقامی جاگیردار اور سردار اپنے اپنے علاقوں پر حاکم تھے اور انہوں نے اپنے مزاروں سے قریبی تعلقات قائم کر رکھتے تھے۔ یہ یورپ کے جاگیرداری نظام کی امتیازی صفت کی حیثیت اختیار کر گئی: اس کے بڑے بڑے زمیندار خودمختار آزاد تھے۔ عہدِ وسطیٰ سے لے کر 17 ویں صدی تک یورپی بادشاہ اپنی سلطنت پر نام کو حکم چلا سکتے تھے۔ مثلاً شاہ فرانس کو برٹنی میں صرف ایک ڈیوک کے برابر مقام دیا جاتا تھا اور کئی سو سال تک اس علاقے میں اس کے اختیارات بہت محدود تھے۔ اگر بادشاہ کچھ کرنا چاہتا۔۔۔ جنگ یا کسی کی قلعہ کی تعمیر۔۔۔ تو اسے مقامی قبائلی سرداروں سے مالی اور عسکری مدد کے لیے سودے بازی کرنا پڑتی تھی، جوان سودے بازیوں کے ذریعے ارل، کاؤنٹ اور ڈیوک بن گئے تھے۔

پس، یورپ کے یہ جاگیردار ایسا طبقہ خواص بن گئے تھے جن کے پاس طاقت، دولت اور اپنی حکومت کا جواز تھا۔ سردار اور بادشاہ کے مابین تقریباً برابری کے اس رشتے نے انفرادی آزادی کے سفر کو بہت متاثر کیا۔ جیسا کہ آزاد خیالی کا عظیم مؤرخ گیڈوڈی رگیرو کہتا ہے، ''اس مخصوص مراعات یافتہ طبقہ کی موثر مزاحمت کے بغیر بادشاہ غلام ہی پیدا کرتے (7)۔'' دراصل دنیا کے دوسرے حصوں میں بادشاہوں نے یہی کچھ کیا۔ دوسری طرف، یورپ میں جیسے جیسے عہدِ وسطیٰ آگے بڑھتا گیا، اس طبقہ خواص نے ایسے حقوق اور مراعات کی ضمانت فراہم کرنے کا مطالبہ کیا جن کی خلاف ورزی تاج بھی نہ کر سکے۔ اپنے مطالبات کو مستقل طور پر بادشاہ تک پہنچانے کے لیے انہوں نے نمائندہ ادارے۔۔۔ پارلیمنٹ، اسٹیٹ جنرل، ڈائٹ۔۔۔ بھی قائم کر ڈالے۔ عہدِ وسطیٰ کی انہی سودے بازیوں میں آج کی ''قانون کی حاکمیت'' کے بیج کہا جا سکتا ہے۔ سلطنت روم کی طرز کے ان حقوق کو طاقتور اشرافیہ نے مضبوط اور محفوظ کیا۔ ریاست اور مذہب کی کشمکش کی طرح بادشاہ اور امراء کے مابین تصادم یورپی تاریخ میں طاقت کی دوسری بڑی کھینچا تانی ہے جس نے، لاشعوری ہی سہی، دستوری طور پر فرد کی آزادی کے لیے خام مال مہیا کیا۔

یورپ میں انگریز امراء سماج کا سب سے خودمختار طبقہ تھے۔ اپنی جاگیروں میں ہی

رہائش پذیر ہوتے اور اپنے مزارعین پر حکومت اور استحصال کرنے والوں سے ان کی حفاظت بھی کرتے تھے۔ اس کے بدلے میں ان سے محصول لئے جاتے تھے جو ان جاگیرداروں کو طاقتور اور دولت مند رکھتے تھے۔ ایک دانشور کے بقول یہ ''فعال امراء'' تھے جنہوں نے اپنا مقام و مرتبہ درباری آداب سے نہیں سیاسی اور حکومتی معاملات میں مسلسل شرکت سے قائم کر رکھا تھا(8)۔ برطانوی بادشاہوں، جنہوں نے اپنے ہم منصبوں میں سب سے پہلے براعظم کی اس طاقت کے ساتھ مفاہمت کی، جان گئے تھے کہ ان کی طاقت کا انحصار امراء کے اس طبقے یا اس کے کچھ حصے کے تعاون پر ہے۔ بادشاہوں نے اپنے طور پر قسمت آزمائی کی کوشش کی لیکن ان 'ٹکراؤ' جاگیرداروں کے ردعمل سے ہو گیا جو ان کے لیے قطعاً غیر متوقع تھا۔ ہنری دوم، جو 1154ء میں تخت نشین ہوا، نے سارے ملک میں اپنی حکومت پھیلاتے ہوئے دور دراز علاقوں میں شاہی حکم ناموں پر عمل درآمد کے لیے قاضی روانہ کیے۔ اس کا ارادہ پورے ملک کو ایک قانون کے تحت لا کر شاہی نظام قائم کرنے کا تھا۔ لیکن اس کے لیے اسے عہد وسطیٰ کے جاگیرداروں کو طاقت اور مراعات سے محروم کرنا تھا۔ اس کے منصوبہ نے کام کیا لیکن ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھ سکا۔ جلد ہی اس کے مدمقابل امراء نے ہتھیار اٹھا لیے اور چالیس برس کے مسلح تصادم کے بعد ہنری کا بیٹا شاہ جان 1215ء میں ونڈسر کاسل کے قریب میدان میں ایک معاہدہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس وقت اس دستاویز، میگنا کارٹا، کو امراء کی مراعات کا چارٹر اور جاگیرداروں کے حقوق کا تفصیلی بیان سمجھا جاتا تھا۔ اس میں مذہب کی آزادی اور مقامی قصبوں کی خودمختاری کی ضمانت دینے کی شرائط بھی شامل تھیں۔ دراصل یہ کسی بھی بادشاہ کے ہاتھوں رعایا کے استحصال کے نتیجہ کے طور پر سامنے آیا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ انگریز ججوں نے اسے وسیع تناظر میں دیکھتے ہوئے ایک آئین قرار دیا جس میں فرد کو چند حقوق دیے گئے تھے۔ تاہم اپنے دور میں بھی میگنا کارٹا اس لحاظ سے اہم تھا کہ یہ یورپ کے شاہی اقتدار پر پہلی تحریری بندش تھی۔ مورخ پال جانسن اس کے بارے میں بجا تبصرہ کرتا ہے کہ یہ ''خطے کا پہلا انگریزی آئین* تھا جسے انگریزی اور پھر امریکی شہری آزادیوں کا منبع کہا جا سکتا ہے(9)۔''

---

*انگریزی قوانین کا مجموعہ جو اس کے ''غیر تحریری آئین'' تشکیل دیتا ہے۔

روم بمقابلہ اصلاحات

مذہب بمقابلہ ریاست اور بادشاہ بمقابلہ سردار کے بعد کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کی طویل ترین اور خونیں چپقلش یورپ میں آزادی کو متاثر کرنے والا تیسرا بڑا تصادم ثابت ہوا۔اسکا محرک جرمنی کا ایک راہب تھا جو ایک دورافتادہ گاؤں وٹین برگ کا رہائشی تھا۔ یہ سولہویں صدی کا آغاز تھا اور پورے یورپ میں پاپائیت کی غیر معمولی طاقتور اور بدعنوانی کے باعث عوام اس سے انتہائی غیر مطمئن تھے۔ روم کی متنازعہ ترین کارستانی معافی نامے کی فروخت تھی: پاپائی دستاویز کا خریدار گناہوں کی بخشش پالیتا حتیٰ کہ ان کی بھی جو اس نے تاوقتیکہ سرزد نہیں کئے ہوتے تھے۔ اس سے حاصل ہونے والی رقوم کلیسیا کی نہ ختم ہونے والی عیاشیوں کے اخراجات پورے کرنی تھیں، جو باروک عہد کے مقابلے میں بھی دل دہلا دینے والے تھے۔ اس کا تازہ ترین منصوبہ انسانی تاریخ کے سب سے بڑے کیتھڈرل کی تعمیر تھی—- روم میں مقدس پطرس کے کلیسیا کی تعمیر۔ آج اگر آپ ایکڑوں پر پھیلے ویٹیکن کے ماربل زدہ فرش، دیواروں اور فرش سے لے کر چھت تک پھیلے جواہر، استر کاری پر نظر دوڑائیں تو مارٹن لوتھر کے غیظ وغضب کی سمجھ آجاتی ہے۔

لوتھر سے پہلے بھی کلیسیا میں اصلاحات کی آوازیں اٹھتی رہیں --- ایرسمس(Erasmus) نے عبادت کا سادہ ترین طریقہ اپنانے پر زور دیا—- لیکن کسی نے بھی کھلے عام کلیسیا کو للکارنے کی ہمت نہیں کی۔لوتھر نے کلیسیا کے خلاف پچانوے نکات تیار کیے اور 31 اکتوبر 1517ء کی صبح وٹین برگ میں کاسل کلیسیا کے دروازے پر کیل سے نصب کر آیا۔ شاید لوتھر کا مؤقف درست تھا لیکن اس کی قسمت بھی اچھی تھی۔ اس کا اعلان ٹیکنالوجی کی تاریخ میں بہت نیک وقت پر سامنے آیا۔اس سے قبل کہ کیتھولک کلیسیا اس کی اس حرکت پر کوئی ردعمل ظاہر کرتا اور اس کی تشہیر پر پابندی لگاتا۔ نئے تیار شدہ چھاپہ خانے پہلے ہی اس کے خیالات پورے یورپ میں پہنچا چکے تھے۔اصلاحِ کلیسیا کا آغاز ہو چکا تھا۔ ایک سو پچاس خونیں برسوں بعد تقریباً نصف یورپ پروٹسٹنٹ ہو چکا تھا۔

لوتھر آج کے پروٹسٹنٹ ازم کو دیکھ لے جو اپنے نظریات میں روادار اور اپنے ماننے والے سے بہت تھوڑے مطالبے کرتا ہے تو اس تبدیلی پر دہشت زدہ رہ جاتا۔ وہ آزاد خیال

نہیں تھا۔ اس نے تو ویٹیکن پر تنقید کی کہ مذہب کے حوالے سے انتہائی سستی سے کام لیتا ہے۔ لوتھر بہت سے حوالوں سے وہ تھا جسے آج ہم بنیاد پرست کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ بائبل کی لغوی تشریح کا قائل تھا۔ لوتھر کی طرف سے پاپائیت پر کی جانیوالی نکتہ چینی اسلامی بنیاد پرستوں کی تنقید سے بہت ملتی جلتی ہے جو وہ مشرق وسطیٰ کی بدعنوان اور عیاش حکومتوں پر کرتے ہیں، جو ان کے خیال میں سیدھی راہ سے بھٹک گئی ہیں۔ لوتھر پوپ کو الٰہیات کی دوسری انتہا سے تنقید کا نشانہ بنا رہا تھا۔ بعض لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کا تصادم اس قدیم اصول کا اظہار ہے کہ مذہبی آزادی دو انتہاؤں، جو ایک دوسرے کو فتح کرنے پر تلی ہیں، کا حاصل ہے۔

اصلاح کلیسیا کے نتیجہ میں جو فرقے منظر عام پر آئے ان میں سے بیشتر لوتھر سے بھی زیادہ کٹر مسیحی تھے۔ ان میں سے مؤثر ترین فرقہ کیلونسٹ (Calvinist) تھا، جو خصوصاً انتہا پسند تھا۔ اس نے انسان کے بخشے جانے کے امکانات کو رد کرتے ہوئے کہا کہ یہ برکت صرف چند کے نصیب میں ہوتی ہے جن کا انتخاب خدا نے پہلے ہی کر رکھا ہے۔ لیکن متعدد پروٹسٹنٹ فرقوں نے اپنی ساری توجہ پاپائیت کے انکار پر مذکور کر دی جس سے وہ مذہب کی قائم کردہ تمام درجہ بندی کے بھی انکاری ہو گئے۔ وہ مقتدر ہستی کے خلاف ایک مشترکہ جدوجہد کا حصہ تھے، اور اگرچہ اس وقت ناواقف تھے مگر تاریخ نے ثابت کر دیا کہ وہ فرد کی آزادی کوششوں کا حصہ ہیں۔*

شمالی یورپ کے ان چھوٹے چھوٹے فرقوں نے ہر فرد کو اس کی فکر کے مطابق حقیقت مطلقہ تک پہنچنے کی راہ سمجھائی جس میں کاہنوں کا کوئی کردار نہ تھا۔ اگر انہوں نے کسی قسم کی

---

* جنیوا، جو طویل عرصہ تک پروٹسنٹ ازم کی روحانی جنم بھومی رہا، کی سیر کو آنے والے اس کی سب سے بڑی عوامی تفریح گاہ میں اصلاح کی یادگار سے واقف ہیں۔ یہ ایک دیوار 1909 میں تعمیر کی گئی اور اس عہد کی یادگار شخصیات لوتھر، جان کیلون اور اولیور کروم ویل کے ساتھ ساتھ امریکی بنیاد پرستوں کے مجسمہ اور بنائے گئے ہیں۔ اس کی تعمیر میں یہ بات نظر انداز کر دی گئی ہے کہ یہ تمام شخصیات کسی دوسرے میں ایک دوسرے سے نبرد آزما تھیں اور ان کے نظریات سے وجود میں آنے والے فرقے آج بھی ایک دوسرے کے مخالف ہیں، اور شاید یہ بھلا ہی دینا چاہیے تھا۔

کابینت کی اجازت دی تو اس کا انتخاب بھی ایک خودکار اجتماع میں کیا جاتا تھا۔ کیونکہ تاریخ کے بیشتر دور میں وہ اقلیت ہی رہے اس لیے انہوں نے تمام اقلیتوں کے حقِ مذہب اور عبادت کے لئے جدوجہد کی۔ دوسری اقلیتوں کی مدد سے انہوں نے مغرب کے گھٹے ہوئے ماحول میں آزاد مذہبی فضا قائم کی۔ نہ صرف ضمیر اور تقریر کی آزادی بلکہ پہلے بائبل اور پھر دوسری تمام مذہبی متون کے تنقیدی مطالعے کے جدید نظریات کے رنگ ڈھنگ کے تعین میں بہت کردار ادا کیا۔ کیونکہ سائنسی رائج الوقت مقتدر نظریات اور عقائد کو مسلسل للکارتے رہنے کا نام ہے۔ اس حوالے سے جدید سائنس سولہویں صدی کے مذہبی دیوانوں کے احسان تلے دبی ہوئی ہے۔

پروٹسٹنٹ ازم کا فوری سیاسی اثر یہ ہوا کہ اس سے ویٹیکن کو اقتدار سے دور رکھنے کے لیے بادشاہوں اور شہزادوں کے ہاتھ ایک بہانہ لگ گیا، اور یہ کام وہ کسی بھی صورت کرنا چاہتے تھے۔ کلیسیا پر پہلا وار بھی پروٹسٹنٹ ازم کی حمایت میں نہیں بلکہ محض اس وجہ سے کیا گیا کہ ایک بادشاہ اپنا وارث چاہتا تھا۔ برطانیہ کے ہنری ہشتم نے پوپ کلمینٹ ہشتم سے کہا گیا کہ وہ ارگان کی کیتھرین سے اس کا نکاح موقوف کر دے کیونکہ اس کے بطن سے نرینہ اولاد پیدا نہیں ہوئی اور تخت کا کوئی وارث نہیں ہے۔ (دراصل کیتھرین نے ایک بیٹی کو جنم دیا اس کے ساتھ پانچ شیر خواری میں ہی فوت ہو گئے اور دو مرتبہ اس کا حمل ساقط ہو گیا)۔ پوپ کے انکار پر ہنری نے ویٹیکن کے ساتھ ناطہ توڑ کر خود کو کلیسیا برطانیہ کا سربراہ مقرر کر لیا۔ ہنری کو کیتھولک ازم کے ساتھ کوئی نظریاتی اختلاف نہیں تھا۔ اس نے تو لوتھر کے خلاف پوپ کے دفاع میں ایک مضمون بھی تحریر کیا تھا جس کے باعث ویٹیکن نے اسے ''محافظ دین'' کا لقب دیا اور اسکے جانشین آج بھی یہ لقب استعمال کرتے چلے آ رہے ہیں۔ پس آزاد انگلیکن چرچ پوپ کے مسئلے پر جزوی اختلاف سے قطع نظر اپنی روح میں کیتھولک ہی تھا۔

برطانیہ کی قطع تعلقی ویٹیکن کے خلاف مذہبی بغاوتوں کے سلسلے کا پہلا اور موثر ترین وار تھا جس کے بعد 150 برس تک یہ سلسلہ چلتا رہا جس میں یورپ کی کم و بیش تمام ریاستیں شریک رہیں۔ اصلاح کلیسیا سے پھوٹنے والی یہ جنگیں 1648ء میں معائدہ ویسٹ فیلیا کے ساتھ اختتام کو پہنچیں۔ تیس سالہ جنگ کو ختم کرتے ہوئے جرمنوں نے ''قیصر کا حصہ قیصر کو''

اور ’’خدا کا خدا‘‘ (جو دراصل پوپ کا تھا) کو دینے کا فیصلہ کیا۔ اس کے تحت 1555ء کا یہ تصور بھی بحال کر دیا گیا کہ جس کا علاقہ اس کا مذہب۔ ہر بادشاہ اپنی ریاست کے سرکاری مذہب کے انتخاب کا حق رکھتا ہے اور اس میں مذہبی رواداری اور نقل مکانی کی اجازت دی گئی تھی۔ اگرچہ 1648ء کلیسیا اور ریاست میں مکمل علیحدگی کا سال تو نہیں کہا جا سکتا تاہم یہ مغرب کی سیاسی تاریخ میں ایک اہم تبدیلی کی علامت ہے۔ ویسٹ فیلیا نے یہ تصور تابوت میں دفن کر دیا کہ یورپ ایک متحد مسیحی قوم— مسیحی سلطنت--- ہے اور کیتھولک کلیسیا اس کا روحانی جبکہ روم کا شہنشاہ دنیاوی حکمران ہے۔* آنے والا وقت ریاست کا تھا۔

روشن خیال ریاست

17ویں صدی کے لگ بھگ تخت کو سب سے بڑا خطرہ مذہب سے نہیں بلکہ مقامی مقتدر حلقوں سے تھا: شہزادے، ڈیوک، جاگیردار اور کاؤنٹ۔ لیکن اس صدی کے دوران شہزادوں کو اپنے دشمنوں کو مات دینا تھی۔ اس نے اپنے دربار کو مضبوط کیا اور ایک وفاقی حکومت--- ریاست--- کا قیام عمل میں لایا جس سے مقامی مخالفین کی طاقت کم پڑ گئی۔ ریاست کی کامیابی متعدد وجوہات کی مرہون منت تھی: تکنیکی تبدیلیاں، فوجی مسابقت، قومیت پرستی کو ابھارنا اور محصولات کی وصولی کا وفاقی نظام۔ تاہم ایک امر قابل ذکر ہے کہ طاقتور ریاست فرد کی آزادی کے لیے بالکل بھی سازگار ثابت نہ ہوئی۔ جیسے جیسے بادشاہوں کی طاقت میں اضافہ ہوا انہوں نے عہدِ وسطیٰ کی متعدد پارلیمنٹ، جاگیریں، اسمبلیاں اور ڈائٹ بند کر دیئے۔ 1789ء کے موسم بہار میں فرانس کے اسٹیٹ جنرل کو طلب کیا گیا تو گزشتہ 175 برسوں میں یہ ان کا پہلا اجلاس تھا! نئے طاقتور بادشاہوں نے اشرافیہ کی مراعات، مقامی روایتوں، اور گروہوں مفادات کے نظام کو یکساں قانونی ڈھانچے کے بدلے ختم کرنا شروع کر دیا جس کا انتظام بادشاہ کے اپنے ہاتھوں میں تھا۔ تاہم، برطانوی پارلیمنٹ کا معاملہ دوسرا تھا، جس نے 1688ء کے انقلاب کے بعد اس نے بادشاہت کے شانہ بشانہ جدوجہد کرنے کے باعث برتری حاصل ہو گئی تھی(10)۔

---

* مومنین کی عالمگیر امت کا تصور آج بھی اسلام میں موجود ہے۔ تاہم اس میں کیتھولک کلیسیا یا پوپ کے مقابل ہستیوں کا وجود نہیں ہے۔

شاہی نظام کی کمزوری، ممکن ہے قانون کی حاکمیت کی فتح شمار کی گئی ہو اور ایسا کیا بھی کیا۔ روشن خیالی 17ویں صدی کے یورپ پر اپنی دھاک بٹھا چکی تو والتیئر (Volatire) اور دیدرو جیسے فلسفی حکومت کو ''عقلی'' اور ''جدید'' خطوط پر استوار کرنے کے خواب دیکھنے لگے۔ لیکن عملی طور پر اس کا مطلب تھا کہ وفاقی حکومت کو مزید بااختیار بنا کر مقامی و علاقائی حکومتوں کو کمزور کر دیا جائے۔ لیکن ''روشن خیال مطلق العنانی'' جیسا کہ اسے بعد میں پکارا گیا، حکومت کے متعلق بعض ترقی پسند خیالات بھی رکھتی تھی۔ پروشیا کے فریڈرک دوم، روس کی کیتھرین دوم اور آسٹریا کے جوزف دوم جیسے حکمرانوں نے مذہبی اختلاف رائے کو برداشت کیا۔ قانونی اصلاحات متعارف کرائیں اور فنکاروں، موسیقاروں اور لکھاریوں پر دولت نچھاور کی۔ لیکن ریاستی طاقت کی ملکیت میں تبدیلی سے وہ عناصر کمزور ہو گئے جو شاہی اختیارات اور ان کے
ناجائز استعمال کی نگرانی کرتے تھے۔ فرد کی آزادی کا مکمل انحصار حکمران کی صوابدید پر تھا۔ جب بادشاہ کسی مسئلے پر اندرونی یا بیرونی دباؤ کا شکار ہوتا تو مہربان ترین حکمران۔۔۔اور اسکے جانشین بھی۔۔۔ آزاد خیالی کو فوراً ترک کر دیتے اور کسی بھی قسم کے اختلاف رائے کو سختی سے دبا دیا جاتا۔ 18ویں صدی کے اختتام تک، جبکہ جنگ، انقلاب اور خانہ جنگی نے یورپ کا سکون برباد کر کے رکھ دیا تھا روشن خیال مطلق العنانی روشن خیالی کم اور مطلق العنان زیادہ ہو چکی تھی۔

لوئس چہاردہم کے دور میں فرانس میں بادشاہت عروج پر تھی۔ فرانس کا جاگیرداری نظام اپنی ساخت کے لحاظ سے برطانیہ سے قطعاً مختلف تھا۔ دونوں جانب سے اپنے دشمنوں میں گھرا ہونے کے باعث فرانس کو اپنی فوجیں متحرک رکھنا پڑتی تھیں جس نے اس کی وفاقی حکومت کو بہت مضبوط کر دیا تھا۔ (لوئس چہاردہم اپنے چون سالہ دور میں تیس برس جنگوں میں مصروف رہا)۔ بادشاہت نے ان جغرافیائی و سیاسی حقیقتوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سرداروں اور جاگیرداروں کو قوت کے مراکز یعنی جاگیروں سے دور رکھا۔ کارڈینل ریشلو کے کھڑے کئے ہوئے ڈھانچے پر عمارت تعمیر کرتے ہوئے لوئس چہاردہم نے مقامی انتظامیہ کو نیچا دکھا کر ان کی جگہ اپنے علاقائی افسران مقرر کر دیئے۔ اسی طرح اس نے مقامی کونسلوں اور اسمبلیوں کی وقعت بہت گھٹا دی۔ لوئس کو ''سورج کا بادشاہ'' کہا جاتا تھا، اور رائے عامہ کے

برعکس اس کی وجہ اس کا مادی جاہ وجلال نہیں بلکہ اس کو ملک میں حاصل منفرد مقام تھا۔ اس کے مقابلے میں باقی تمام قوتیں ماند پڑ چکی تھیں۔ لوئس چہار دہم نے فرانس کے جاگیرداروں کو ہمیشہ کے لئے پیرس لے آیا اور یہاں انہیں یورپ کے عظیم ترین دربار کے سبز باغ دکھائے۔ اس کا مقصد ان کی طاقت کم کرنا تھا۔ فرانسیسی بادشاہت کی افسانوی وسعت--- بلا تعطل تفریح، رقص وسرود کی محفلیں، شکار، درباری آداب اور ورسیلز کے عجائبات—— کسی دور میں جاگیرداروں اور سرداروں کو سبزی پنجرے میں بند رکھنے کا سب سے بڑا سیاسی ہتھیار تھی۔ بیش قیمت ریشمی ملبوسات اور خوشبودار وِگوں کے پیچھے بے خبر فرانسیسی اشرافیہ بے بس اور محتاج ہو رہی تھی (11)۔

فرانسیسی انقلاب، 1789ء نے، ملک میں بہت کچھ بدل دیا لیکن بنیادی رجحانات میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو سکی۔ بلکہ انقلاب نے ملک کو اور زیادہ مرکز پسند بنا دیا۔ برطانیہ کے عظیم انقلاب (1688ء)، جس نے جاگیردار اشرافیہ کو مضبوط کیا، کے برعکس فرانس کے انقلاب نے اس طبقے کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ کلیسیا کو لنگڑا لولا کر دیا گیا اور مقامی سردار، چرچ اور بینک بھی کمزور پڑ گئے۔ جیسا کہ انیسویں صدی کے دانشور سیاستدان لارڈ ایکٹن نے کہا کہ انقلاب کی کہانی وفاقی اختیارات پر قدغنیں لگانے سے زیادہ اپنے راستے میں آنے والی تمام قوتوں کو راستے سے ہٹا دینے کے متعلق تھا۔ ایکٹن کہتا ہے فرانسیسیوں نے امریکیوں نے ''انقلاب لانے کا نسخہ تو لے لیا لیکن حکومت کرنے کا نہیں۔۔۔ یعنی ادھیڑنا تو سیکھ لیا لیکن سینا نہیں۔'' عوامی طاقت نے بلا روک ٹوک اور پورے جاہ وجلال کے ساتھ شاہی اختیارات کو جوں کا توں ہی اپنا لیا۔ ''لوگ'' اعلیٰ ترین قوت کی حیثیت حاصل کر گئے اور انہوں نے ''liberte, egalite, fraternite'' کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ جو آزادی کسی دور میں شاہی وسائل کی محتاج تھی اب ''شہریوں'' کی تابع ہو گئی، جنکی نمائندگی انقلابی راہنما کر رہے تھے۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ آزادی کا دوسرا روپ بھی تھا اور اس کا یہ چہرہ فرانسیسی فلسفی مونٹیکسو (جس کا پورا نام 'چارلس لوئس ڈی سکنڈٹ بیرون ڈی لا بریڈ ریٹ ڈی مونٹیکسو' تھا) نے دیکھا۔ اٹھارہویں صدی کے بیشتر روشن خیال آزاد خیالوں کی طرح مونٹیکسو بھی طرز حکومت کے حوالے سے برطانیہ کی برتری تسلیم کرتا تھا۔ لیکن اس نے چند قدم آگے

بڑھانے اورانگریزی نابغہ کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا: برطانوی نظام حکومت فرد کی آزادی کا محض اعلان نہیں کرتا بلکہ اس کی ضمانت بھی دیتا ہے۔ کیونکہ وہاں حکومت بادشاہ' امراء (دارالامراء)اور عوام (دارالعوم) میں تقسیم ہے اس لیے تینوں میں سے کوئی ادارہ بھی ضرورت سے زیادہ مضبوط نہیں ہو پاتا۔ ''تقسیم اختیارات'' کے اس نظام نے شہری آزادیوں اور مذہبی اختلاف رائے کے لئے رواداری کو یقینی بنایا۔ مونٹیکسو نے حکومت اور آئین پر اندھا یقین نہیں کیا: اس کی شاہکار تصنیف کا نام تھا Spirit of the Law تھا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ صدیوں کے دوران شاہ برطانیہ کے اختیارات اس حد تک کم ہوگئے کہ برطانیہ، جو ایک باقاعدہ بادشاہت تھا، اٹھارہویں صدی کے آخر تک امراء کی جمہوریہ بنا دیا گیا جس پر اس کے جاگیردار حکومت کرتے تھے۔ موٹیکسو کی خوشامدانہ تعریف نے انگریزوں کو بہت متاثر کیا۔ اس وقت کے نمایاں قانون دان ولیم بلیک سٹون نے بھی برطانوی قانون پر اپنی تشریحاتی تحریروں میں مونٹیکسو کا سہارا لیا۔ امریکہ کے سیاسی مفکر جوڈتھ شلر نے کہا کہ امریکی جمہوریہ کے قیام کے دوران'' مونٹیسکو کو پیر کی حیثیت حاصل تھی۔'' جیمز میڈیسن، تھامس جیفرسن، جان ایڈمز اور دیگر مفکرین نے نیا سیاسی نظام کھڑا کرنے کے لیے اس کے نظریات پر عمل درآمد کرنے کی شعوری کوشش کی۔ مونٹیسکو کا حوالہ ان کی کتابوں میں سب سے زیادہ ملتا ہے (صرف بائبل ہی اسی کو شکست دے سکی)۔ شلر کہتا ہے کہ اس کے نظریات اس قدر مقبول تھے کہ'' نئے آئین کے حامی اور مخالفین، دونوں، اپنے دلائل کے لیے مونٹیکسو کے دلائل پر انحصار کرتے تھے(12)۔''

سرمایہ داری کے نتائج

اٹھارویں صدی کی آمد تک برطانیہ کی غیر متوقع سیاست کو قوت کا ایک حتمی اور اہم ذریعہ دستیاب ہوگیا: سرمایہ دارانہ نظام۔* اگر مذہب اور ریاست' جاگیرداروں اور بادشاہ اور

---

* ''سرمایہ داری'' کے مختلف مفاہیم پر کتابیں لکھی گئیں ہیں۔ لیکن میں یہاں بہت ہی ابتدائی معنوں میں استعمال کر رہا ہوں، جو آکسفرڈ پیپر بیک انسائیکلوپیڈیا(1998) سمیت بیشتر لغات میں ملتے ہیں: ''اقتصادی تنظیم کا ایسا نظام جس کی بنیاد کاروباری مسابقت پر ہو جس کے تحت پیداوار، تقسیم اور تبادلے کے آلات ذاتی ملکیت میں ہوتے ہیں اور افراد یا کاروباری ادارے انہیں چلاتے ہیں۔۔ ''

کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کی باہمی عداوت نے فرد کی آزادی کے نئے در کھولے تو سرمایہ داری نے تمام دیواریں ایک ہی جھٹکے میں گرا دیں۔ جدید دنیا کے رنگ ڈھنگ کے تعین میں جس قدر حتمی کردار سرمایہ داری کا ہے کسی دوسرے عنصر کا نہیں۔ اس نے اقتصادیات' سماجیات اور سیاسی زندگی کی ہزاروں برس قدیم روایات کو چکنا چور کر دیا ہے۔گذشتہ صدیوں کے دوران اس نے جاگیرداری اور بادشاہی نظام کو اسلئے ختم کر دیا ہے کہ ان میں خونی رشتوں اور پیدائش پر زور دیا جاتا تھا۔اس نے تاجروں اور کاروباری افراد کا ایسا طبقہ تیار کیا ہے ریاست کے بہت کم مرہونِ منت ہیں اور آج کے کسی بھی ترقی یافتہ معاشرے کی روح رواں ہیں۔اس نے یکسانیت اور روایت کی بجائے تغیر اور حرکت پذیری کو جدید عہد میں حکمران فلسفہ ٹھہرایا۔سرمایہ داری نے ایک بالکل نئی دنیا تخلیق کی ہے جو ہزاروں برس سے قائم دنیا سے کہیں زیادہ مختلف ہے۔ برطانیہ میں اسکی جڑیں بہت مضبوط تھیں۔اس کا آغاز کہیں اور سے ہوا تھا۔ چودھویں صدی کی آمد تک تجارت اور کاروبار، جو عہد وسطیٰ میں زوال پذیر تھے، یورپ کے بعض علاقوں میں دوبارہ زور پکڑنے لگے۔ زرعی ٹیکنالوجی میں انقلابی تبدیلیوں سے فاضل اناج حاصل ہونے لگا تھا جس یا فروخت کیا جانا تھا یا اس کا تبادلہ ہونا تھا۔ بڑی مارکیٹوں سے ملحقہ قصبے اور بندرگاہوں کے حامل شہر—اینٹاپ، برسلز، وینس اور جینوا— اقتصادی سرگرمیوں کا مرکز بن گئے۔ دوہرے ریکارڈ والے کھاتے، عربی اعداد اور بینکاری نظام میں حیران کن ترقی نے حصول دولت کو شوق سے بڑھا کر منظم کاروبار کی شکل دے دی۔ جلد ہی کاروبار کا یہ جنون ساحلی شہروں سے ملک کے اندر داخل ہو گیا اور پھر پورے برطانیہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔اس کا اطلاق زراعت' فنون' پیداوار اور خدمات غرضیکہ ہر شعبہ پر کیا جانے لگا۔ یہ سوال تاحال زیر بحث ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام پہلے ان علاقوں میں ہی کیوں پھیلا۔تاہم، اقتصادیات کے بیشتر مورخین کی رائے ہے کہ ذاتی جائیداد کے حق کی حفاظت کرنے والی ریاست اس میں اہم عنصر تھی۔اس موضوع کے نمایاں مورخین ڈگلس نارتھ اور رابرٹ تھامس کی رائے ہے کہ ان علاقوں میں سرمایہ داری نے اپنے پاؤں اس لیے پھیلائے وہاں ''جائیداد رکھنے کے حقوق اس کے لیے موزوں تھے(13)۔'' سولہویں صدی کی آمد تک یورپ میں یہ رائے جڑ پکڑ چکی تھی کہ ''جائیداد خاندان کی ملکیت ہے اور حکومت شہزادے اور مجسٹریٹ کی ہے۔'' پندرہویں صدی

میں سپین کے ایک قانون دان نے کہا کہ ''بادشاہ کی ذمہ داری سلطنت کے انتظام و انصرام تک ہے۔ اشیاء کی ملکیت پر اس کا کوئی حق نہیں (14)۔'' تاہم، صرف انگلینڈ میں ایسا بادشاہ تھا (چارلس اول) جس نے من پسند ٹیکس عائد کرنے کی پالیسی اختیار کی۔

ذاتی جائیداد کے حق کی منظم ضمانت دینے نے سماج کو بدل کر رکھ دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ جاگیردارانہ نظام کی روایات اور ان کو دی جانے والی مراعات--- جو جائیداد کے پیداواری استعمال میں رکاوٹ تھیں--- ختم کی جا سکتی ہیں۔ انگریز زمینداروں نے زراعت کو جدید خطوط پر استوار کرنے میں رہنما کردار ادا کیا۔ چار دیواری بنانے کے نظام---اپنی زمینوں کے مشترکہ قطعات اور چراگاہوں پر اپنی ملکیت جتانے کی کوشش--- میں انہوں نے وہاں کے مزارعوں اور کسانوں کو بے دخل کر کے انہیں زیادہ پیداواری بنا دیا۔ وہ چراگاہیں بعد میں بھیڑوں کو چرانے اور اون بنانے کے انتہائی منافع بخش کاروبار میں کھپایا جاتا۔ ملک میں جاری ساری سرمایہ دارانہ نظام کے مطابق ڈھل کر انگریز جاگیرداروں نے نہ صرف اپنے اختیارات کو محفوظ کیا بلکہ سماج کو جدید خطوط پر استوار کرنے میں بھی کلیدی کردار ادا کیا۔ ان کے برعکس، فرانسیسی جاگیردار اکثر اپنی زمینوں سے غیر حاضر رہتے جس سے وہ انہیں مزید پیداوار مقاصد کے لیے تو استعمال نہ کر پاتے مگر اپنے مزارعوں سے بھاری محصولات وصول کرنا جاری رکھا۔ براعظم نے بیشتر امراء کی طرح وہ بھی کاروبار ہے سے خار کھاتے رہے۔

شرفاء کو نئی راہیں دکھانے کے علاوہ سرمایہ داری نے دولت مند اور بااختیار لوگوں کا ایک نیا طبقہ تیار کیا جن کی امارت شاہی انعامات کی محتاج نہیں بلکہ آزاد و خودمختار معاشی سرگرمیوں کا حاصل تھی۔ دوسرے درجے کے سرمایہ داروں سے لے کر ترقی پسند کسانوں تک پھیلے انگریزوں کا یہ ''خدمتگار'' طبقہ، ایک مؤرخ کے بقول، ''بلند نظر جارحانہ طبیعت کے چھوٹے چھوٹے سرمایہ دار تھے (15)۔'' یہی لوگ بورژرا کے اولین رکن ٹھہرے، صنعتی جائیداد کے مالکان، جسے کارل مارکس کسی بھی سماج کے ذرائع پیداوار کے مالک اور اس کی افرادی قوت کو کھپانے والا طبقہ کہتا ہے۔ مارکس نے درست نتیجہ اخذ کیا کہ یہ طبقہ یورپ میں سیاسی آزاد خیالی کا ہراول دستہ تھا۔ اس طبقے کو سرمایہ داری، قانون کی حاکمیت، آزاد تجارت اور پیشہ وارانہ رجحانات میں اضافے اور انفرادیت جیسے رجحانات نے بہت فائدہ پہنچایا تھا اس لیے انہوں نے انہی اصلاحات کی حمایت کی جن سے یہ روایات مزید مضبوط ہوں۔

سماجی سائنس پر اپنی شاندار کتاب میں ہارورڈ یونیورسٹی کے دانشور بیرنگٹن مور جونیئر نے دنیا میں جمہوریت و آمریت کی پیش قدمی کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنے نتائج کو چار الفاظ میں سمویا ہے: ''بورژوغائب، جمہوریت غائب(16)۔''

جیسے جیسے کاروباری سرگرمیاں سماجی ترقی کا محرک اول بنتی گئیں برطانوی سیاست میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ دارالعوام، جس نے سترہویں صدی میں بادشاہ سے اختیارات چھین کر ملک و نظم و نسق سنبھال لیا تھا، نو دولتیے تاجروں سے بھر گیا۔ برطانیہ میں مقلب معززین کی تعداد ہمیشہ سے محدود رہی ہے: اٹھارہویں صدی کے اختتام پر200 سے بھی کم تھے (17)۔لیکن ان سے نیچے ایک وسیع طبقہ تھا جسے ''انگریز باؤ'' کہا جاتا تھا۔ان کے طبقہ خواص کے ساتھ تعلقات تھے اور اکثر مقامی حکومتوں میں ذمہ داریاں نبھاتے تھے لیکن ان کے سماجی رتبے میں اضافے کا بنیادی ماخذ کاروبار' پیشہ وارانہ یا پیداواری فارمنگ ہی تھے۔ان میں سے بیشتر سماجی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے اور پرانے نظام سے صحت مندانہ فاصلہ قائم کرتے ہوئے آزاد تجارت، آزاد منڈی، انفرادی حقوق اور آزادی مذہب جیسی ترقی پسند اصلاحات کے لیے حکومت پر دباؤ ڈالنے لگے۔

19ویں صدی میں برطانیہ کی تین طاقتور ترین وزرائے اعظم۔۔۔رابرٹ پیل' ولیم گلیڈ سٹون اور بنجمن ڈسرئیلی۔۔۔ کا تعلق اسی باؤ طبقے سے آگے آئے تھے۔اس نئے طاقتور طبقے نے خواص کی بہت سے عادات بھی اپنا لیں۔۔۔ حویلیاں تعمیر کرنا، صبح کا مخصوص لباس، شکار کے لیے دعوتیں۔۔۔ لیکن معاشرہ میں یہ طبقہ مؤخرالذکر سے زیادہ متحرک تھا۔ سماج میں ''باؤ'' کی بہت، بعض حالات میں لارڈ سے بھی زیادہ، عزت کی جاتی تھی؛ یہ سماج میں نئے رجحانات متعارف کرانے والے بن گئے تھے۔ اٹھارہویں صدی تک انگریز باؤ ایسی داستانوی ہستی بن گیا تھا جس کی طرف سماج کھنچا چلا آتا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک نرس نے شاہ جیمز اول سے کہا کہ اس کے بیٹے کو''باؤ'' بنا دے۔ بادشاہ نے جواب دیا،''میں اسے باؤ تو کبھی نہیں بنا سکتا، ہاں لارڈ ضرور بنا سکتا ہوں۔'' برطانیہ کا سفر کرنے والے ایک فرانسیسی نے انگریزی طبقہ خواص کا یہ کہہ کر مذاق اڑایا کہ وہ باؤ طبقے کی نقالی کرتے ہیں،''لندن میں مالک اپنے غلاموں جیسا لباس پہنتے ہیں اور شہزادیاں اپنی خادماؤں کی نقالی کرتی

ہیں(18)۔'' آج انگریز باؤجو محض ایک ڈینڈی کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے جس کی جمالیاتی رالف لارین کے ذریعے ساری دنیا میں پھیلائی جاتی ہے۔ تاہم، اس کا جنم برطانوی آزادی کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے۔

اینگلوامریکی

یورپ کے بیشتر حصے میں سرمایہ داری، محدود حکومت، جائیداد کے حق اور آئین کے منظرعام پر آنے کے باوجود اٹھارویں صدی تک برطانیہ کو اپنی مثال آپ سمجھا جاتا تھا۔ یہ ملک براعظم کے کسی بھی دوسرے سماج سے زیادہ دولت مند، جدت پسند، آزاد اور مستحکم تھا۔ جیسا کہ گیڈ و ڈی روگیرو لکھتا ہے،'' فرد کی آزادیاں، خصوصاً جان و مال کی ٹھوس ضمانت دی گئی اور انتظامیہ غیر مرکزی اور اپنے فیصلوں میں خودمختار تھی۔ عدلیہ بھی وفاقی حکومت کے اثر ورسوخ سے آزاد تھی۔ تاج کے اختیارات کا کافی حد تک محدود کر دیا گیا تھا۔ سیاسی قوت کو پارلیمنٹ کے ہاتھ میں دے دیا گیا تھا۔ پورے براعظم میں یہ منظر نامہ دوسری کون سی جگہ دیکھا جا سکتا تھا؟'' متعدد معاصر شاہدین نے اسی قسم کے نتائج اخذ کئے اور آئین و قومی سانچے ڈھانچے کے حوالے سے برطانیہ کی کامیابیوں کو سراہا۔ بعض نے اپنی توجہ صرف اقتصادیات پر مرکوز رکھی ہے۔ والٹیئر کے خیال میں،'' کاروبار جس نے برطانوی عوام کو دولت مند بنایا ہے، اسی نے انہیں آزادی بھی دلائی ہے۔ ۔ ۔ اور اسی آزادی نے کاروباری سرگرمیوں کو فروغ دیا۔'' فرانس کی فرسودہ حسرتوں اور اقدار کی کی تعریف کرنے کی بجائے پادری ایبے کوئیر نے تبصرہ کیا تھا کہ انگریزی حکومت نے'' ایماندار متوسط طبقے، جو کسی بھی سماج کا قیمتی ترین اثاثہ ہوتا ہے، کا ہاتھ بٹایا(19)۔'' آزاد تجارت نے متوسط طبقہ کو دولتمند بننے میں مدد کی جس نے آزادی کی تحریک کو آگے بڑھایا۔ پس یہ شبھ چکر ثابت ہوا۔

امریکہ میں برطانیہ کی نوآبادیاں اس سے بہت مشابہت رکھتی تھیں۔ ان کے حکمرانوں نے ایسی حکومتیں قائم کیں جو ٹیوڈور عہد کے برطانیہ سے ملتی جلتی تھیں۔ 1776ء میں جب انہی حکمرانوں نے جارج سوم کے خلاف بغاوت کی تو نوآبادکاروں نے ان کے انقلاب کو بحیثیت انگریز اپنے حقوق کے دوبارہ حصول کی کوشش قرار دیا۔ جیسا کہ انہوں نے یہ حالات جھیلے تھے ان کی آزادیاں ظالم بادشاہ نے چھین لی تھیں اور اس حد تک مجبور کر دیا تھا کہ وہ

اس سے آزادی کا اعلان کردیں۔ بعض حوالوں سے یہ برطانیہ کے سابقہ عظیم انقلاب کا ری پلے تھا جس میں پارلیمنٹ نے اس خودساختہ بادشاہ کے خلاف بغاوت کردی جس کا گناہ صرف یہ تھا کہ اس نے محکومین ---یا محصول زدوں--- کی مرضی کے خلاف ان میں اضافہ کر دیا۔ 1688ء اور 1776ء کے دونوں انقلابات میں ترقی پسند، جدت پسند اور کاروباری ذہن کا طبقہ کامیاب ہوا تھا۔ (دوسری طرف بادشاہ سمیت شکست کھانے والے، جن میں ٹوری پارٹی کے پرانے رکن بھی شامل تھے، سترہویں صدی کے برطانیہ اور اٹھارہویں صدی کے امریکہ میں تاج سے وفادار رہے۔"

برطانیہ غیر معمولی معاملہ ہے تو امریکہ غیر معمولی ترین تھا۔ برطانیہ میں جاگیردار نہیں تھے۔ جبکہ امریکہ میں بڑے بڑے زمیندار خاندان تھے لیکن ان کو نہ تو لقب دیئے گئے تھے اور نہ ہی کوئی پیدائشی حقوق حاصل تھے اور سیاسی قوت اس قدر کمزور تھی کہ دارلامراء کے ارکان سے موازنہ نہیں کیا جا سکے۔ اٹھارہویں صدی کے امریکہ کو سمجھنے کے لیے مورخ رچرڈ ہوفسٹیڈر (Richard Hofstadter) لکھتا ہے کہ "متوسط طبقہ کی دنیا" کا تصور کرنا ہوگا جو غیر معمولی صورتحال تھی (20)۔ اقتصادیات اور سماج میں اشرافیہ کا وجود تو تھا لیکن غالب نہیں تھا۔ اٹھارہویں صدی کے اختتام تک شمال میں ان کا زور کم ہونے لگا تھا۔ مورخ گورڈن وڈ (Gordon Wood) لکھتا ہے، "1780ء کی دہائی میں ہم سماج کو ماقبل جدیدیت سے جدید میں ڈھلتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں جہاں کاروباری مفادات اور عام لوگوں کے مزاج کو اولیت حاصل ہونے لگی تھی۔" امریکی انقلاب جس نے، گورڈن وڈ کے الفاظ میں، "تجارت کی طاقت کو ایک دھماکے سے بڑھا دیا" امریکہ اور یورپ کے مابین خلیج کو مزید پاٹ دیا (21)۔ امریکہ بورژوا بن چکا تھا اور اس پر فخر کرنے لگا تھا۔ 1831ء میں امریکہ پہنچنے کے چند دن بعد ٹوک ویل نے اپنی ڈائری میں لکھا، "یوں لگتا ہے پورا سماج پگھل کر متوسط طبقے میں ڈھل گیا ہے۔"

آزاد خیال جمہوریت کی طرف امریکہ کا سفر غیر معمولی تھا۔ بیشتر ممالک نئے سماج کی طرف سفر اپنے جاگیردار ماضی کے بغیر شروع نہیں کرتے۔ سینکڑوں برس بادشاہت اور اشرافیہ سے آزاد ہونے کے ناطے امریکہ کو نہ تو مضبوط وفاقی حکومت کا سہارا درکار تھا اور نہ ہی کسی خونیں انقلابی کی ضرورت پیش آئی۔ یورپ کا آزاد خیال طبقہ ریاستی قوت سے

خائف تو تھا لیکن اس کے خواب بھی دیکھتا تھا۔ اسے سماج کو جدید خطوط پر استوار کرنے کے لیے ضروری تو سمجھتے تھے لیکن اس کے اختیارات کو محدود کرنے کے راستے بھی تلاش کرتے رہتے تھے۔ ٹیوک ویل لکھتا ہے کہ ''امریکیوں کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ کسی قسم کا جمہوری انقلاب جھیلے بغیر ہی جمہوریت تک پہنچ گئے ... برابر 'ہونے' کی بجائے وہ پیدائشی طور پر برابر ہیں۔''

انیسویں صدی کی ابتدا تک برطانیہ اور امریکہ کے بیشتر حصوں میں فرد کی آزادی اور قانون کی حاکمیت کا راج ہو چکا تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی ملک جمہوری نہیں تھا۔ 1832ء کے اصلاحاتی قانون سے قبل برطانیہ کی بالغ آبادی کا 1.8 فیصد ووٹ کا حق دار تھا۔ قانون کے نفاذ کے بعد یہ تعداد 2.7 فیصد ہوگئی۔ 1867ء میں اسے بڑھاتے ہوئے یہ تعداد 6.4 اور 1884ء میں 12.1 فیصد تک پہنچ گئی **(22)**۔ 1930ء میں جب خواتین کو ووٹ کا حق دیا گیا تو برطانیہ موجودہ معیارات کے مطابق جمہوریہ کہلایا یعنی بالغ حق رائے دہی۔ پھر بھی اسے آئینی آزاد خیال ریاست --- وہ ملک جہاں فرد کی آزادی کی ضمانت دی جائے اور قانون کی حاکمیت ہو--- کا مثالی نمونہ شمار کیا جاتا رہا تھا۔

امریکہ برطانیہ سے زیادہ جمہوری تھا لیکن اس قدر نہیں جس قدر عام رائے ہے۔ پہلی چند دہائیوں میں اس کے صرف صاحب جائیداد سفید فام باشندے بھی ووٹ کا حق رکھتے تھے--- یہ طریقہ کم وبیش اس ملک سے مشابہہ تھا جس کی حکومت کا تختہ برطانیہ نے حال ہی میں الٹا تھا۔ 1824ء تا 1848ء کے دوران--- آزادی کے برسوں بعد--- 5 فیصد بالغ امریکیوں نے صدارتی انتخابات میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ تاہم جیکسن کی انقلابی اصلاحات اور جائیداد کی شرط ختم ہونے کے بعد یہ تعداد ڈرامائی حد تک اوپر چلی گئی۔ تاہم، خانہ جنگی تک امریکہ میں موجود ہر سفید فام کے لئے ووٹ ڈالنا ممکن نہ ہو سکا۔ اگرچہ کتابی حد تک سیاہ فاموں کو 1870ء میں ووٹ کا حق دے دیا گیا لیکن عملی طور پر یہ سو سال تک ممکن نہ ہو سکا اور اگر ہوا بھی تو صرف جنوب میں۔ خواتین کو یہ حق 1920ء میں دے دیا گیا۔ جمہوریت کی اس عدم موجودگی، جو انیسویں صدی کے بیشتر دور میں رہی، امریکہ اور اس کے قوانین اور حقوق کا نظام باقی دنیا کا منہ چڑاتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ آئینی آزاد خیالی نے جمہوریت کی راہ ہموار کی جس نے آزادی کے لیے راستہ کھولا اور اس طرح ایک سلسلہ

چل نکلا۔

یورپ کے باقی علاقوں نے جمہوریت تک پہنچنے کے لیے برطانیہ اور امریکہ سے کہیں زیادہ کٹھن اور پیچیدہ راہ اختیار کی، تاہم، وہاں پہنچ گئے۔ جو کچھ برطانیہ اور امریکہ میں آہستگی اور پرامن انداز سے ہوا براعظم کے باقی حصوں میں یکبارگی اور خونیں انداز میں روپذیر ہوا۔ پھر بھی بیشتر ممالک 1940ء کی دہائی کے آخر تک آزاد خیال جمہوریتیں بن گئے۔ 1989ء تک تقریباً تمام ریاستوں نے یہ مقام پالیا۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ تمام مغربی ممالک میں یہ تاریخی مشابہت ہے کہ آئینی آزاد خیال روایات کی تلاش میں رہے ہیں۔ برطانیہ کو ماہرین ''مثالی نمونہ'' قرار دیتے ہیں۔ اٹھارہویں صدی کے لگ بھگ یورپ کی زوال پذیر ترین ریاست بھی انہی ایشیائی یا افریقی ہم منصب سے زیادہ آزاد خیال بن چکی تھی۔ شہریوں کو وہ حقوق اور اختیارات حاصل تھے جن کے بارے میں کوئی غیر مغربی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ قوانین اور روایات کی مدد سے بادشاہ کو محدود کر دیا گیا تھا۔ ذاتی کاروبار، چرچ، یونیورسٹیوں اور اداروں پر مشتمل سول سوسائٹی ریاست کی مداخلت کے بغیر ہی پھلنے پھولنے لگی۔ ذاتی جائیداد کی حفاظت کے باعث آزاد تجارت فروغ پانے لگی۔ اکثر اوقات یہ تمام حقوق اور آزادیاں کتابوں میں مضبوط ہوتی ہیں لیکن عملی طور پر بادشاہ کے ناجائز استعمال کے تحت رہتی ہیں لیکن باقی دنیا کے حوالے سے مغرب واقعتاً آزاد سرزمین تھی۔

کیا ثقافت ہی تقدیر کا فیصلہ کرتی ہے

شاید آزادی کی یہ مختصر تاریخ کچھ دیر کے لیے قاری کے حوصلے پست کر دے اور سوچنے پر مجبور کر دے کیا آزاد خیال جمہوریت بننے کے لیے مغرب کا حصہ بننا ہوگا؟ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی دنیا کا حصہ ہونا بذات خود مفید ہے۔ سوویت یونین کے زوال کے بعد آزاد ہونے والی تمام ریاستوں، جو اس مغربیت میں شریک تھیں ـــ آسٹریا، اور جرمنی وغیرہ کے قدیم علاقےـــ آزاد خیال جمہوریت میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ 1500ء میں جو حد فاضل مسیحی سلطنت کے مغربی اور مشرقی حصوں کو تقسیم کرتی تھی آج آزاد خیال اور ناکام جمہوریتوں یا غیر آزاد خیال میں بدل گئی ہے۔ پولینڈ، ہنگری اور جمہوریہ چیک، جو یورپ کا اٹوٹ انگ لگتے تھے، بھی اپنی جمہوریتوں کو مضبوط نہیں بنا سکے؛ ان سے

آگے بالٹک ریاستوں کا نمبر آتا ہے۔ بلقان' سلووانیا اور کروشیا' جو مشرق و مغرب کی تقسیم میں مغربی حصے میں ہیں اچھی حالت میں ہیں جبکہ سربیا اور البانیہ (جو مشرق میں ہیں) کہیں زیادہ پریشان کن دور سے گزر رہی ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ثقافت ریاست کی قسمت کا فیصلہ کرتی ہے؟ یہ پرزور دلیل میکس ویبر سے لے کر سیموئیل پی ہنٹنگٹن تک تمام دانشور استعمال کرتے آئے ہیں۔ آج یہ ایک فیشن بن گیا ہے۔ کاروباری مشیروں سے لے کر عسکری منصوبہ سازوں تک تمام لوگ ثقافت کی آسان سے آسان اور مشکل ترین تعریف بھی کرتے ہیں۔ امریکی معیشت نے گزشتہ دو دہائیوں میں تیز رفتار ترقی کیوں کی؟ جواب سیدھا سا ہے: کاروبار کے کلچر کی وجہ سے۔ روس سرمایہ داری اپنانے میں کیوں ناکام رہا؟ یہ بھی واضح ہے: اس کا کلچر جاگیردارانہ اور منڈی مخالف ہے۔ افریقہ غربت کی دلدل میں کیوں پھنسا ہے؟ اور عرب دنیا دہشت گرد کیوں پیدا کر رہی ہے؟ ان کا جواب بھی یہی ہے: کلچر۔

لیکن یہ جواب بہت سادہ ہیں۔ امریکی کلچر نے قحط اور کساد بازاری بھی تو پیدا کی۔ کسی زمانے میں جاپان اور جرمنی جاگیردارانہ ثقافت کے غلام تھے مگر آج سرمایہ داری نظام کو اپنا کر دنیا کے دوسرے اور تیسرے امیر ترین ملک بن گئے ہیں۔ ایک ہی ریاست مختلف ادوار میں کامیاب اور ناکام ہو سکتی، بعض صورتوں میں چند دہائیوں کے فرق سے ہی، جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے کلچر سے بڑھ کر کچھ ہے۔۔۔قدرے غیر تغیر پذیر۔۔۔ جو پس پردہ کام کر رہا ہے۔

سنگاپور کے شاندار شاہ لی کوآن ہوئی نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا کہ اگر میں ثقافت کو عمل پذیر دیکھنا چاہتا ہوں تو دنیا کے کسی کونے میں جرمن اور زیمبیا کے مزدوروں کو کام کرتے دیکھ لوں۔ آپ اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ دونوں ثقافتوں میں ایسے اختلاف ہیں جو ان کے نتائج کی تصدیق کرتے ہیں۔ بہت سے دانشور اسی طرح کی دلیل دیتے ہیں؛ اپنی دلچسپ تصنیف ''قبائل'' میں جوئل کوکن کہتا ہے کہ اگر آپ جدید دنیا میں اقتصادی حوالے سے کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو آسان طریقہ ہے۔۔۔ یہودی بنیے، ہندوستانی بنیئے اور سب سے اہم چینی بنئے۔''

لی اور کوکن کے تجزیے بالکل درست ہیں کہ چند نسلوں۔۔۔ چینی' ہندو اور یہودی۔۔

نے ہر قسم کے حالات میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔لیکن اگر ایک ہندوستانی ہونا ہی اقتصادی کامیابی کی ضمانت ہے تو 1947ء میں آزادی کے بعد کی پہل چار دہائیوں میں مایوس کن اقتصادی کارکردگی کی کیا توجیہہ کی جائے۔۔یااسی طرح آزادی سے قبل ہزاروں برس ایسا ہی کیوں ہوا۔ بھارت میں نشو ونما پانے کے باعث میں نہیں سمجھتا کہ ہندوستانی معاشی حوالے سے کامیاب ہیں۔ مجھے بھارتی پارلیمنٹ کے رکن پلومودی کا واقعہ یاد آ گیا جس نے وقفہ سوالات کے دوران اس وقت کی وزیراعظم اندرا گاندھی سے سوال کیا: وزیراعظم اس کی وجہ بتا سکیں گی کہ ہندوستانیوں ہر حکومت کے دور میں اقتصادی ترقی کیوں کرتے رہے ہیں، سوائے آپ کے؟''

اس قسم کا سوال چین کے بارے میں بھی کیا جا سکتا ہے جو دو دہائی قبل سے سینکڑوں برس تک اقتصادی حوالے سے قابل رحم حالت میں تھا۔ اگر ترقی کے لیے آپ کو چینی درکار ہیں اور چین کے پاس یہ اربوں کی تعداد میں ہیں۔ یہودی، مختلف بیشتر مقامات پر تو بہتر حالت میں ہیں لیکن جہاں ان کی اکثریت ہے، اسرائیل، کچھ عرصہ قبل تک بھی اقتصادی بدحواسی کا شکار تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان تین ممالک (چین، بھارت، اسرائیل) کی معیشتوں نے 80ء کی دہائی میں قابل ذکر ترقی کی ہے۔لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ انہوں نے نیا کلچر اپنا لیا بلکہ ان کی حکومتوں نے اپنی مخصوص حکمت عملیاں بدل کر انہیں منڈی کے لئے زیادہ دوستانہ بنایا۔ آج چین بھارت سے زیادہ تیز رفتار ترقی کر رہا ہے اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ چین اپنی معیشت میں بھارت سے زیادہ وسیع پیمانے پر اصلاحات لا رہا ہے نہ کہ اسے ہندو ذہنیت کے مقابلے میں کنفیوسشن مت کی غیر معمولی برتری حاصل ہے۔

عجیب بات ہے کہ لی کوآن یوئی کلچر کی دلیل کا پرجوش حامی ہے۔ سنگاپور کا کلچر اپنے ہمسائے ملائیشیا سے زیادہ مختلف نہیں۔ یہ چینی زیادہ اور ملائیشیائی کم ہے لیکن مقابلتاً دوسری ریاستوں کے ان میں کافی مشترک پہلو سامنے آتے ہیں۔لیکن اپنے ہمسائے سے کہیں آگے بڑھ کر سنگاپور میں ایک بااختیار حکومت ہے جس نے بہتر اقتصادی حکمت عملیاں اپنائی ہیں۔ اس کی ترقی صرف کلچر کی مرہون منت نہیں آگے بھی کچھ ہے۔ دوسرے لفظوں میں سنگاپور کی ترقی کا سبب لی کوآن لوئی ہے نہ کہ کنفیوشس۔ میں کلچر کو غیر اہم ثابت نہیں کرنا چاہتا۔ یقیناً اس کا کردار بہت اہم ہے۔ یہ ایک قوم کا تاریخی سفر ہے اور اس کی جڑیں ان

کے سماجی اداروں میں ہیں اور دنیا کے متعلق ان کے رویے اور توقعات کا تعین کرتا ہے۔ لیکن کلچر بدل بھی سکتا ہے۔ جرمنی کا کلچر 1939ء کے مقابلے میں بیس برس بعد، 1959ء میں، بہت مختلف تھا۔ یورپ جو کسی دور میں قوم پرست تھا آج مابعد قومیت کے عہد سے گزر رہا ہے۔ آج اس کی ریاستیں بالائے قوم اداروں کو اختیارات دینے پر رضامند ہیں جس کا امریکی سوچ بھی نہیں سکتے۔ امریکہ ایک وقت میں تنہائی پسند ملک تھا اور اس کی فوجیں اکثر سرحدوں پر رہتی تھیں۔ آج یہ سربراہ ہے جس کی فوجیں ساری دنیا میں پھیلی ہیں۔ چینی اجڈ کسان تھے آج چالاک تاجر بن گئے ہیں۔ معاشی بحران، جنگ، سیاسی رہنمائی — یہ سب کلچر تبدیل کر دیتے ہیں۔

ایک سو برس قبل مشرقی ایشیا تنگدستی کی حالت میں تھا۔ متعدد دانشوروں — جن میں میکس ویبر معروف تھا — کا دعویٰ تھا کہ کنفیوشس مت سرمایہ داری میں ترقی کے لیے درکار عناصر کی حوصلہ شکنی کرتا ہے (23)۔ دس برس قبل جب مشرقی ایشیا عروج پر تھا تو دانشوروں نے اس توجیہ کو سر کے بال موڑ دیا اور کہنے لگے کہ دراصل کنفیوشس مت اقتصادی حرکت پذیری کے لیے درکار صفات پر زور دیتا ہے۔ آج وقت کے پہیے نے دوبارہ چکر کھایا ہے اور سکالر ایشیائی اقدار میں اس سرمایہ دارانہ نظام کے مندرجات دیکھ رہے ہیں۔ اپنی ایک تحقیق میں ویبر نے شمالی یورپ کی اقتصادی ترقی کا تعلق ''پروٹسٹنٹ اخلاقیات'' کے ساتھ جوڑتے ہوئے کیتھولک جنوب کی پسماندگی کی پیشگوئی کی۔ لیکن گزشتہ پچاس برسوں میں اٹلی اور فرانس نے پروٹسٹنٹ یورپ سے زیادہ ترقی کی ہے۔ چلی کی معیشت کارکردگی کے حوالے سے ایشیا کے کسی بھی مضبوط ترین ٹائیگر کے برابر ہے۔ لیکن اسے دوسری لاطینی اقدار سے جوڑا جاتا ہے: مضبوط خاندان، مذہبی اقدار اور لگن۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہم اس سوال کا سیدھا سا جواب تلاش نہیں کر سکتے کہ بعض معاشرے کسی خاص وقت میں کامیاب کیوں ہو جاتے ہیں۔ جب ہم کسی کامیاب سماج کا ماضی کے حوالے سے جائزہ لیتے ہیں تو اس کی ترقی ناگزیر نظر آتی ہے۔ اس لیے ہم ان کے تجزیے کے بعد ان کی ثقافت میں کامیابی کے جراثیم تلاش کرنے لگتے ہیں لیکن ثقافتیں متنوع عناصر سے اس قدر بھرپور ہیں کہ دیکھنے والا جو چاہے ان میں پا لے گا۔ مشرقی ایشیا میں محنت ومشقت دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ ہے اور اگر اندھا دھند اعتماد یا دھوکہ دہی کے متلاشی

ہیں تو وہ بھی ملے گا۔ بنظر غائر دیکھیں تو بیشتر ثقافتوں میں آپ کو یہ سب کچھ ملے گا۔

ثقافت کی اہمیت ہے۔ یہ تیکھا بھی ہوسکتی ہے اور رینگتی ہوئی بھی۔۔۔اور تبدیلی کے عمل کو موخر بھی کرسکتی ہے اور سبک رفتار بھی۔ اس کے اصول وضوابط سماجی اداروں اور رسم ورواج میں بھی محفوظ ہو سکتے ہیں جو اکثر ترقی میں حقیقی روکاٹیں ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہندوستانی کلچر چاہے اقتصادی ترقی میں رکاوٹ ہو یا نہ ہو اسکی افسر شاہی میں اس میں روڑے ضرور اٹکاتی ہے۔ مغرب کو سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کی تاریخ نے ادارے اور رسوم طے کر دی ہیں ، جو اگرچہ صرف مغرب کی ملکیت نہیں ہیں ، لیکن دوسرے سماجوں میں ان کو اپنانا بہت مشکل ہے۔ لیکن ایسا ہوسکتا ہے۔

مشرقی ایشیائی ماڈل

گزشتہ تیس برسوں کے دوران غیر مغربی ریاستوں میں آزاد خیال جمہوریت کی طرف پیش قدمی پر نظر دوڑانے سے پتا چلتا ہے کہ ان میں سے بیشتر مغربی انداز میں ہی آگے بڑھی ہیں: سرمایہ داری، قانون کی حاکمیت اور جمہوریت۔ جنوبی کوریا، تائیوان، تھائی لینڈ اور ملائیشیا کئی دہائیوں تک فوجی آمروں یا یک جماعتی نظام کے ماتحت رہے۔ پھر ان ریاستوں نے معیشت' قانون اور عبادت وسفر کو پابندیوں سے آزاد کر دیا اور چند دہائیوں بعد آزاد انتخابات کروا دیے گئے۔ ان ریاستوں نے بہترین حکومت کی وہ دو خصوصیات حادثتہ ہی حاصل کر لی تھیں جن کا ذکر جیمز میڈیسن نے اپنے فیڈرل پیپرز میں کے تھا۔ اول، حکومت عوام کو قابو میں رکھنے پر مختار ہو۔۔۔ دوم، خود کو بھی متعین حدود میں رکھے۔۔۔یعنی منظم حکومت کے ساتھ ساتھ شہری آزادی۔ یہی دو قوتیں آگے چل کر جائز نظام حکومت' استحکام اور آزاد خیال جمہوریت کو جنم دیتی ہیں۔ لیکن یہ سب کہنا آسان ہے۔

1950ء اور 60ء کی دہائیوں میں مغرب کے بیشتر دانشوروں نے مشرقی ایشیائی حکومتوں کو تنگ نظر ہونے پر تنقید کا نشانہ بنایا اور ان کی بجائے ایشیا اور افریقہ میں عوامی لیڈروں کے سر پر ہاتھ رکھا جو انتخابات کے حامی تھے عوام پر انحصار کرتے تھے۔۔۔مثلاً گھانا، تنزانیہ اور کینیا وغیرہ میں کیا گیا۔ ان میں سے بیشتر ممالک زوال پذیر ہو کر آمریت کی طرف چلے گئے جب کہ مشرقی ایشیا بالکل مخالف سمت میں پیش قدمی کرنے لگا۔ سکالرز اور

اہل علم کے لیے پریشان کن امر ہے کہ لاطینی امریکہ اور مشرقی ایشیا کی بہترین جمہوریتیں ـــ چلی، جنوبی کوریا اور تائیوان ـــ طویل عرصے تک فوجی حکمرانوں کے زیرنگین رہیں۔ مغربی یورپ کی طرح مشرقی ایشیا میں بھی اشرافیہ کو آزاد خیال بنیادوں پر استوار کرنے کی کوششوں نے آزاد خیال جمہوریت کا راستہ ہموار کیا۔

جن ممالک میں آمریت کا راج رہا کم و بیش سب میں معیشت آہستہ آہستہ آزاد ہوئی۔ لیکن اس عمل نے حکومت کو اور زیادہ آزاد خیال بنایا۔ مشرقی ایشیا کا سرکردہ دانشور سنشن پائی لکھتا ہے:

> ''دوسری جنگ عظیم سے لے کر مشرقی ایشیا کی اہم ترین خصوصیت آمر اداروں کا قیام ہے ـــ یہ عمل تھا سیاسی اداروں کے بتدریج ظہور کا، جو غالب سیاسی جماعتوں، افسر شاہی، نیم آزاد انتخابی عمل اور ایسی عدلیہ کے ذریعے اپنے روایتی اور غیر روایتی اختیارات کو استعمال کرتے ہیں جو دھیرے دھیرے خود مختاری حاصل کر لیتا ہے۔ اس عمل کے دو فائدے تھے: استحکام اور حقِ جائیداد کو تحفظ (24)۔''

مشرقی ایشیاء اب بھی کرپشن، دھوکہ دہی اور ووٹر فراڈ کی دلدل میں پھنسا ہے ـــ مگر پچاس برس قبل تک بیشتر مغربی جمہوریتوں کا بھی یہی حال تھا۔ تائیوان کے حالیہ انتخابات بالکل آزاد تو نہیں کہے جا سکتے لیکن 1950ء کی دہائی میں جنوبی امریکہ کے انتخابات سے شفاف ضرور کہے جا سکتے ہیں۔ بڑے سیاسی گروہوں کو جنوبی کوریا کی سیاست غیر مناسب حد تک اختیارات حاصل ہیں لیکن سو برس قبل یورپ اور امریکہ میں بھی یہی حال تھا۔ ریل کی پٹریاں بچھانے والے، سٹیل ملیں، جہاز ساز اور ماضی کے عظیم دولت مند آج کے مشرقی ایشیائی سیٹھوں سے زیادہ طاقتور تھے۔ یہ انیسویں صدی کے اختتام پر ''سنہری دور'' میں امریکہ پر غالب تھے۔ نئی جمہوریتوں کو ان معیارات پر نہیں پرکھا جا سکتا جن کے مطابق بیشتر مغربی ممالک آج سے تیس برس قبل بھی ناکام ہو گئی تھیں۔ آج مشرقی ایشیا آزاد خیالی، جمہوریت، اشرافیہ، سرمایہ داری اور کرپشن کا گڑھ ہے ـــ جیسا کہ مغرب 1900ء میں تھا۔ لیکن مشرقی ایشیا کی بیشتر ریاستیں غیر مغربی ممالک سے زیادہ آزاد خیال اور جمہوری ہیں۔

اس نکتہ کہ آئینی آزاد خیال ماضی ہی آزاد خیال جمہوری حال کو جنم دیتا ہے، کے حق

میں ایک موثر دلیل کی سیاسی سائنسدان مائرن ویز نے 1983ء میں نشاندہی کی۔اس نے کہا،''تیسری دنیا کا ہر ملک جو دوسری عالمی جنگ کے بعد سے نو آبادی نظام سے پیدا ہوا اور جس کی آبادی کم از کم دس لاکھ تھی اور جس میں مسلسل جمہوریت رہی، وہ برطانیہ کی سابق نو آبادی تھا(25)۔'' برطانوی حکومت کا مطلب تھا عدم جمہوریت۔۔ کیونکہ نو آبادیاتی نظام اپنی تعریف کے مطابق غیر جمہوری ہے۔۔ تاہم محدود آئینی آزاد خیالی اور سرمایہ داری کا مجموعہ تھی۔اگرچہ اب تیسری دنیا میں بہت سی جمہوریتیں جنم لے چکی ہیں مگر ویز کی دلیل تا حال لاگو ہوتی ہے۔لیکن اس کا مقصد نو آبادیاتی نظام کا دفاع نہیں۔مابعد نو آبادیاتی ماحول میں پرورش پانے کے باعث مجھے منظم نسل پرستی اور طاقت کے ناجائز استعمال کے واقعات یاد کرنے کے لئے ذہن پر زور ڈالنے کی ضرورت نہیں۔لیکن یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ برطانوی سلطنت نے قانون کی حاکمیت اور سرمایہ داری کی یادگاریں چھوڑی ہیں جنہوں نے اس کی بیشتر۔۔اگر ساری نہیں*۔۔سابقہ نو آبادیوں میں جمہوریت کو مضبوط کرنے میں مدد دی ہے۔اس کے برعکس فرانس نے اپنے ماتحت علاقوں میں آئین یا آزاد منڈی کی حوصلہ افزائی نہیں کی، تاہم شمالی افریقہ میں اپنی محدود مقبوضہ آبادی کو حق رائے دہی دے دیا۔لیکن قبل از وقت جمہوری اصلاحات ظلم و جبر کا باعث ہی بنیں۔

مغرب کی راہ پر چل کر آزاد خیال جمہوریت کے حصول نے مغربی دنیا سے کہیں مختلف صورتحال کو جنم دیا ہے۔تاہم جمہوریانے کی ترتیب اور اوقات اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں۔تیسری دنیا کی بیشتر ریاستیں، جنہوں نے اپنی آزادی کے فوراً بعد غربت اور غیر مستحکم حالت میں بھی جمہوری ہونے اعلان کیا، اگلے دس برسوں میں آمریت میں بدل گئیں۔جیسا کہ کولمبیا یونیورسٹی کی طرف سے جمہوریت کا عظیم دانشور گیوانی سارتوری آئین آزاد خیالی

---

*ان نوآبادیوں جنہیں برطانیہ نے اپنی سامراجی تاریخ میں تاخیر سے اپنایا اور چند ہی دہائیوں میں آزاد کر دیا۔۔جیسا کہ افریقہ اور مشرق وسطیٰ میں۔۔۔ نے اداروں کے قیام کے ذریعے قانون کی حاکمیت قائم کرنے کی بہت کم کوششیں کی ہیں۔اس پر غلط سرحد بندیوں، ریاستوں کو اپنی آزاد زندگی کے آغاز میں ہی نسلی اور مذہبی تنازعات میں الجھا دینے نے حالات کو مزید خراب کر دیا۔لیکن جنوبی ایشیا، کیریبئن اور مہاجر نو آبادیاتی (کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ) میں برطانوی حکومت اور جمہوریت میں رشتے سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

سے جمہوریت تک کے متعلق کہتا ہے: ''یہ راستہ واپسی ممکن نہیں۔''حتیٰ کہ اینگلوامریکی انداز سے یورپی بغاوت--- کہ آئین کا قیام اور سرمایہ داری پہلے اور پھر ہی جمہوریت--- بھی آزاد خیال جمہوریت کے قیام میں کامیاب نہیں ہوسکی۔ غیر پختہ جمہوریت سے جنم لینے والے مسائل کا جائزہ لینے کیلئے ہمیں دوبارہ بیسویں صدی کے آغاز کے یورپ میں جانا ہو گا۔

دوسرا باب

ٹیڑھا راستہ

گزشتہ صدی کے آغاز پر ویانا متنوع مزاج عالمی شہر تھا— طرح طرح کے لوگ بستے تھے، فنون کا دلدادہ اور سیاست میں مبہم جویانہ طبیعت طبیعت کا مالک۔ اس ایک شہر میں رچرڈ سٹارس (Richard Strauss) اور گستاخ مہیلر (Gustav Mahler) دھنیں ترتیب دیتے گستاف لیمٹ (Gustav Klimt) اور ایگن شیلے (Egon Schiele) تصویریں بناتے، رابرٹ موصل (Robert Musil) اور آرتھر شنٹزلر (Arthur Schnitzler) ناول لکھا کرتے، تھیوڈور ہیرزل (Theodor Herzl) اخباری کالم قلمبند کرتا، سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud) تحلیلِ نفسی کا جادو جگاتا اور لیون ٹراسکی (Leon Trotsky) کافی ہاؤسز میں گرجا کرتا تھا۔ ویانا اپنے کافی ہاؤسز کے لیے شہرت رکھتا تھا جہاں وسطی یورپ کے اہل علم وفکر مل بیٹھ کر شراب تمباکو اور بحث ومباحثہ کے دور چلایا کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک کافی ہاؤس — شاید لینڈ مین 1895ء — میں موسم بہار میں سگمنڈ فرائڈ نے اپنا سگار سلگایا تھا۔ جیسا کہ فرائڈ سے توقع کی جا سکتی ہے، یہ صرف ایک سگار نہیں تھا— یہ جمہوریت کے خلاف آزادی کا جشن تھا (1)۔

اس برس مارچ میں ویانا نے کٹر قوم پرست کارل لیوگر کو شہر کا میئر منتخب کیا تھا۔ لیوگر بہت گندی سیاست کیا کرتا تھا۔ یہودیوں کو اکثر ٹڈی دل کہہ کر مخاطب کرتا تھا اور طالب تھا کہ انہیں کھاد کی طرح زمین میں دبا دیا جائے، صندوقوں میں بند کر کے سمندر میں غرق کر دیا جائے۔ ہیبس برگ کے بادشاہ فرینز جوزف اول کا خیال تھا کہ لیوگر کا انتخاب شہری

آزادیوں کے لیے خطرہ تھا،اس نے انتخابات کے نتائج کو قبولنے سے انکار کر کے نئی تاریخ رقم کر دی۔ آسٹریا کے دوسرے قدیم اور آمرانہ طبیعت کے ادارے کا تھولک کلیسیا نے بھی فریبز کی حمایت کر دی۔ ویانا نے اہل فکر اس پریشان کن صورتحال سے دوچار ہو گئے کہ عوام کے خلاف بادشاہ کا ساتھ دیں۔ فرائڈ بادشاہ کے فیصلے کی علی الاعلان تعریف کرنا چاہتا تھا جس کے لیے اس نے سگار سلگایا— جو جشن منانے کا روایتی انداز تھا۔

لیوگر کو مثالی جمہوریت پسند شمار نہیں کیا جاتا تھا مگر وہ آسٹریا میں جمہوریانے کے براہ راست نتیجے میں صاحب اقتدار میں آیا تھا۔1860ء اور1870ء کی دہائیوں میں آسٹریا کا صرف تعلیم یافتہ طبقہ ہی ووٹ ڈالتے تھے اور آزادی رائے، آئین کی حاکمیت اور معاشی آزاد خیالی جیسے آدرشوں کے لئے ہی لڑتے تھے۔ ویانا کے کثیر النسلی اور ترقی پسند ہونے کا شہرہ آفاق تاثر اسکے محدود حق رائے دہی کا مرہون منت تھا۔1880ء اور1890ء کی دہائی میں حق رائے دہی کو وسیع کرتے ہوئے—اور اتفاق سے اس کے لئے بھی آزاد خیالوں نے ہی اصرار کیا-- بالغوں کو ووٹ دینے کا حق دے دیا گیا اور جلد ہی ملک کا ماحول بدل گیا۔ حال ہی میں با اختیار ہونے والے مزدور اور کسان ،جنہیں بورژوا طبقے کی شہری اصلاحات میں کوئی دلچسپی نہ تھی، جلد ہی سوشلسٹ (جن کے مخاطب مزدور تھے) اور کٹر قوم پرستوں (جن کے مخاطب کسان تھے) کی پرجوش تقریروں کے دام میں پھنس گئے۔ لیوگر نے قوم پرست اور کمیونسٹ رجحانات کو مہارت سے یکجا کر کے ایک نیا نظام بنا ڈالا: مسیحی سوشلزم۔ ہٹلر، جو لیوگر کے دور میں ویانا میں ہی مقیم تھا، نے اپنی کتاب Mein Kampf میں اس کی مدح سرائی کی ہے۔ہٹلر کا فوجی سوشلزم لیوگر کے مسیحی سوشلزم سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔

بذات خود ہٹلر کا اقتدار میں آنا بھی انہی جمہوری محرکات کا مرہون منت تھا جنہوں نے لیوگر کا ہاتھ پکڑا تھا۔ بعض اوقات یہ فرض کیا جاتا ہے کہ جرمنی میں نازی انتخابی دھاندلی یا کسی قسم کی فوجی کارروائی کے نتیجے میں حکومت آئے ۔ دراصل 1930ء-- نازی پارٹی کے قیام کے محض سترہ برس بعد— بھی یہ 18 فیصد ووٹ لے کر انتخابات میں دوسری بڑی پارٹی قرار پائی۔1932ء میں جرمنی میں دومرتبہ قومی انتخابات منعقد ہوئے اور نازی ان دونوں میں فاتح قرار پائے-- 37 اور 33 فیصد ووٹ لے کر (جب کہ سوشل ڈیموکریٹ کو 21 اور 20 فیصد ووٹ ملے)۔1933ء کے مشہور انتخابات میں نازیوں نے 44 فیصد ووٹ حاصل

کیے۔۔ دوسری تین بڑی جماعتوں کے مجموعہ سے بھی زیادہ۔ اسے حکومت بنانے کی دعوت دی گئی(2)۔ جمہوریہ ویمار، جو پہلی عالمی جنگ کے بعد جرمنی میں قائم ہوئی، اپنے دامن میں آزادصحافت اور منصفانہ انتخابات لیے ہوئے بہترین جمہوریت تھی۔ نازی پارٹی نے ملک کے قصبوں اورشہروں تک پہنچنے کے لیے اس جمہوری عمل کا پورا پورا فائدہ اٹھایا۔1920ء اور 30ء کی دہائیوں میں، جب جرمنی ایک کے بعد دوسرے بحران کا شکار ہو رہا تھا، ریاستی ادارے اپنی ساکھ کھو بیٹھے۔ نئی اور پرجوش حقیقت کے سامنے آزاد خیالی اور آئین پرستی کھوکھلے دعوے نظر آنے لگے تھے۔ کساد بازاری اور انتہا تک پہنچے ہوئے افراط زر سے ڈگمگاتی جرمن عوام اور متوسط طبقہ نے ہٹلر کی بہادر حکومت کے وعدے پر یقین کرلیا جوقوم کو ایک بار پھر مضبوط بنا دے گا۔ ہٹلر کی تقریروں میں جوش کے ساتھ ساتھ اس کی شہرت بھی بڑھتی گئی۔ سیاسی مفکر جیک شنائیڈر نے جمہوریانے پر اپنی تحقیق کا یہ نتیجہ نکالا: ’’جمہوریہ ویمار کے اختتام پر نسل پرست استبدادی قوم پرستی جمہوریت کے باوجود نہیں بلکہ اس کی وجہ سے کامیاب ہوئی(3)۔‘‘

ویانا اور ویمار پر شہری آزادی اور جمہوریت کی باہمی کشمکش کے دوران گزرنے والے حالات نئے نہیں تھے۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں کے آغاز پر آزاد خیالی پورے یورپ میں عوامی سیاست کی طرف سے حملوں کی زد میں تھی اور اکثر اوقات موخر الذکر ہی کامیاب قرار پائی۔ لیوگر کے معاملے میں بادشاہ فرنیز جوزف نے دو برس اس کا مقابلہ کیا لیکن بالآخر1897ء کے انتخابات میں اسے ویانا کا میئر تسلیم کرتے ہی بن پڑا۔ فرانس میں بادشاہت مخالف آزاد خیالی مضبوط ہونے لگی، خصوصاً 1871ء کے بعد اس رجحان میں شدت آئی۔ لیکن پھر یہ دائیں (بادشاہت پرست، اشرافیہ اور کلیسیا) اور بائیں بازو (سوشلسٹ) کی اندھا دھند تنقید کی زد میں آ گئی۔ چند دہائیوں بعد برطانیہ، جوجدید آزاد خیال سیاست کی جنم بھومی اور گڑھ ہے، نے بھی یہ منظر دیکھا کہ کسی دور کی عظیم ترین لبرل پارٹی بنیاد پرست لیبر پارٹی اور روایت پرست کنزرویٹو کے ہاتھوں شکست کھا گئی(4)۔ جیسے جیسے جمہوریت پھیلتی گئی انفرادی حقوق، آزاد منڈی اور آئین پرستی معتدل اور آزاد خیال اشتراکیت، مذہب اور قوم پرستی کے سامنے شرمندہ ہونے لگیں۔

سوشلسٹ اور کٹر قوم پرستوں نے ہی عوامی غیظ وغضب کو ٹھنڈا نہیں کیا۔ جرمنی کے

سور ما چانسلر اوٹو وان بسمارک نے 1871ء میں نومتحد جرمنی میں بالغ مردوں کا حق رائے دہی متعارف کرایا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس طرح کے محدود حق رائے دہی سے شہری آزاد خیال انتخاب ہو جاتے ہیں جو بادشاہت بہت پر تنقید کیا کرتے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ عوام ہمیشہ بادشاہ کے حمایتی قدامت پرستوں کو ووٹ دیں گے۔ اس کا اندازہ بالکل درست تھا۔ بسمارک کے قدامت پرست ساتھی بنجمن ڈسرائیلی نے برطانیہ میں اس قسم کا تخمینہ لگایا اور 1882ء میں دوسرے ریفارم ایکٹ کے پس پردہ ٹوریز کی حمایت کو پیچھے چھوڑ دیا جس میں ہر برطانوی بالغ مرد کو حق رائے دہی دیا گیا تھا۔ لیکن پیشہ ور طبقے اور کسانوں، جنہیں کے ہاتھ حال ہی میں مضبوط کئے گئے تھے، کے ووٹ محفوظ بنانے کے لیے قدامت پرست اشرافیہ کو انہیں رام کرنا پڑا۔

بسمارک اور اس کے پیشروؤں نے اسکے بعد تمام انتخابات میں قوم پرستی اور محبّ وطنی کے نعرے استعمال کئے۔ ان کی ہر سکیم کامیاب ہوگئی: اور جیت ان کا مقدر بنتی رہی۔ دراصل اس دوران متوسط طبقہ بھی تقسیم ہوگیا: بعض اپنے آبائی وطن پر فخر کے قدامت پرستوں کے نعرے پر لبیک کہا اور بعض آزاد خیال آدرشوں کے ساتھ بھی جڑے رہے۔ ان نئے ووٹروں کو راضی کرنے کے چکروں میں جرمنی کا سیاسی طبقہ خواص خوفناک اور دہشت زدہ کرنے کے ہتھکنڈوں پر بھی راضی ہوگیا۔ کاتھولک، سوشلسٹ اور دوسرے دشمنوں کو شیطان کے روپ میں پیش کیا گیا اور تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اس حکمت عملی میں اندرونی و بیرونی دشمنوں کی نشاندہی ضروری تھی۔ سیاستدان ہر گزرتے دن کے ساتھ عسکریت پسند ہوتے چلے گئے اور اسلحہ جمع کرنے لگے۔ قومی مفادات کو توسیع پسندانہ اور جارحانہ انداز میں بیان کیا جانے لگا۔ اس کا نتیجہ چند غیر ذمہ دارانہ حکمت عملیوں کی صورت میں نکلا۔ ملک کے اندر تو مقبول ہوئیں مگر 1914ء میں پورے یورپ کو عالمی جنگ میں دھکیلنے کا باعث بن گئیں۔

جرمنی برطانیہ کیوں نہیں تھا؟

جرمنی میں جمہوریت کا براہ راست نتیجہ شہری آزادی کی صورت میں نہیں نکلا۔ ملک کو بڑے دھچکے --- دوسری عالمی جنگ میں شکست، مختلف حصوں کا سقوط اور مقبوضہ ہونا اور بیرونی طاقتوں کی طرف سے نئے سیاسی نظام کا نفاذ --- لگنے کے بعد ہی جرمنی ایک مکمل آزاد خیال

جمہوری ریاست بن پایا۔ لیکن بیشتر یورپی ممالک کی طرح جرمنی میں، خصوصاً بسمارک اور قیصر ولیہم اول کے دور میں، آزاد خیال، ترقی پسند عناصر بہت مضبوط تھے(5)۔ یورپ میں دو روایات ایک دوسرے سے اکثر نبرد آزما رہیں: آزاد خیالی اور عوامی حاکمیت پسندی جس کا مظاہرہ لیوگر اور ہٹلر نے کیا۔ آزاد خیالی تو بیسویں صدی کے پہلے نصف میں شکست کھا گئی اور دوسرے نصف میں عوامی حاکمیت پسندی کو کچل دیا گیا۔ اس کشمکش کے نتیجے میں یورپ کے بیشتر علاقوں میں آزاد خیال جمہوریت کا سفر بہت پیچیدہ اور خونیں تھا اور بعض اوقات سماجی انقلاب، فاشزم اور جنگ کا روپ بھی اس میں دیکھنے کو ملا۔ یورپ کے بعض حصوں میں برطانیہ کا طرز عمل ملتا ہے۔۔۔ ڈنمارک، بیلجیئم، ہالینڈ اور سیکنڈ نیویا۔ لیکن براعظم یورپ کی عظیم ریاستوں کی تاریخ۔۔۔ جرمنی، آسٹریا، ہنگری، فرانس۔۔۔ زیادہ پریشان اور گنجلک ہے۔ ان کے حالات جمہوری عمل کے تسلسل میں حائل رکاوٹوں کو سمجھنے میں مدد دے سکتے ہیں کیونکہ بعض علاقوں میں ٹھیک وہی حالات ہیں جو امریکہ یا برطانیہ میں آزاد خیال جمہوریت کا سبب بنے۔ ایشیا، لاطینی امریکہ اور افریقہ کے چند ممالک میں وہ ملی جلی اور پیچیدہ صفات موجود ہونے کا امکان ہے جو کم وبیش اسی طرح یورپ میں تھے۔ دنیا کی کم عمر جمہوریتوں میں وہ بے چینی دیکھ سکتے ہیں جو بیسویں صدی کے ویانا اور برلن میں نظر آتی تھی۔

برطانیہ اور یورپ کا دوسرے ممالک کے ساتھ موازنہ کرتے ہوئے دانشور ایک سادہ سا سوال کرتے ہیں۔ برطانیہ کے سیاسی مفکر رالف ڈیرنیڈرف نے 1968ء میں غیر واضح انداز میں کہا: ''جرمنی برطانیہ کیوں نہیں تھا(6)؟'' یہ سوال مفید ہے، کیونکہ یہ ہمیں جدید نامکمل دنیا میں آزاد خیال جمہوریت تک رسائی کا راستہ سجھا سکتا ہے۔

اگرچہ سوال کا جواب بہت پیچیدہ ہے مگر ایک بات طے ہے کہ جرمنی میں برطانیہ جیسے تمام حالات موجود تھے ماسوائے۔۔۔ اس کا بورژوا طبقہ اقتصادی وسیاسی خودمختار نہیں تھا۔ انگریز بورژوا، جو صنعتی انقلاب کی پیداوار اور آزاد تجارت اور حق جائیداد پر پلا بڑھا تھا، نے پرانے جاگیردارانہ نظام سے جنگ کی اور کامیابی پر ملک کو ایک نئی شکل وصورت دی۔۔۔ کمرشل، سماجی، حرکت پذیر اور متحرک۔ تاجروں کی ایک نئی نسل نے جنم لیا اور برطانیہ، نپولین کے الفاظ میں ''دکانداروں کی قوم'' بن گیا۔ اس کے برعکس جرمنی میں صنعت ایک جھٹکے سے شروع ہوئی اور حکومت کی سبسڈی ریگولیشن اور محصولات کی رعایتوں کے سہارے کھڑی

تھی۔ نتیجتہ بورژ واطبقہ کمزور، منتشر اور ریاست اور جا گیردار طبقہ کامحتاج بن کر رہ گیا۔ مارکس نے بجاطور پر جرمنی کے تاجر طبقہ کو "عالمگیریت سے تہی بوروژوا" قرار دیا تھا(7)۔

جرمنی میں بیوروکریسی کی روایت بہت مضبوط تھی اور اسے بجاطور پر اس پر فخر تھا۔ اس کی ریاستی مشینری صنعت کاری اور شہر سازی کے پیدا کردہ مسائل— صحت عامہ، نقل وحمل اور پنشن--- حل کرنے میں یورپ کے کسی بھی دوسرے ملک سے زیادہ ترقی پسند اور متحرک تھی۔ اس کے نتیجے میں جرمن تاجروں نے ریاستی اثر ورسوخ سے آزاد ہونے کے بجائے مراعات اور اعزازات کی تلاش میں رہنے لگے۔ ایک کاروباری ہوتے ہوئے "کمرشل آفیسر" کا لقب محترم ومعزز شمار کیا جاتا تھا۔ ایک مؤرخ لکھتا ہے "لوگ زمینداری میں کشش محسوس کرنے کی بجائے سینٹری کونسلرز جیسے القابات سے متاثر ہوتے تھے۔" یا پریس کے کردار میں فرق پر غور کریں۔ برطانیہ میں آزاد صحافت سیاسی رائے عامہ کی ترجمانی کا اہم ذریعہ تھی اور صحافی ریاست کے اثر ورسوخ سے آزاد تھے۔ اس کے برعکس پروشیا میں اولین اخبار عظیم فریڈرک کی طرف سے ریاستی پراپیگنڈا کے لیے جاری کیے گئے تھے۔ انیسویں صدی کے بیشتر حصہ میں جرمنی کے تاجر طبقہ نے آزاد خیال اصلاحات کے لیے جدوجہد کرنے کے بجائے حاکم جاگیردار طبقہ سے عدم تصادم کا رویہ اپنائے رکھا۔ اس لیے صنعت سازی کے باوجود جرمنی نئے بورژوا سماج اور پرانے قبل از صنعت سازی دور کے عناصر اپنے سموئے ہوئے متنوع ریاست بھی رہی۔ آزاد خیال مفکر فریڈرک نو مین نے 1909ء میں لکھا: "جرمنی کا صنعتی سماج سیاسی لبادہ اوڑھے ہوئے جاگیردار طبقہ بھی ہے۔ ہماری سیاسی حالت اس جدید فیکٹری کی طرح ہے جسے پرانے فارم میں تعمیر کر دیا گیا ہے۔ مشینیں نئی ہیں جن پر پرانی طرز کے لکڑی کے بالوں کی چھت ہے اور مٹی کی دیواروں میں گارڈر نصب کیے گئے ہیں۔"

حکومت پر پرانے نظام کی گرفت تا حال مضبوط تھی۔ 1891ء میں پروشیا کی انتظامیہ کے 62 فیصد ارکان طبقہ خواص سے تعلق رکھتے تھے۔ دفترِ خارجہ میں یہ تعداد اس سے بھی زیادہ تھی۔ 1914ء میں جرمنی کے خارجہ محکموں م میں 8 شہزادے، 29 کاؤنٹ، 20 بیرن، 54 دوسرے درجے کے معززین اور 10 عام لوگ شامل تھے(8)۔ فرانس، جو مضبوط ریاست اور نسبتاً کمزور سول سوسائٹی رہا ہے، نے بھی آزاد خیال جمہوریت کے لیے طویل راستے کا

انتخاب کیا۔ سماجی قوتیں، جو برطانیہ کو اپنے ساتھ کھینچے چلے جا رہی تھیں، فرانس میں زور نہ پکڑ سکیں، جہاں اشتراکیت اور کاروباری طبقہ بھی ریاست کا محتاج تھا۔ اٹھارویں صدی پر نظر دوڑاتے ہوئے Cambridge Economic History of Europe میں ''بورژوا حکومت کی امتیازی خصوصیات'' کی فہرست دی گئی ہے۔۔۔ قانون کی حاکمیت، قانون کی نظر میں مساوات، ذاتی جائیداد، آزادی تجارت، شہری آزادیاں وغیرہ وغیرہ۔۔۔ اور اس کے بعد تحریر ہے، ''فرانس میں انقلاب سے قبل غیر موجود تھیں (9)۔'' پس انقلاب کے بعد فرانس نے ان تمام عناصر کو آئینی آزادخیالی کی کمزور روایت کے باوجود قبول کر لیا۔ ان حالات میں آزادی کا ذکر کتابوں میں تو ملتا تھا عملی طور پر اس کی ضمانت نہیں دی گئی تھی (اس کے لئے اختیارات تقسیم کئے گئے اور غیر ریاستی اداروں مثلاً ذاتی کاروبار، سول سوسائٹی اور خودمختار کلیسا)۔ انقلابیوں کو یقین تھا کہ مونٹیسکو اس وقت اصل راہ سے بھٹک چکا تھا جب اس نے محدود اور منقسم اختیارات کی حامل حکومت کا مطالبہ کیا۔ بادشاہ کے تمام اختیارات جوں کے توں قومی اسمبلی کو منتقل کر دیئے گئے جس نے عوامی مفاد کے نام پر ہزاروں انسانوں کو قتل کیا جائیدادیں ضبط کر لیں اور مذہبی عقائد کی وجہ سے ان پر ظلم ڈھایا۔ بعض دانشوروں نے جیکب بنز کی اس حکومت کو ''آمریت پسند جمہوریت'' کا نام دیا۔ یہ جدید تاریخ میں غیر آزادخیال جمہوریت کی پہلی مثال تھی (10)۔

فرانس نے سماج پر ریاست کو آئین پرستی پر جمہوریت کو اور آزادخیالی پر برابری کو ترجیح دی۔ اس کے نتیجے میں انیسویں صدی کے پیشتر عرصے میں یہ وسیع حق رائے دہی اور انتخابات کے ساتھ جمہوری تو تھا لیکن آزادخیال نہیں۔ یقیناً یہ حالات فرد کی آزادی کے لیے امریکہ یا برطانیہ سے زیادہ محفوظ نہیں تھے۔ لوئس نپولین، جس نے 1848ء سے 1870ء تک فرانس پر حکومت کی، اس ملی جلی حکومت کا نمائندہ ہے۔ اس نے عوام کی مرضی، انتخابات اور ریفرنڈم سے حکومت حاصل کی اور آزادی فکر، رائے اور عمل کو دبانے کے لیے پولیس اور ریاست کے تمام ذرائع استعمال کیے۔ یورپ کی تیسری جمہوریت، یورپ کے دوسرے آزاد خیال تجربات کی طرح، بالآخر نیست و نابود ہو گئی۔ انقلاب کے 150 برس اور دوسری جنگ عظیم کے بعد، دو باشاہوں، دو سلطنتوں، پانچ مرتبہ جمہوریہ اور ایک نیم فاشسٹ آمریت کا تجربہ کرنے کے بعد، فرانس نے آزادخیالی اور جمہوریت دونوں پا لیا۔ آج بھی اس میں ایسی

حکومت ہے جسے اس کے بانی چارلس ڈی گولے ''منتخب اور جمہوری سلطنت'' کہتا ہے۔

تقریباً جمہوری

براعظمی یورپ کا ایک روشن پہلو بھی تھا جس میں آزاد خیال جمہوریت کے مکمل جراثیم پوشیدہ تھے۔ آزاد خیالی کی روایت، جسے اگرچہ ہمیشہ شکست کا سامنا رہا، لیکن اس نے اپنا وجود قائم رکھا، حتیٰ کہ جرمنی جیسے ملک میں بھی، جو 30 کی دہائی میں بری طرح سے صحیح راستے سے بھٹک گیا تھا۔ 1900ء کے لگ بھگ سنجیدہ مفکرین جرمنی کو دنیا کی ترقی پسند ترین ریاست شمار کرتے تھے، آئین جدید اور تحریری تھا، سماج کی ہر سطح پر ترقی یافتہ انتظامیہ تھی اور دُنیا کی پہلی فلاحی ریاست کہلاتی تھی۔ سیاسی کلچر بھی آزاد خیال تھا اور برلن، جسے ''آونٹ گارڈ'' (avant-garde) کی حیثیت حاصل تھی جیسے شہر میں جمالیات کا ذوق تھا۔ 1887ء میں تقابلی حکومتوں کے سرکردہ امریکی دانشوروں میں سے ایک وڈرو ولسن، جب وہ پرنسٹن یونیورسٹی میں پروفیسر تھا، نے ''لائقِ تحسین نظام'' کے لئے اس کی تعریف کی ''اس پر سب سے زیادہ کام کیا گیا ہے اور کم و بیش ہر عیب سے پاک ہے۔ ۔ ۔ اس نے بد مزاج بیوروکریسی کو عوام کی خدمت کرنے والی منصفانہ حکومت میں تبدیل کر دیا ہے (11)۔'' (یہ تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ وہ ولسن جو جرمنی کا مداح تھا فوج لے کر چڑھ دوڑا) اس دور کے سیاسی مفکرین جرمنی کا موازنہ برطانیہ سے کیا کرتے تھے جو، ان کی رائے میں غیر ضروری حد تک وفاقی سیاسی نظام تھا جس میں دارالعوام کو ضرورت سے زیادہ اختیارات دے دیے گئے تھے جاگیرداروں سے بھرا ہوا دارالامراء، جو وقت کے تقاضوں سے میل نہیں کھاتا تھا، آئین تحریری نہیں تھا اور سماج کی بنیاد صوفیانہ طرز کی روایات پر تھی جس میں جدت پسندی پریشان حد تک کٹھن ہو گئی تھی۔

بیسویں صدی کے آغاز پر جرمنی جمہوریت کے حصول کی راہ راست پر جا رہا تھا۔ اس کے بعد پہلی عالمی جنگ آ پہنچی جس نے 20 لاکھ جرمن ہلاک کر ڈالے اور ملک کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اس کا اختتام بھی وارسیلز جیسے شرمناک امن معائدہ پر ہوا۔ اس کے کئی برسوں بعد تک پولینڈ، روس اور دوسرے مشرقی علاقوں سے تارکینِ وطن یہودیوں کی جرمنی میں ہجرت جاری رہی (جس نے ملک میں سماجی انتشار برپا کر دیا): افراطِ زر اور کساد بازاری۔ جرمن سماج

کے آزاد خیال رجحانات پر تنگ نظری غالب آ گئی اور بالآخر سیاسی نظام بھی یہ بوجھ برداشت نہ کر پایا اور منہ کے بل گر پڑا۔ خصوصاً افراطِ زر — جسے نیل فرگوسن ''بورژوا مخالف انقلاب'' کہتا ہے — نے متوسط طبقہ کی تمام بچتیں نگل لیں اور انہیں جمہوریہ ویمار سے قطعاً اجنبی کر دیا۔ ملک آسانی سے انتہا پسند نظریات اور رہنماؤں کا شکار ہو گیا۔ تاریخ کا معکوس مطالعہ کرنا عام رجحان ہے اس میں فرض کیا جاتا ہے کہ جرمنی نے ہٹلر کے زیر نگین جو روپ دھارا وہ اس کی قسمت میں لکھا جا چکا تھا۔ لیکن برطانیہ اور امریکہ کے بھی تاریک پہلو اور شدت پسند عوامی رہنما تھے جو کساد بازاری کے دور میں طاقتور ہو گئے تھے۔ اگر یہ ممالک بیس برس شکست، ذلت، انتشار، اقتصادی دباؤ اور متوسط طبقہ کی عضو براری کے دور سے گزرتے تو فرینکلن روز ویلٹ اور ونسٹن چرچل جیسے سیاستدانوں کی بجائے ہیوے لانگ اور اوز ویلڈ موز لے جیسے عوامی لٹیرے ہی ان پر حکومت کرتے۔

پہلی عالمی جنگ نے یورپ کے بیشتر علاقوں میں بادشاہت کا خاتمہ تو کر دیا ایسی تباہی بھی اپنے ساتھ لائی کہ یورپ فاشزم اور آمریت کا جائے پرورش بن گیا۔ 1930ء کی دہائی میں آزاد خیالی پر دائیں طرف سے فاشسٹ اور بائیں جانب سے اشتراکیت نے تابڑ توڑ حملے شروع کر دیے۔ ان میں سے بعض نے جمہوریت کو آزاد خیالی کے توڑ کے طور پر استعمال کیا۔ بالآخر اسے (یورپ کو) ان عوامی رہنماؤں کو دبانے کے لیے ایک اور جنگ لڑنا پڑی۔ 1945ء کے بعد امریکہ کی مدد سے یورپ نیا سیاسی نظام تشکیل دینے کے سفر پر روانہ ہوا۔ اگلے پچاس برس میں اس نے جس قدر کامیابیاں سمیٹیں کسی کو ان کی امید نہیں تھی۔

1945ء تک آزاد خیال جمہوریت کو دائیں بازو — پہلے جاگیردار اور پھر فاشسٹ — کی طرف سے لاحق خطرات کم و بیش اپنی موت آپ مر چکے تھے (سوائے ایبرئین کا مجمعہ الجزائر، لیکن نہ تو سپین کے فرانسیسکو فرانکو اور نہ ہی پرتگال کے انٹونیو زار کو اپنی حکومتیں درآمد کرنے میں دلچسپی تھی)۔ اس کے بعد جمہوریت کو بائیں بازو سے اشتراکی جماعتوں کی طرف سے حکومت کا سامنا ہوا جس کی سرپرستی ماسکو کر رہا تھا۔ لیکن مغربی اتحاد نے اس کا بھی کامیابی سے دفاع کیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اگرچہ قابل ذکر ہے لیکن اس پر بہت کم غور کیا گیا ہے۔ مغربی یورپ جہاں دو صدیوں تک آزاد خیالی دائیں اور بائیں بازو کے انتہا پسندانہ نظریات سے نبرد آزما رہی نے بنا کسی اعلان اور چپکے سے اعتدال پسند آئینی سیاست

کو اپنا لیا۔ شکاگو یونیورسٹی کا دانشور مارک لیلا اسے ''ایک اور ریشمی انقلاب'' کہتا ہے۔ لکھتا ہے:

> ''دیکھنے والے دیکھ سکتے ہیں کہ امریکی فوج کا مہیا کردہ امن، تمیں برسوں کی بلا تعطل معاشی ترقی کی فروانی اور فلاحی ریاست کی توسیع نے مل کر بائیں بازو کی جماعتوں کی سرگرمیاں جڑ سے اکھاڑ پھینکی ہیں۔۔۔آج یورپ کا ہر ملک محدود آئینی حکومت، آزاد عدلیہ، کثیر الجماعتی انتخابات، بالغ حق رائے دہی، فوج اور پولیس پر سول اختیار، اجتماع اور عبادت کے حقوق، وسیع متوسط طبقہ اور ترقی یافتہ معیشت کا مالک ہے۔ قوم اور علاقہ پرست نئی جماعتوں، نسلی فسادات اور امیگریشن پر متنازعہ بحث مباحثہ کے باوجود مغربی یورپ کی کسی حکومت کو کوئی ایسا خطرہ لاحق نہیں جیسا 1920ء کے عشرے میں آزاد خیال حکومتوں کو تھا(12)۔''

یونان، اسپین اور پرتگال مغربی یورپ میں سب سے آخر میں مکمل جمہوریت اپنانے والے ملک تھے اور یہ کام انہوں نے 1970ء کی دہائی میں کیا۔ 1989ء کا انقلاب یورپ کی آزاد خیالی کے ڈرامے کا آخری منظر تھا۔ اگرچہ مشرقی یورپ کے بیشتر ممالک کی تاریخ بھی مغرب جیسی ہے لیکن 1945ء میں ریڈ آرمی کے ہاتھوں ''آزاد'' ہونے کے بعد یہ اشتراکی سلطنت کی زد میں آ گئے۔ وسیع تناظر میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ جن قوتوں نے ان ممالک کو سوویت یونین کا مقابلہ کرنے میں مدد دی وہی ان سماجوں کو آزاد کرانے میں بھی مددگار ثابت ہوئیں: پولینڈ میں کلیسیا اور مزدور یونینز، یوگوسلاویہ میں سول سوسائٹی گروپ، ہنگری میں اصلاح پسند اشرافیہ اور ان تینوں ممالک میں چھوٹے پیمانے پر متوسط طبقہ۔ سوویت اثر و رسوخ سے آزاد ہونے کے بعد ان ممالک نے بڑی سرعت سے آزاد خیال جمہوریت قائم کی، جس نے بہت ہی جلد سماج میں جڑیں پکڑ لیں۔ سابق اشتراکی ریاستیں، رومانیہ اور بلغاریہ، تاحال آزاد خیال جمہوریت کے لئے مشکل دور سے گزر رہی ہیں، جبکہ بعض دوسری اس آزمائش میں اپنی ساتھیوں سے زیادہ کامیاب ہیں۔ لیکن اشتراکیت کے زوال کے تقریباً دس برس بعد یورپ ورغلانے کی حد تک، جارج بش سینیئر کے بقول، ''مکمل اور آزاد'' ہونے کے قریب ہے۔

کوئی ملک بھی خود کو ایک نیا ماضی نہیں دے سکتا۔ لیکن اپنے مستقبل کو بدل کر یہ آزاد خیال جمہوریہ بننے کی راہ پر چلنے کو ضرور ممکن بنا سکتا ہے۔ آج کے کسی بھی ترقی پذیر ملک، حتٰی کہ لاطینی امریکہ کے کسی بھی اوسط آمدنی والے ملک کے لئے بھی، حقیقی جمہوریت کا بندوبست کرنا اہم اور مشکل ترین چیلنج ثابت ہو رہا ہے۔ ان ممالک کی کامیابی کے امکانات کو بہتر طور پر سمجھنے کے لئے ہمیں تاریخ سے سبق حاصل کرنا ہوگا اور یہ جاننا ہوگا کہ وہ کون سے عناصر تھے جو آزاد جمہوریت کا سبب بنے۔

نئی جمہوریت کی کامیابی کی سادہ سی توجیہہ اس کی اقتصادی کامیابی — یا اگر ٹھیک ٹھیک نشاندہی کریں، بلند فی کس قومی آمدنی — ہے۔ مشہور سماجی سائنس دان سائمور مارٹن لپسٹ نے 1959ء ایک سادہ لیکن باوزن بات کہی: ''قوم جس قدر کھاتی پیتی ہوگی جمہوریت کو اسی قدر قائم رکھ پائے گی (13)۔'' لپسٹ کی دلیل تھی کہ ممالک جیسے جیسے اقتصادی ترقی کرتے ہیں ان کے سماج میں آزاد خیال جمہوریت کو سہارنے کی طاقت آتی چلی جاتی ہے۔ چالیس برس بعد بھی اس کا بنیادی قضیہ درست ثابت ہوتا ہے۔

یقیناً بعض غریب ممالک بھی جمہوریہ کی صف میں شامل ہو گئے ہیں۔ لیکن ترقی کی نسبت نچلے درجے پر جمہوریانے سے ان کی جمہوریت دم توڑ دیتی ہے۔ (لیکن اس سلسلے میں غیر معمولی مثالیں بھی ہیں، جیسے کہ بھارت)۔ اس مسئلے پر جامع ترین شماریاتی تحقیق ایڈم پرزوسکی اور فرنانڈو لیمونگی نے کی۔ انہوں نے 1950ء سے لے کر 1990ء تک ہر ملک کا بغور جائزہ لیا ہے۔ اعداد و شمار کے مطابق جس ملک میں فی کس آمدنی 1500 امریکی ڈالر (موجودہ شرح کے مطابق) ہے اس میں حکومت کی عموماً عمر 8 برس ہو سکتی ہے۔ 1500 سے 3000 امریکی ڈالر والے ملک میں یہ عرصہ 18 سال تک بڑھ جاتا ہے اور 6000 سے آگے یہ انتہائی محفوظ ہو جاتی ہے۔ یہ امکان کہ 6000 امریکی ڈالر فی کس آمدنی والی ریاست میں جمہوری حکومت جلد ختم ہو جائے گی پانچ سو میں سے ایک مرتبہ ہوتا ہے۔ جمہوریتیں امیر ہو جائیں تو ابدی ہو جاتی ہیں۔ 32 جمہوریتیں ایسی ہیں جن کی فی کس آمدنی نو ہزار ڈالر ہے اور ان سب کی مجموعی عمر 736 برس ہے۔ ان میں سے ایک بھی ختم نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس

69 غریب جمہوریتوں میں سے 39 ناکام ہوگئیں۔۔ یعنی ان میں شرح اموات 56 فیصد ہے(14)۔

پس نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جب 3ہزر سے 6 ہزار ڈالر فی کس آمدنی والی کوئی ریاست جمہوری نظام اپنانے کی کوشش کرے تو کامیاب رہے گی۔ جمہوریت کی طرف پیش قدمی کا یہ اصول درست رہے گا چاہے اسے ماضی پر بھی لاگو کیا جائے۔1820ء، جب بیشتر یورپی ممالک نے حق رائے دہی کو پھیلایا، میں ان کی فی کس آمدنی1700 ڈالر (یعنی دو ہزار امریکی ڈالر) تھی، جو1870ء میں بڑھ کر2700 اور1913ء— پہلی عالمی جنگ کی تباہی سے قبل— میں4800 ڈالر ہوگئی تھی (15)۔ اگرچہ ماضی سے متعلق یہ اعداد وشمار اندازوں وتخمینوں پر مبنی ہیں لیکن اس عبوری دور کے تحت ہی آئے ہیں، گو کہ اس کے آخری سرے پر۔ یہ بھی ہے کہ یہ ممالک1945ء کے بعد حقیقی آزاد خیال ہوئے جب کہ ان کی فی کس آمدنی 6000 امریکی ڈالرز کے لگ بھگ تھی۔ گذشتہ تیس برس سے لیکر سپین، یونان اور پرتگال سمیت ممالک کی کامیابیوں کا جائزہ لیں تو ہر ملک مجموعی پیداوار کے اس عبوری دور کے اعلیٰ درجہ میں پہنچ کر جمہوریا گیا ہے۔1989ء کے بعد مشرقی یورپ کے ممالک جو اس حد کے قریب ترین آمدنی رکھتے تھے ---پولینڈ، چیک ری پبلک، ہنگری-- نے تیزی سے اپنی جمہوری اصلاحات کو آگے بڑھایا۔ دوسری طرف اس حد کے نچلے درجے پر یا کم آمدنی والے تھے-- رومانیہ، البانیہ— نے کہیں زیادہ وقت لیا۔ پس تاریخ کے آئینے میں دیکھا جائے تو یورپ میں بھی معاشی ترقی اور جمہوریت کے مابین رشتہ موجود ہے۔ گو کہ کوئی ایک عنصر پوری کہانی بیان نہیں کرتا مگر مختلف براعظموں کے مخصوص تعداد میں جائزہ لئے گئے ممالک ،جن کی ثقافتوں میں فرق ہے اور تاریخی ادوار بھی مختلف ہیں، تو یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ایک سادہ سا کلیہ--فی کس مجموعی قومی پیداوار--- بہت کچھ بتا سکتی ہے۔

ملکی پیداوار پر میری اس بحث سے قاری یہ سمجھ سکتا ہے کہ میں جمہوریانے میں لیڈر شپ کی اہمیت کم کر رہا ہوں۔ بالکل بھی ایسا نہیں ہے۔ کوئی بھی سیاسی تبدیلی لیڈروں اور ان تحریکوں کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی جو آزادی کا مطالبہ کریں اور اس کے لئے دباؤ ڈالیں۔ ویکلھو ہیول، نیلسن منڈیلا، لیک ویلیس ،کم ڈائی جنگ جیسے لوگوں کو آزادی کی تاریخ میں بلند مقام حاصل ہے۔ لیکن یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ یہ رہنما اس خاص وقت میں ہی

کیوں کامیاب ہوئے ۔ ایک مصنف نے ان سوالوں سے تنگ آ کر یہ غصیلا جواب دیا: ''جنوبی کوریا میں جمہوریت فی کس آمدنی نے نہیں لائی بلکہ اس کی ''اخلاقی جرأت'' اس کا سبب بنی (16)۔'' یقیناً۔ لیکن یوگنڈا، بیلارس، مصر میں سچی لگن اور اخلاقی جرأت والے بہت سے مرد عورتیں ہوں گے جو ان علاقوں میں جمہوریت لانے کی متعدد کوششوں میں ناکام رہے۔ خود جنوبی کوریا کے کارکن 60ء، 70ء اور 80ء کے عشروں میں ناکام ہوتے رہے ہیں۔ دراصل سیئول کے صدر کم ڈائی جنگ تو اس سارے عرصے میں جیل میں تھے۔ کیا بات تھی جس نے اسے 70ء میں ناکام مگر 90ء کے عشرے میں کامیاب کر دیا۔ کیا 90ء کی دہائی میں اس میں ''اخلاقی جرأت'' آ گئی تھی؟ تائیوان کے پرجوش سیاسی لیڈر لی چن، ''فری چائنا'' اخبار کا مدیر، نے 60ء کی دہائی میں تائیوان میں جمہوریت لانے کی کوشش کی جب اس نے چائنیز ڈیموکریٹک پارٹی قائم کی تھی۔ وہ چن شوئی، انسانی حقوق کے لئے لڑنے والا وکیل جو 2000ء میں صدر منتخب ہوا، سے کم بہادر نہیں تھا۔ تو کیا وجہ تھی کہ انسانی حقوق کا ایک کارکن ناکام ہو گیا مگر دوسرا کامیاب؟

گہری سے گہری سیاسی بصیرت رکھنے والا کوئی بھی فرد پیشن گوئی نہیں کر سکتا کہ کسی ملک میں جمہوریت کب آئے گی۔ عموماً اس کا انحصار کسی ملک کے بعض تاریخی حقائق پر ہوتا ہے جو بری طرح ایک دوسرے میں الجھے ہوئے ہیں۔ سپین نے 1977ء میں ہی جمہوریت کی طرف قدم کیوں بڑھائے اس سے پہلے کیوں نہیں؟ کیونکہ کہ اس کا تاحیات آمر فرانکو دو سال قبل بھی مرا تھا۔ ہنگری نے 1989ء میں ایسا کیوں کیا؟ کیونکہ اس برس سوویت یونین نے سیاسی اصلاحات کی صورت میں اس پر حملہ کرنے کی دھمکیاں بند کر دیں تھیں۔ ہندوستان میں ایسا 1947ء میں کیوں ہوا؟ کیونکہ تب برطانیہ نے برصغیر پر اپنی حکومت ختم کر دی۔ ایسی بہت سے مثالیں ہیں۔ اس سے بھی دلچسپ سوال یہ ہے کہ کیا چیز جمہوریت کو پائیدار بناتی ہے۔ سیاسی حکومتیں مختلف وجوہات--- جنگ، اقتصادی بحران یا موت--- سے ختم ہوتی ہیں۔ مگر کسی آمرانہ حکومت کے خاتمے پر جب لوگ جمہوریت کی کوشش کرتے ہیں تو کیا اسے قائم رکھتی ہے؟ تاریخی حوالے سے اس کا ایک بہترین جواب ہے--- دولت۔

آزادی کے لیے دولت کیوں مفید ہے؟ یورپی مثالیں یاد کریں: اقتصادی ترقی کے جاری عمل سے عموماً دو عناصر جنم لیتے ہیں جو آزاد خیال جمہوریت کے لیے اہم ہیں۔ پہلا، یہ

سماج کے کلیدی طبقات ـــ اہم ترین ،ذاتی کاروبار، بورژوا۔۔ کو ریاست سے خودمختار رہ کر قوت حاصل کرنے کے لائق بناتی ہے۔دوسرا، ان طاقتور طبقات سے لین دین کرتے ہوئے ریاست انتقامی اور لالچی رویہ ترک کر کے زیادہ بااصول اور سماج ـــ یا کم از کم اس کی اعلیٰ طبقہ۔۔ کی ضروریات پر غور کرنے کا رویہ اختیار کرتی ہے۔ یہ سارا عمل آزاد خیالی کو جنم دیتا ہے اور ایسا بیشتر اوقات بنا کسی منصوبہ بندی کے ہوتا ہے۔منشن پائی 80ء اور 90ء کے عشرے میں آزاد خیال جمہوریت کی طرف تائیوان کے سفر کو یورپی زبان میں بیان کرتا ہے:

''تیز رفتار ترقی نے ایسے آزاد خیال نتائج دیئے کہ حکمران طبقے کو ان کا پیشگی وہم وگمان تک نہ تھا۔ بڑھتی ہوئی اقتصادی ترقی کے ساتھ ہی تائیوان نے وہ تمام پہلو ظاہر کر دیئے جو تمام سرمایہ دارانہ سماج کا خاصا ہیں: شرح خواندگی میں اضافہ، ابلاغ بڑھ گیا، فی کس آمدنی بڑھ گئی اور ایک بلدیاتی طبقہ۔۔ جس میں مزدور، پیشہ ور مڈل کلاس اور کاروباری مالکان شامل تھے ـــ سامنے آ گیا۔ کاروباری طبقہ اپنی آزادی کے باوصف قابل رشک تھا۔ اگرچہ انفرادی کاروباری ادارے چھوٹے اور غیر منظم تھے مگر ریاست کی ان تک رسائی ناممکن تھی (17)۔''

مشرقی ایشیا کے بیشتر حصہ میں یہ ساری کہانی ہی دہرائی گئی، اگرچہ مقامی حالات میں تھوڑا بہت فرق تھا۔ یورپ کی طرح یہاں بھی اقتصادی آزاد خیالی نے بورژوا اور سول سوسائٹی کو جنم دیا اور پھر، دہائیوں بعد، معقول حد تک آزاد خیال جمہوریت پیدا ہوئی۔ یورپ کی طرح یہاں کے آمروں کو بھی پتہ نہ چلا کہ وہ جمہوریار ہے ہیں۔لیکن ترقی اور جدیدیت کا آغاز کر کے انہوں نے ایسی قوتیں سامنے لائیں جنہیں وہ قابو نہیں کر سکتے تھے۔مورخ فلپ نورڈ اس عمل کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

''آمر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ صرف ترقی چاہتے ہیں لیکن اس بڑھاوا دے کر وہ فاش غلطی کرتے ہیں۔ترقی تعلیم یافتہ متوسط طبقہ کے حق میں جاتی ہے؛ یہ ''کثرت پسند ڈھانچہ'' پیدا کرتی ہے، ایک ایسی سول سوسائٹی جنم دیتی ہے جسے اوپر رہ کر قابو نہیں کیا جا سکتا۔۔۔آمرانہ ریاست اس دوراہے پر عوام کو مضبوط گرفت

سے آزاد کرنے کا سوچ سکتی ہے۔مگر یہ فیصلہ جان لیوا ثابت ہوتا ہے، کیونکہ آزاد خیالی کی درزوں سے عوام میں بے چینی بھی در آتی ہے اور اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ منظّم حزب اختلاف کا روپ دھار لیتی ہے(18)۔"

نورڈ انیسویں صدی کے اختتام پر فرانس کے جمہوریانے کی منظر کشی کر رہا ہے لیکن اس کی کتاب بیسویں صدی کے اختتام پر مشرقی ایشیا کی صورتحال بھی ٹھیک ٹھیک بیان کرتی ہے۔

غریب مبارک ہیں

پیسہ نہ تو جمہوریت کا ذریعہ ہے نہ ہی بذات خود اس کی ضمانت دے سکتا ہے۔اس کا مقصد یقیناً دولت کا حصول ہونا چاہئے۔گزشتہ نصف صدی کے دوران بعض حکومتیں امیر تو ہو گئیں لیکن رہیں آمرانہ: مثال کے طور پر خلیج فارس میں شیوخ کی ریاستیں، نائیجیریا اور وینیز ویلا۔نتیجہ نکلتا ہے کہ تیل سے مالا مال ان ریاستوں کی دولت مثبت سیاسی تبدیلیاں نہیں لاتی کیونکہ ان کی اقتصادی ترقی یورپ یا ایشیا سے بالکل مختلف ہے۔یہ معیشتیں سرمایہ داری خطوط پر آگے نہیں بڑھیں؛ یعنی زراعت سے صنعت اور بڑے پیمانے کی خدمات تک پہنچنے کا منظّم اختیار نہیں کیا۔ بلکہ تیل اور دوسرے معدنی وسائل کو استعمال میں لاتے ہوئے انہوں نے جدیدیت کو نئی عمارتوں، ہسپتالوں، محلات، کاروں اور ٹی وی کی صورت میں قیمتاً خرید لیا۔ ان ممالک کے باشندے بھی پہلے کی طرح ہی رہے ہیں--ان پڑھ اور غیر فنی۔سماج بھی ترقی کے ابتدائی درجے میں رہا۔ ریاست کو ہسپتال، سکول اور ٹی وی اسٹیشن جیسے ادارے چلانے کے لیے معلومات اور افرادی قوت سمندر پار سے درآمد کرنا پڑی۔نتیجہ ایسے کاروباری طبقے کی صورت میں برآمد ہوا جو ریاست کی محتاجی سے آزادی ہونے کی بجائے بری طرح سے اس پر انحصار کرتا تھا۔

چند اعداد و شمار حقیقت حال بیان کر دیں گے۔ مثال کے طور پر سعودی عرب میں فی کس آمدنی زیادہ ہونے کے باوجود شرح خواندگی 62 فیصد ہے اور صرف 50 فیصد عورتیں پڑھنا جانتی ہیں۔کویت، قطر اور متحدہ عرب امارات کی حالت اس سے قدرے بہتر ہے جن میں بالغ شرح خواندگی 70 فیصد کے آس پاس گھوم رہی ہے۔اس کے برعکس فلپائن اور تھائی

لینڈ، جہاں سے خلیجی ریاستیں اپنی افرادی قوت کی بڑی تعداد حاصل کرتی ہیں، میں شرح خواندگی 90 فیصد کے نصف میں ہے اور اسے مشرقی ایشیا میں کم ترین شمار کیا جاتا ہے۔ اگر پڑھی لکھی۔۔ یا کم از کم خواندہ۔۔ آبادی جمہوری یا اشتراکی حکومت کی شرط اول ہے تو تیل پیدا کار عرب ریاستوں کی بے بہا دولت کے باوجود وہاں یہ طبقہ غیر موجود ہے۔

آزاد خیال جمہوریت کے لیے بہترین اقتصادی ترقی سرمایہ داری ہی ہے۔ مارکس کو یہ سمجھنے والوں میں اولیت حاصل ہے جب اس نے کہا تھا کہ سرمایہ داری بورژوا جمہوریت کی صورت میں موافق ترین نظامِ حکومت جنتی ہے۔ مارکس نے دلائل سے ثابت کیا کہ سرمایہ داری کاروباری بورژوا روپ میں ایسی قوت میدان میں لاتی ہے جو آمریت کو ختم کر کے جائیداد، معائدہ، قانون اور دوسری شہری آزادیوں کی حفاظت یقینی بناتی ہے۔ جہاں بورژوا یہ کردار ادا نہ کرے، جیسے انیسویں صدی کا جرمنی، سماج میں اصلاحات ممکن نہیں ہوتیں۔ لاطینی امریکہ پر غور کریں۔ بیسویں صدی کے بیشتر دور میں لاطینی امریکہ میں کاروبار نے ایک طرح سے ریاستی سرمایہ داری کی شکل میں پیش قدمی کی۔ مقامی دولت مندوں نے فوج اور بیوروکریسی کے ساتھ ملی بھگت سے اپنی صنعتوں کو محفوظ رکھا اور محصولات وقواعد کے لئے بازنطینی نظام قائم کیا جو صرف طاقتور کو ہی خوش رکھتا تھا۔ یہ نہ صرف حقیقی معاشی ترقی کی راہ میں رکاوٹ تھا بلکہ سیاست کے لیے مفید ثابت نہ ہوا۔ کاروباری طبقہ کا بڑا حصہ خستہ حال اور ریاست کا محتاج رہا۔ لاطینی امریکہ کی حالیہ سیاسی تبدیلیاں بھی انیسویں صدی کے جرمن ماڈل سے مختلف ہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ لاطینی امریکہ کا واحد ملک جو سب سے پہلے اور پختگی سے اس روایتی نظام سے باہر نکلا آج اس کی مستحکم ترین معیشت اور ریاست ہے۔۔۔ چلی۔

قدرتی وسائل سے ملنے والی دولت سیاسی اصلاحات اور معاشی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہوتی ہے۔ ہارورڈ کے دو معیشت دانوں، جیفری ڈی ساچیز اور اینڈریو ایم وارنر، نے دو دہائیوں (89-1971) تک 97 ترقی پذیر ممالک کا بغور جائزہ لینے کے بعد نتیجہ اخذ کیا کہ قدرتی وسائل کا معاشی ناکامی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اصول یہ ہے کہ ملک معدنیات، زراعت اور تیل کے ذخائر میں جس قدر امیر ہو گا معیشت اسی قدر سست ترقی کرے گی۔۔ سعودی عرب اور نائیجیریا۔ قدرتی وسائل سے تہی ممالک۔۔ جیسے مشرقی ایشیا میں۔۔ نے تیز

ترین ترقی کی۔جن کے پاس قدرتی وسائل معقول مقدار میں تھے— جیسے مغربی یورپ— نے ان دو انتہاؤں کی درمیانی رفتار سے پیش قدمی کی۔ تاہم، بعض ممالک اس اصول لاگو سے آزاد ہیں— چلی، ملائیشیا، امریکہ میں قدرتی وسائل کی فراوانی کے ساتھ معاشی اور سیاسی ترقی بھی ہے۔ بہرحال، عمومی اصول حیران کن حد تک درست ہے(**19**)۔

بغیر محنت کے حاصل کی ہوئی دولت لعنت کیوں بن جاتی ہے؟ کیونکہ یہ جدید سیاسی اداروں، قوانین اور ریاستی مشینری کو پنپنے نہیں دیتی۔فرض کریں ہر حکومت کا اولین مقصد خود خود کو زیادہ سے زیادہ دولت مند و بااختیار کرنا ہے۔ایسے ملک میں جہاں دولت مند ہونے کے لیے ریاست کے پاس قدرتی وسائل موجود نہیں، سماج کو دولت مند بنانا پڑتا ہے تاکہ اس پر محصولات لگائے جاسکیں۔ اس حوالے سے مشرقی ایشیا کے لیے غربت اسکے لئے نعمت ثابت ہوئی۔ان ریاستوں کو مؤثر حکومت قائم کرنے کے لیے کٹھن محنت کرنا پڑی کیونکہ اس طریقے سے ملک اور ریاست کو دولت مند کر سکتے تھے۔جن ریاستوں کی مٹی میں خزانے چھپے ہوں انہیں ہر شے با آسانی دستیاب ہو جاتی ہے: یہ ''ٹرسٹ فنڈ'' سے چلنے والی ریاستیں ہیں۔معدنیات یا تیل وغیرہ کی فروخت پر پل کر ان پر چربی چڑھ جاتی ہے اور قومی دولت پیدا کرنے کے لیے قوانین اور ادارے بنانے جیسے مشکل کام کا دردسر مول نہیں لیتے (نائیجیریا، وینیزویلا، سعودی عرب)۔ تیرھویں صدی کے ترک شاعر یوسف نے اس تصور کو ایک شعر میں بیان کیا ہے:

''حکومت قائم رکھنے کے لیے سپاہی گھوڑے اور پیادے درکار ہوتے ہیں؛
ان سپاہیوں کے لیے دولت چاہئے۔
اس دولت کیلئے لوگوں کی امارت درکار ہے؛
لوگوں کی امارت کے لئے قوانین منصفانہ ہونے چاہییں۔
اگر ان میں سے ایک بھی چھوٹ جائے تو چاروں ادھورے رہیں گے؛
اور اگر چاروں ادھورے رہیں گے، بادشاہت کا تانا بانا بکھر جائے گا(**20**)۔''

اس نظریہ کا ایک اصول یہ کہتا ہے کہ جب کسی حکومت کو آسان دولت تک رسائی ہو جائے— مثلاً کسی نہر سے آمدورفت پر محصول (جیسا کہ مصر) یا بیرونی امداد (افریقہ کے بیشتر ممالک)— وہ سیاسی طور پر غیر ترقی یافتہ رہیں گے۔آسان دولت کا مطلب ہے

ریاست کو اپنے شہریوں پر ٹیکس نہیں لگانا پڑے گا۔ ریاست شہریوں پر محصول عائد کرے تو اسے بدلے میں سہولیات بھی دینا ہوتی ہیں؛ جن کا آغاز تو خدمات، احتساب اور گڈ گورننس کی صورت میں ہوتا ہے لیکن اختتام شہری آزادیوں اور حکومت میں نمائندگی پر ہوتا ہے۔ یہی سودے بازی— محصولات اور نمائندگی کے درمیان -- جدید دنیا میں حکومتوں کے لئے اقتدار کا جواز پیدا کرتا ہے۔ اگر حکومت عوام میں جڑیں مضبوط کیے بغیر دولت حاصل کرنے لگے تو ریاست نہیں رہتی دربار بن جاتی ہے اور اس کا کاروباری طبقہ درباری ہوتے ہیں۔* سعودی عرب کے شاہی خاندان تو ایک نیا سودا اپنی عوام کو پیش کرتا ہے: ''ہم تم سے معاشی حوالے سے زیادہ نہیں پوچھیں گے اور تمہیں سیاسی حوالے سے بھی زیادہ نہیں دیں گے۔'' یہ امریکی انقلاب کے نعرے کا الٹ ہے--- کوئی ٹیکس نہیں تو نمائندگی بھی نہیں۔

کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ ریاستوں کو قدرتی وسائل کی غربت کی ہی امید رکھنی چاہیے۔ بہت سے غریب ممالک نہ جمہوریائے ہیں اور نہ ہی سرمایہ دار ہوئے۔ سیاسی ادارے، لیڈر شپ اور قسمت کسی بھی ریاست میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ اس طرح بعض امیر ممالک بھی ترقی کر لیتے ہیں— جیسے بعض ٹرسٹ فنڈ بچے بہتر زندگی گزارتے ہیں۔ بیشتر یورپی ممالک نے جمہوری اصلاحات کا آغاز اس وقت کیا جب وہ باقی دنیا سے بہتر تھے۔ لیکن جیسا کہ پہلے باب میں تفصیلاً بتایا گیا، یورپ کو بعض ممتاز فائدے حاصل تھے۔ چرچ اور ریاست، کیتھولک اور پروٹسٹنٹ اور بادشاہ اور سرداروں کے درمیان طویل جنگوں نے آزاد خیال اداروں اور محدود حکومت کو جنم دیا۔ بعض غیر یورپی ممالک کی اس جدوجہد میں تھوڑا فرق تھا۔ مثلاً ہندوستان کا سیاسی تنوع-- درجنوں خطوں، مذاہب اور زبانوں کے فرق سمیت--- اس کی جمہوریت کے لئے خطرہ ہونے کی بجائے، شاید اس کی ضمانت بن گئی ہے۔ پولینڈ میں طاقت ور اور ریاستی اثر و رسوخ سے آزاد کلیسیا نے جمہوریت کو مضبوط کیا ہے۔ پس یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہے کہ اگرچہ مخصوص تاریخی حقائق اور ادارے اس عمل میں مددگار ہوتے ہیں لیکن سرمایہ داری میں ترقی ہی کے ذریعہ پرانے جاگیرداری نظام کی جگہ موثر محدود اختیارات

---

* یہ تصور ترقی یافتہ جمہوریتوں کی حالتِ زار پر بھی روشنی ڈالتا ہے: تیل اور سرپرستانہ سیاست ٹیکساس میں کچھ عرصہ پہلے تک بانہوں میں بانہوں ڈال کر چلتے رہے۔

کی ریاست قائم کی جاسکتی ہے۔

ریاست کی تعریف میں

آزاد منڈی کے حامی اکثر یہ غلطی کرتے ہیں سرمایہ داری کو ریاست کا مدمقابل سمجھ لیتے ہیں۔ جب ٹیکس دینے کی بات آتی ہے تو اسے روبرو دیکھا جاسکتا ہے۔ لیکن حقیقت اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ اگرچہ بیسویں صدی میں بہت سی ریاستیں اس قدر طاقتور ہو گئی تھیں کہ معیشت کی رفتار سست کرسکیں، وسیع تاریخی تناظر میں دیکھیں تو ایک جائز اور فعال ریاست ہی سرمایہ داری کے لیے ساز گار قواعد وضوابط بنا سکتی ہے۔ پست ترین سطح پر دیکھیں تو جائیداد اور انسانی حقوق، آزاد پریس، اجارہ داری مخالف قوانین اور صارفین کے مطالبات پورے نہ کرنے والی حکومت تو اس میں قانون کی حاکمیت نہیں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اصول رائج ہوتا ہے۔ اگر کوئی ریاست میں حکومت کی غیر موجودگی کے اثرات کا مشاہدہ کرنا چاہے تو افریقہ کا جائزہ لے — یہ آزاد منڈی کی جنت نہیں ہے۔

ترقی پذیر ممالک میں عموماً ریاست کو یک لخت سرمایہ داری نظام اپنانا پڑتا ہے۔ یہ یورپی طریقے کا عکس ہے جس میں جدید سرمایہ داری کا آغاز اسطرح ہوا کہ حکومت جاگیر داروں سے زرعی قطعات خرید کر انہیں تجارت دوست منصوبوں میں استعمال کرنے لگی۔ اس حکمت عملی نے بڑے بڑے زمینداروں کی کمر توڑ کر رکھ دی جو سماج میں مزاحمتی قوتوں کا کردار ادا کرتے تھے۔ اسی طرح اس حکمت عملی بھی اہم ثابت ہوئی کہ لاکھوں ایکڑ زمین کو جاگیرداروں کے ہاتھوں سے نکال کر، جہاں یہ بے کار پڑے رہتے، مارکیٹ نظام میں شامل کر دیا گیا۔ ان کے نئے مالکان جو عموماً کسان ہی ہوتے، اس کی کاشت میں بھرپور محنت کرتے کیونکہ اب انہیں اس کا صلہ دیا جاتا تھا یا کسی ایسے شخص کو کرایہ پر دے دیتے جو اس کا بہتر استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ دوسرے لفظوں میں سرمایہ داری کو متحرک کرنے کے لیے دولت کی بڑے پیمانے پر دوبارہ تقسیم کا عمل شروع کیا گیا۔

یورپ میں زراعت نے جدید رجحانات اپنانے میں کئی صدیاں لگا دیں۔ جبکہ تیسری دنیا میں گزشتہ پچاس برسوں ہونے والے زرعی اصلاحات نے وہی نتائج دیئے ہیں۔ اس کے تحت جاگیرداروں، جو نظری اصول سے تو ان کے مالک تھے، سے ان کی ملـکیتیں

چھین کر ان مزارعین کو دی گئیں جو کئی نسلوں سے انہیں کاشت کرتے چلے آ رہے تھے۔ جائز یا جائز ہونے کے قطع نظر، اس عمل سے قابل کاشت رقبے کو آزاد کیا۔۔۔ جو عموماً ماقبل سرمایہ داری دور میں قیمتی اثاثہ ہوتا ہے۔۔۔ اور اسے منڈی کی معیشت میں لا کھڑا کیا۔ زرعی اصلاحات نہ صرف مشرقی ایشیا (خصوصاً جاپان' تائیوان اور جنوبی کوریا)۔۔۔ بلکہ لاطینی امریکہ سمیت جہاں بھی ان پر عمل میں لائی گئیں (کوسٹاریکا' میکسیکو اور چلی وغیرہ)۔۔۔ میں معاشی و سیاسی کامیابیوں کی کلید ثابت ہوئیں۔

مغرب کے کنزرویٹو حلقوں نے عموماً سرد جنگ کے دوران زرعی اصلاحات کی مخالفت کی۔۔۔ ان کے خیال میں یہ مارکس انداز کا طرز عمل تھا اور اس کے حامی بائیں بازو سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن، درحقیقت، یہ سرمایہ داری کو فروغ دے کر جمہوریت کی ترقی کا سبب بنتا ہے۔ تنگ نظر کسانوں کے سماج کو جدید سرمایہ داری اور جمہوری پر استوار کرنے کیلئے زرعی اصلاحات مشکل فیصلہ ثابت ہوئی ہیں۔ تیسری دنیا کے ممالک جن میں زرعی اصلاحات ناکام ثابت ہوئی ہیں۔۔۔ وسطی اور لاطینی امریکہ کے بعض حصے، پاکستان، زمبابوے اور دوسری متعدد افریقی ریاستیں۔۔۔ اپنی زراعت کو کاروباری انداز میں نہیں ڈھال پائے اور نیم جاگیردار طبقہ کی موجودگی میں ان کے لیے جمہوریت کا تجربہ انتہائی تلخ رہا۔ حتیٰ کہ بھارت میں بھی، جہاں جمہوریت غیر فعال ترین ہے (اترپردیش اور بہار کی شمالی ریاستیں)، وہی ہیں جہاں زرعی اصلاحات کامیاب نہیں ہوسکیں۔ امریکی ذاتی جائیداد اور آزادی کے مابین رشتہ کو بخوبی سمجھتے ہیں، اسی لیے ان کی حکومتوں نے خانہ جنگی کے بعد ہوم سٹیڈ ایکٹ کے تحت شہریوں میں اراضی کے قطعات تقسیم کیے۔ پیرو کے دانشور ہرنینڈ وڈی سوتو کا کہنا ہے تیسری دنیا میں غریبوں کو ذاتی جائیداد کے مکمل حقوق سے محروم رکھنا ان کی معاشی (اور میں کہوں گا سیاسی بھی) ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی ہے (21)۔

آئندہ رجحان

آئندہ ہم دنیا کے کسی حصے میں جمہوریت پھلتا پھولتا دیکھیں گے؟ اس کی پیشگوئی تو نہیں کی جاسکتی کہ مستقبل میں جمہوریت کا تجربہ کہاں کیا جائے گا؛ اسکا انحصار اتفاق پر ہے۔ لیکن ان علاقوں کی نشاندہی ممکن ہے جہاں یہ جڑیں پکڑ سکتی ہے۔ حالیہ برسوں میں جس ملک

نے اس طرف قابل ذکر پیش قدمی کی وہ میکسیکو ہے کیونکہ اس نے مشرقی ایشیا کی پیروی کی ہے(جس نے خود یورپ کی نقل کی)۔ پہلے اقتصادی اصلاحات بعد میں سیاسی۔

میکسیکو1926ء میں جدید قیام کے بعد سے یک جماعتی ریاستی نظام کے تحت ہی رہا ہے۔میکسیکو کی انسٹی ٹیوشنل ریوولوشنری پارٹی (پی آر آئی) حکومت کے تمام شعبوں میں غالب تھی۔انتخابات اور پارلیمنٹ کے باوجود میکسیکو میں جمہوریت کھوکھلی ہی تھی۔ لیکن عشرہ80ء کے ابتدائی برسوں میں قرضوں کے بحران کے بعد پی آر آئی نے اقتصادی اصلاحات کی مہم کا آغاز کیا۔۔ خود کو عالمی معیشت پرآشکار کیا جائے اور داخلی معاشی نظام کو پابندیوں سے آزاد کرنا۔ ہمیشہ کی طرح ان اقتصادی اصلاحات کیلئے قانونی اصلاحات اور دوسری رعائیتیں درکار تھیں۔اصلاحاتی عمل کوشمالی امریکہ میں آزادتجارت کے معاہدے سے بہت تقویت ملی جس نے سرمایہ داری کومیکسیکو کی قسمت میں لکھ دیا۔1990ء کی دہائی کے اختتام تک پی آر آئی نے سیاسی اصلاحات کا آغاز بھی کر دیا اور2001ء میں صدر ارنسٹو زیڈیلو نے ملکی تاریخ میں پہلے آزادانہ انتخابات کرانے کا دلیر اور دور اندیش فیصلہ کیا۔ انتخابات میں حزب اختلاف کا جیت گیا اور دسمبر2001ء میں ونسنٹ فاکس میکسیکو کے پہلے منتخب صدر بن گئے۔

میکسیکو نے مشرقی ایشیا کی پیروی کی ہے تو اسے مغربی میڈیا کی طرف سے ایسے ہی ردعمل کا سامنا بھی رہا ہے۔نمایاں قانونی اور اقتصادی آزاد خیال اصلاحات کے باوجود مغربی اخبارات اور رسائل پی آر آئی کوشدت پسند اور مطلق العنان حکومت شمار کیا جاتا تھا۔ 1990ء کی دہائی میں بیس برس کی اصلاحات کے باوجود میکسیکو کومعمول کے مطابق آمرانہ ریاست ہی کہا جاتا تھا۔میکسیکو میں جمہوریانے کا عبوری دور اس وقت شروع ہوا جب اس کی فی کس آمدنی 9ہزار امریکی ڈالر سے تھوڑی ہی زیادہ تھی جو اس بات کا غماز ہے کہ یہ اپنے نئے سیاسی روپ میں محفوظ رہے گا۔ آیئے دوبارہ اس بنیادی قضیے کی طرف چلیں (فی کس آمدنی) اور وہ ممالک تلاش کریں جہاں حالات جمہوریانے کے عبوری دور کے اوپری درجے میں ہیں۔۔یعنی5000 امریکی ڈالر سے6000 ڈالرز کے درمیان۔ قدرتی وسائل سے دولت حاصل کرنے والے ممالک کو نکال کر ہمارے پاس رومانیہ، بیلارس، بلغاریہ، کروشیا، ملائیشیا، ترکی، مراکش اور ایران باقی بچتے ہیں*۔ یہ وہ چند ممالک ہیں جہاں اگر کبھی

کوشش کی گئی تو جمہوریت کے حقیقی اور آزاد خیال بننے کے مکمل آثار موجود ہیں۔

رومانیہ (6,800 امریکی ڈالر)، بیلارس (7,550 ڈالر)، بلغاریہ (5,530 ڈالرز) اور

*اگرچہ ایران تیل پیدا کرنے والا ملک ہے لیکن اسے اس فہرست میں شامل کرنا اس طرح درست ہے کہ اسکی معیشت شروع ہی غیر تیل کے مضبوط پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ ایران پر مزید بحث کے لئے دیکھئے باب 4۔

کروشیا (7,780 ڈالرز) کی فی کس آمدنی 6000 امریکی ڈالرز کے لگ بھگ ہے جس سے حالات ان کے موافق نظر آتے ہیں۔ ماضی کی طرح، یہ یورپی ریاستیں بھی کم آمدنی کے باوجود اس عبوری دور سے گزر سکتی ہیں کیونکہ یہاں آزاد ریاستی اداروں کی روایت موجود ہے۔ بیلارس اس سلسلے میں غیر معمولی ہے کیونکہ اسکی معیشت کا زیادہ انحصار روس پر ہے، اگر یہ اپنے منتخب آمر الیگزینڈر لوکیشنکو سے نجات پالے تو حیران کن ترقی کر سکتا ہے۔

دوسری طرف آمریت اور جمہوریت کے ملے جلے نظام والی ریاستوں، ملائیشیا (8,360 ڈالر) اور ترکی (7,030 ڈالر)، کی فی کس آمدنیاں 6000 ڈالر کی حد سے کہیں آگے ہیں اس لیے ان کی کامیابی کے امکانات روشن ہیں۔ ملائیشیا نے مشرقی ایشیا کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے پہلے اپنی معیشت کو پابندیوں سے آزاد کیا جبکہ سیاست کو پابہ زنجیر رکھا (افسوسناک ہے کہ سیاسی رہنما انور ابراہیم کی قید کی صورت میں واقعی ایسا ہوا) اور حقیقی جمہوریت کے عمل کو سست کر دیا۔ ترکی بھی ایک دلچسپ اور پیچیدہ کیس ہے۔ یہ ایک حقیقی جمہوری ریاست نہیں ؛ فوج وہاں براجمان ہے جس نے ساڑھے تین مرتبہ منتخب سربرائے حکومت کا تختہ الٹا ہے (یہ نصف 1998ء میں ہوا جب فوج نے مذہبی جماعت کی منتخب حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ ایک ترک صحافی چنگیز متیندر نے اسے ''ما بعد جدیدیت کی بغاوت'' کہا ہے)۔ ترک فوج خود کو ریاست کے سیکولر روپ کا محافظ سمجھتی ہے اور بعض ہم خیال ججوں کی معاونت سے اس نے بزور اس پر عمل کراتی ہے۔ مجموعی طور پر اس اونچے طبقہ نے ترک سماج کو جدید اور مستحکم بنانے کا کردار ادا کیا ہے لیکن ان کے جوش نے ان کی افادیت ختم کر دی ہے۔ ترکی میں ایک ہی محرک آزاد خیال اصلاحات کے لئے کام کر رہا ہے: یورپی یونین کی رکنیت کی امید، جس نے اس ریاست میں حالات کو قابو میں رکھنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ ترک پارلیمنٹ نے اکتوبر 2001ء میں تیس آئینی ترامیم متعارف کرائیں

ہیں تاکہ خودکو یورپی یونین کے معیار کے مطابق لایا جا سکے۔اس کے بعد بڑی بڑی ترامیم کی گئی ہیں۔اگر یورپی یونین میں سٹریٹیجک بصیرت ہوئی تو رکن ممالک جان لیں گے کہ ترکی کہ تاخیر کی بجائے جلدی شامل کرنا دونوں فریقوں کے لئے بے بہا فائدہ مند ہوگا---اور یہ دکھایا جاسکتا ہے کہ ایک جدید اور جمہوری مسلم معاشرے کو مغرب نے قبول لیا ہے۔

دوسرے دو ممالک جہاں یہ امکانات پوشیدہ ہیں: تیونس (6,090امریکی ڈالر) اور مراکش (3,410امریکی ڈالر) ہیں۔ تیونس میں آمریت، مراکش میں بادشاہت ہے۔لیکن دونوں نے موجودہ نظام پر گرفت ڈھیلی کرنے کے لیے اقدامات خصوصاً معاشی کیے ہیں۔ تیونس کے صدر زین العابدین بن علی اپنی حکومت کی دوسری دہائی میں ہیں۔انہوں نے ملک کو جکڑ رکھا ہے، سیاسی آزادی، حتیٰ کہ آئینی اصلاحات پر بات کرنے کی گنجائش بھی کم ہی دی جاتی ہے۔لیکن تیونس کی معاشی ترقی متاثر کن اور اس کے فوائد وسیع تر ہیں۔بعض اندازوں کے مطابق گزشتہ برسوں کے دوران تیونس کے متوسط طبقے میں دس گنا اضافہ ہوا ہے اور یہ ملک کی نصف سے زائد آبادی پر مشتمل ہے۔ان معاشی اصلاحات کے اثرات قانون، آمدورفت اور معلومات کے نظام پر بھی پڑنے لگے لیکن مجموعی طور پر بہتری کی رفتار بہت آہستہ ہے۔مراکش کی حالت اس سے قابل رحم ہے۔اس میں باتیں زیادہ کی جاتی ہیں لیکن عمل کی طرف دھیان نہیں دیا جاتا۔ بادشاہ محمد ششم کو اپنے والد حسن دوم سے عہد وسطیٰ سے مشابہہ رسیاستی ڈھانچہ وراثت میں ملا ہے۔نوجوان بادشاہ نے اپنی متاثر کن تقریروں میں معاشی اصلاحات، قانون کی حاکمیت، عورتوں کے لیے مساوی حقوق اور رعایا کی شہری آزادی کا جوش وخروش سے ذکر کیا۔لیکن تین برس گزرنے کے بعد حالات میں بہت تھوڑی تبدیلی آئی ہے۔تاہم دوسری عرب ریاستوں کے مقابلے میں تیونس اور مراکش آج بھی آزاد خیال سماج ہیں۔اگر وہ اپنی معیشت کے بعد سیاست کو درست کرنے میں کامیاب ہو گئے تو یہ ساری دنیا کے لیے پیغام ہوگا کہ کوئی ثقافت، مذہب، علاقہ، جمہوریت میں رکاوٹ نہیں۔

مشین کو روکا نہیں جاسکتا

سرمایہ داری اور جمہوریت کے باہمی تعلق کے کڑی آزمائش آئندہ چند دہائیوں میں

چین میں ظاہر ہونے والی ہے۔ چینی حکمرانوں کے میڈیا میں جاری کیے جانے والے تاثر بعض اوقات منفی ہوتے ہیں۔ بعض سیاستدان اور مبصران کے لیے ''بیجنگ کے قصائی'' کا لقب استعمال کرتے ہیں۔ یقیناً اس میں کچھ حقیقت بھی ہے: تیانمن سکوائر کا قتل عام بہت بے دردتھا۔ چین کے حکمران طبقہ کیلئے زیادہ موزوں تشبیہ الجھے ہوئے کیمونسٹ باغی کی ہے جو دنیا کے آبادترین ملک میں اصلاحات لاتے ہوئے محتاط نظروں سے اردگرد دیکھ رہے ہیں جبکہ انہیں اپنی حکومت کو بھی ہاتھوں میں رکھنا ہے۔ اگر حالات اچھے رہے تو انہیں عالمی صنعتی قوت کے معماروں کی حیثیت سے عزت دی جائے گی۔ لیکن اگر خدانخواستہ تجربات راہ سے بھٹک گئے تو قتل کر دیئے جائیں گے یا منگولیا میں جلاوطن پائے جائیں گے۔

چینی رہنماؤں کا تجربہ یہ کوشش ہے کہ اسکی معیشت کو پابندیوں سے آزاد کیا جائے لیکن سیاسی تبدیلی پر بھی کڑی نگرانی باقی رہے۔ بہت آسانی سے انہیں طنز کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے کہ فاشسٹ ریاست میں سرمایہ داری پر عمل درآمد کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ چین میں سرمایہ داری کو متعارف کرانے کیلئے معاشی تبدیلیوں سے کچھ زیادہ کی ضرورت ہے، اس لیے انہوں نے نمایاں انتظامی اور قانونی اصلاحات بھی عمل میں لائی ہیں۔ ریاستی نظام کو پابندیوں سے آزاد کرنے کے بہترین طریقہ کی تلاش کی بحث چین میں کافی حد تک آزاد اور عام ہے۔ حکومت نے بعض دیہاتوں میں آزاد انتخابات منعقد کروائے اور تاجروں کو کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت کا موقعہ بھی دیا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر سیاسی نظام پر حکومت کی گرفت تا حال کافی مضبوط ہے اور اختلاف رائے کو بزور دبایا جاتا ہے۔ چینی حکمرانوں کا خیال ہے کہ چین جیسے وسیع، غریب اور متنوع مزاج ملک میں قبل از وقت جمہوریت سے انتشار ہی جنم لے سکتا ہے۔ ان کے پاس خودغرضانہ وجوہات بھی ہیں: کمیونسٹ پارٹی اختیارات پر اپنی اجارہ داری کھو بیٹھے گی۔

چین میں معاشی اصلاحات کے نتائج حیران کن رہے ہیں۔ 1980ء سے 2000ء کے درمیان چین کی فی کس اوسط آمدنی 1,394 سے تین گنا بڑھ کر 3976 ڈالر ہو گئی ہے۔ 17 کروڑ افراد غربت کی لکیر سے اوپر آ گئے ہیں۔ ساحل پر آباد متحرک صوبوں کی طرف سے درآمدات آسمان کو چھونے لگی ہیں۔ صوبہ شینزن نے 1981ء میں ایک کروڑ 70 لاکھ امریکی ڈالر کی اشیا فروخت کیں؛ دس برس بعد یہ مالیت پانچ ارب 90 کروڑ امریکی ڈالر تک پہنچ

گئی۔ آج یہ رقم 30 ارب ڈالر سے زائد ہے۔ ان علاقوں میں بیرونی سرمایہ کاری کا دخل بھی ہے۔ دوسری تبدیلیاں اس عمل میں زیادہ رکاوٹ رہی ہیں۔ ریاست کی ملکیت کاروباری ادارے۔۔ حکومت کے بڑے بڑے کارخانے اب بھی چین کی صنعتی پیداوار میں نصف سے زائد حصہ ڈالتے ہیں، اگرچہ 1980ء میں یہ شرح 80 فیصد تھی اور اس وقت سے اس میں مزید کمی ہو رہی ہے۔ تاہم زرعی اصلاحات کا عمل کافی سست ہے۔ لیکن اگر حالات اس سمت میں آگے بڑھتے رہے تو آئندہ دو دہائیوں تک ایک مستحکم اور ایسی تجارتی معیشت کا حامل ملک سامنے آئے گا جو عالمی معیشت سے ہم آہنگ ہو۔ یہ تبدیلی چین کے لیے حیران کن ہو گی۔ عالمی تجارتی تنظیم (ڈبلیو ٹی او) سے معاہدوں پر عمل درآمد کے لئے حکومت کو داخلی معیشت میں شفافیت، احتساب اور نظم وضبط کو یقینی بنانا ہوگا۔ عالمی تجارتی تنظیم میں چین کی شمولیت کا عمل سست ہے مگر کسی زلزلے سے کم نہیں ہوگا۔

بعض لوگ چین کی اس تبدیلی کو متاثر کن تو سمجھتے ہیں کہ لیکن یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ اقتصادی آزاد خیالی سے سیاسی تبدیلی لازم نہیں آتی۔ بالاخر کمیونسٹ تا حال اقتدار میں ہیں۔ لیکن چین ابھی تک تیسری دنیا کا غریب ملک شمار ہوتا ہے جہاں بورژوا اقلیت کی تعداد بہت کم ہے۔ لیکن کیونکہ ابھی تک غیر جمہوری انداز میں چلایا جا رہا ہے اس لیے ملک میں رونما ہونے والی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں سے آنکھیں چرا لینا نہایت آسان ہے۔ اقتصادی اصلاحات کی پہلی دہائی، 1979ء سے 1989ء، میں اختلاف رائے میں تیزی سامنے آئی۔ ''دیوار جمہوریت'' نامی تحریک، جس کا آغاز بیجنگ سے ہوا، بیس سے زائد شہروں میں پھیل گئی اور زمانہ عروج میں چالیس سے زائد کتابیں چھاپ کر عوام میں تقسیم کر دیں۔ نومبر 1987ء میں کمیونسٹ پارٹی کے سربراہ ژاؤ ژیانگ نے سیاسی حزب اختلاف کو قومی دھارے میں شامل کرنے کی کوشش بھی کی اور 13 جماعتی کانگریس میں مشہور رپورٹ میں کہا کہ کانگریس کا بنیادی مقصد ملک میں معاشی اور سیاسی اصلاحات کی رفتار کو تیز کرنا اور سماج کی ہر سطح تک لے جانا ہے۔ انہوں نے ان الفاظ میں کانگریس کا نصب العین بیان کیا: ''چین کو ایک مضبوط، مستحکم، جمہوری، ثقافتی حوالے سے ترقی یافتہ اور جدید سوشلسٹ ریاست بنانا۔'' انہوں نے کہا کہ مختلف لوگوں کے مختلف نظریات ہیں اس لیے ان کو بھی ضرورت ہے کہ کسی نہ کسی موقعہ یا راستے سے تبادلہ خیالات کریں۔

1980ء کی دہائی کے آخر تک معاشی اور سیاسی تحفظات تیزی سے پھیل رہے تھے۔ کچھ بدانتظامی اور کچھ کرپشن کی وجہ سے معیشت قابو سے باہر ہوگئی اور 1988ء میں افراط زر کی شرح 8 فیصد سے بڑھ کر 18 فیصد ہوگئی۔ سیاسی حوالے سے حکومت پر تنقید میں شدت آ گئی اور یہ وسیع پیمانے پر پھیل گئی، حتیٰ کہ تاجر رہنماؤں نے احتجاج کرنے والوں کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ اپریل 1989ء میں حزب اختلاف کی تحریک کا قائد ہو یاؤ بانگ فوت ہوا تو اس کی موت سے جلسے جلوسوں اور دھرنوں کا ایک سلسلہ پھوٹ پڑا۔ دو ماہ بعد اس کا اختتام تیانمن سکوائر میں ہوا جب چینی فوجوں نے ٹینکوں، گولیوں اور آنسو گیس کی مدد سے مظاہرین کو منتشر کیا۔ وہ سیاسی گنجائشیں جن کی ہوزاہو تعریف کرتے تھے ختم کر دی گئیں اور زاہو کو سربراہی سے ہٹا دیا گیا۔

معاشی اصلاحات معقول وقفے کے بعد دوبارہ جاری رہیں۔ 1990ء اور 1991ء میں شنگھائی اور شینزن میں سٹاک مارکیٹیں قائم کی گئیں۔ شرح تبادلہ بین الاقوامی منڈی کے دباؤ سے زیادہ سے زیادہ متاثر ہونے لگا۔ بیرونی سرمایہ کاری کے قوانین زیادہ لچک دار بنائے گئے جس سے رقوم کا سیلاب آ گیا۔ 1992ء میں چین کے اعلیٰ ترین رہنما ڈنگ ژاؤ پنگ نے گوان جو اور شینزن کے ساحلی علاقوں کا دورہ کیا اور ان کی آزاد تجارتی پالیسیوں کو بہت سراہا۔ اس وقت سے لے کر معاشی اصلاحات پر تنقید محدود کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن سیاسی منظر نامے پر بہت کم تبدیلی آئی، اگرچہ حکومت نے بے دھڑک سماج کے نئے کاروباری طبقے کو سراہا اور اس کی خدمات کا اعتراف بھی کیا ہے۔ اس نے سماجی، معاشی، ثقافتی، شہری اور سیاسی حقوق کے حوالے سے بین الاقوامی معاہدات بھی کئے ہیں۔ لیکن یہ سب کاغذی وعدے ثابت ہوئے۔ لیکن جیسے ہیلسنکی فائنل ایکٹ نے سوویت یونین پر کچھ دباؤ ڈالا تھا یہ معاہدات بھی چینی حکومت کے رویوں پر بعض قدغنیں لگائیں گے۔

اگرچہ حالیہ عرصے میں چین میں سیاسی تحفظات خاموش ہیں لیکن ماہرین کا خیال ہے کہ یہ آئینی اور انتظامی شعبوں میں ظاہر ہونے کے لیے راستے تلاش کر رہے ہیں۔ مشرقی ایشیا کی طرح یہاں بھی معیشت کو جدید خطوط پر استوار کرنے کی حکومتی خواہش نے ناپسندیدہ اثرات بھی چھوڑے ہیں۔ مثلاً عالمی تجارتی تنظیم کے ساتھ وعدوں پر عمل درآمد کے لئے چین میں اپنے قانون میں وسیع تبدیلیاں کیں اور معاشی اور سول حقوق کو مضبوط بنایا۔ چینی شہری

حکومت پر مقدمے کر رہے ہیں ریکارڈ تعداد میں جیت رہے ہیں(90,557مقدمے 1997ء میں اسکے مقابلے میں1984ء میں کوئی نہیں)۔چینی قانون پر ہارورڈ یونیورسٹی کا ماہر، ولیم ایلفیر ڈ،جس نے چین کے سیاسی نظام کو ہمیشہ شک کی نگاہ سے ہی دیکھا ہے، قانونی اصلاات کے ان لاشعوری ناپسندیدہ اثرات کی وضاحت کرتا ہے:

''حکومت نے اپنے قوانین کے ذریعے ایسے قانونی، اخلاقی اور سیاسی زبان مہیا کر دی ہے جسے وہ لوگ استعمال کر سکتے ہیں جو اسکی شامت لانے کا بہانہ ڈھونڈتے ہیں، بلکہ انکو بھی ایک پلیٹ فارم مہیا کرتا ہے جو اپنے تحفظات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔بلند ترین مقاصد کو قانونی حیثیت دینے کے لئے حکومت نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے مخالفین کو ایسا تیز دھار آلہ تھما دیا ہے جسے وہ، بہت ہی مختلف مفاد کیلئے استعمال کر سکتے ہیں۔''

چینی حکومت کا سب سے بڑا مخالف ثو وینلی اس تجزیے سے اتفاق کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اب چینی حزب اختلاف کی تحریک ''کھلی اور چینی آئین کے مطابق ہونی چاہیے۔''

چین میں مخالفت کی بات کی جائے تو یہ سمجھنا آسان ہے کہ زیادہ جمہوریت کا مطلب ہوگا زیادہ شہری آزادی۔ تاہم، قلیل مدت کیلئے اس کا الٹ درست ہے۔ بہت سے اہم معاملات پر چینی حکومت اپنی عوام سے زیادہ آزاد خیال ثابت ہوئی ہے۔جب بیجنگ نے مارچ2001ء میں اس کی حدود میں پرواز کرتے ہوئے امریکی حملہ آور طیارے کو زمین پر اتارلیا تو امریکی اس پر بہت تلملائے کہ چین مذاکرات میں ڈھیروں ڈھیر مطالبات کر رہا تھا۔ لیکن چینی عوام کی رائے تھی حکومت نے اس مسئلے پر انتہائی نرم رویہ اختیار کیا ہے۔اسی طرح مختلف مسائل ،امن و امان سے لے کر تائیوان، جاپان اور امریکہ سے معاملات تک بیجنگ اپنے عوام سے زیادہ عوامی،قوم پرست، جارحانہ اور غیر روادار واقع ہوا ہے۔

یقیناً چین میں عوامی رائے عامہ کا جائزہ لینا مشکل ہے۔آپ کو یا تو ان سروے کا سہارا لینا ہوگا جنکی حکومت اجازت دیتی ہے یا انٹرنیٹ کے چیٹ رومز یا دوسرے ممالک کی بہترین صحافت کا یا اس قسم کے کسی اور اشاریوں پر ہی اعتماد کرنا ہوگا۔لیکن یہ یقینی امر ہے کہ سب ایک ہی طرف اشارہ کرتے ہیں۔اس حوالے سے چین تاریخی نمونے پر چل رہا ہے۔ جرمنی، آسٹریا۔ہنگری اور تاخیر سے جدیدیت اپنانے والی ریاستیں بھی انیسویں صدی کے

آغاز پر، چین کی طرح ،حکومتوں، جو کافی حد تک آزاد خیال نہیں اپناتی ،اورعوامی تحریکوں، جوانتہائی قوم پرست، فاشسٹ، کمیونسٹ۔۔اور آخر کار غیر آزاد خیال۔۔۔ کے جال میں الجھی ہوئی تھیں۔اس کا مطلب ہے کہ چین کی موجودہ حکومت نہ تو اختلاف رائے کو بزور دبانا چاہیے اور نہ سیاسی اصلاحات کے عمل کو آہستہ کرنا چاہیے۔اس کے برعکس قانونی، سماجی اور سیاسی اصلاحات ہی چینی رہنماؤں کو سنگین داخلی حالات کا مقابلہ کرنے کے قابل بنائیں گی۔اگر وہ آزاد خیالی کو احتیاط اور آہستہ آہستہ آگے بڑھائیں تو بہت بہتر ہوگا۔

چین کی کمیونسٹ پارٹی کے کرتا دھرتا۔۔۔ اپنے بیشتر وتمام جدت پذیر امراء کی طرح۔۔ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بھی سیاسی اختیار کو کھوئے بغیر معاشی آزاد خیالی حاصل کرلیں گے۔ان کے آئیڈیل سنگا پور کے سابق وزیر اعظم لی کو ان یو ان ہیں۔ لی وہ کچھ حاصل کیا جس کا ہر بااختیار انسان خواب دیکھتا ہے: اپنے ملک کی معیشت، حتیٰ کہ سماج کو بھی، جدید کریں لیکن سیاست کو نہیں۔دنیا کے تمام آزاد خیال آٹوکریٹ یہ سمجھتے ہیں کہ لی کی طرح وہ بھی جدیدیت حاصل کرلیں گے اور جمہوریت کو موخر کردیں گے......لیکن نہیں کر پاتے۔

تیل کی دولت سے مالا مال خلیجی ریاستوں کے علاوہ سنگا پور واحد ملک ہے جس کی فی کس قومی آمدنی 10 ہزار ڈالر سے زائد ہے اور جمہوریہ بھی نہیں ہے(ٹھیک قومی آمدنی26,500ڈالر ہے)۔ یہ بڑے بڑے ہمسایوں میں گھری چھوٹی سی شہری ریاست لیکن اس کے سیاسی رہنما بہت چالاک ہیں۔یقیناً یہ حکومت اپنی مثال آپ ہے لیکن یہ انداز دیرپا نہیں ہوگا۔سنگا پور میں آئینی آزاد خیالی کی روایات پہلے ہی بہت مضبوط ہیں۔معیشت آزاد ہے اور جائیداد، مذہب اور نقل وحمل کے حقوق کا سختی سے احترام کیا جاتا ہے۔ یہ ریاست دنیا کے لیے پر اسرار علاقہ نہیں۔(حتیٰ کہ باہر کے چند اخباروں پر پابندی جیسی بیہودہ حرکت بھی ماضی کا حصہ بن گئی ہے کیونکہ لوگوں کو انٹرنیٹ تک بے روک ٹوک رسائی ہے۔)اس کے شہری تعلیم یافتہ ،مختلف النسل اور باقی دنیا سے باخبر ہیں۔ ورلڈ اکنامک فورم اور دوسرے آزاد ادارے سنگاپور کو معاشی لحاظ سے دنیا کا آزادترین ملک قرار دیتے رہے ہیں جس کا انتظامی ڈھانچہ بھی بہت شفاف ہے۔لیکن اس میں صحافت بہت پابند ہے،اور سیاسی اختلاف رائے اس سے محدود ہے اور آزاد انتخابات کا کوئی وجود نہیں۔ ہر شخص جو سنگا پور گیا ہے یہی کہے گا کہ یہ بدل رہا ہے۔ سنگاپور کی نئی نسل بند سیاسی نظام کو قبول کرنے پر

زیادہ تیار نہیں جب کہ پہلی نسل نے جان لیا ہے کہ بالآخر نظام ایک دن کھل جائے گا۔ اگر لی کے جانشین آئندہ پندرہ برسوں میں اپنے بل پر ملک کو جمہوریانے میں کامیاب ہو گئے تو ان کے پاس اپنی سیاسی ساکھ قائم رکھنے کا موقع ہوگا۔ یہ طے ہے کہ آئندہ نسل تک سنگاپور، جیسے تیسے، ایک مکمل فعال آزاد خیال ریاست ہوگا۔

یورپ میں بیشتر آزاد آٹو کریٹ کا انجام بہت برا ہوا ہے۔ کسی جنگ میں شکست کے بعد یا کسی بحران کے نتیجے میں ---اور بعض اوقات دونوں--- کے سبب انہیں یا تو جلاوطن کر دیا جاتا ہے یا قتل ہو جاتے ہیں۔ جنگیں اور معاشی بحران، عموماً، ایک فائدہ دیتے ہیں: پرانی حکومتوں سے جان چھوٹ جاتی ہے۔ پہلی جنگ عظیم نے یورپ کی متعدد بادشاہتوں کا خاتمہ کیا: دوسری عالمی جنگ کو فاشسٹوں نے تقسیم کر دیا۔ مشرقی ایشیا میں یہ عمل زیادہ مہربان ثابت ہوا ہے، معاشی بحرانوں نے وہی کردار ادا کیا ہے جو جنگ نے یورپ میں کیا۔ 1980ء کی دہائی کے وسط میں ہلکے سے معاشی بحران نے جنوبی کوریا کی فوجی حکومت کو ایسا زخم دیا جو پھر کبھی بھر نہیں پایا۔ انڈونیشیا کے صدر سوہارتو اور تھائی لینڈ کا حکمران طبقہ بھی 1998ء کے ایشیا کے اقتصادی بحران کی نذر ہو گئے۔ اگر چین بھی وسیع پیمانے کے معاشی انتشار کا شکار ہوا تو کمیونسٹ پارٹی کی حکومت پر سوالیہ نشان لگ سکتا ہے۔ آج کی دنیا میں جدت پسند آٹو کریٹ کا کردار بائبلی نوعیت کا ہے: موسیٰ کی طرح وہ اپنی قوم کو آگے تو لے جا سکتا ہے مگر ارضِ موعود تک نہیں لے جا سکتے۔

چین کمیونسٹوں کو اپنے مارکس پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ کارل مارکس یہ سمجھ گیا تھا کہ کوئی ملک معیشت کو جدید کرے، سرمایہ داری اپنائے اور بورژوا طبقہ کو جنم دے تو سیاسی نظام، ان تبدیلیوں کی عکاسی کے لئے، تبدیل ہوگا۔ مارکسی فلسفے کے مطابق ''بنیادوں'' میں تبدیلی ''پورے ڈھانچے'' میں تبدیلی لائے گی۔ حکمرانوں کا ارادہ کچھ بھی ہو، چین ایک ایسے سفر پر نکل پڑا ہے جس کا انجام جمہوریت ہوگی یا انتشار۔ ان میں سے کیا ہوگا، اس کا انحصار بیجنگ پر ہے۔ کیا یہ نئے زمینی حقائق کو قبول کر کے مشرقی ایشیا کے دوسرے آٹو کریٹس کی طرح، معاشی آزاد خیالی کی اجازت دے گا جس کا اختتام سیاسی آزاد خیالی پر ہو؟ یا پھر حکومت کی لگام اپنے ہاتھ میں رکھنے کے لیے آخری دم تک لڑے گا؟ یہ کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ ایشیا — حقیقت میں تو ساری دنیا— میں امن اور آزادی کا انحصار اسی ایک فیصلے پر ہے۔

<u>تیسرا باب</u>

غیر آزاد خیال جمہوریت

ایک منظر سوویت اشتراکیت کی موت کی داستان سناتا ہے وہ ٹینک پر بیٹھے ہوئے بورس نیلسن کی تصویر ہے۔1991ء کے اگست کی 19 تاریخ تھی۔اس صبح پولٹ بورو کے ایک حلقے نے سوویت یونین میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا۔خود ساختہ کمیٹی نے کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری جنرل میخائل گوربا چوف کو گھر میں نظر بند کر دیا گلیوں میں امن وامان قائم رکھنے کے لیے فوج تعینات کر دی اور گوربا چوف کی لبرل اصلاحات سے واپسی کا اعلان کر دیا۔ان حالات میں کمیٹی سوویت یونین پر دوبارہ آمریت مسلط کرنے میں کامیاب ہوسکتی تھی۔ مگر یلسن نے، حال ہی میں بھاری اکثریت سے روس کا صدر منتخب ہو کر، جوابی حملہ کر دیا ہے۔ اس نے فوجی کاروائی کو مسترد کرتے ہوئے روسی عوام سے احتجاج کرنے اور فوجی جوانوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے افسران کا حکم ماننے سے انکار کر دیں۔غیر معمولی جرات اور سیاسی تماشہ گیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے یلسن ان فوجوں کے پاس آیا جو سنگِ مرمر میں ملبوس روسی پارلیمنٹ ۔۔۔روس کا وہائٹ ہاؤس۔۔ کا کئے ہوئے تھے ،ایک ٹینک پر بیٹھا اور ششدر عملے کو دیکھ کر ہاتھ ہلا کر ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔ باقی سب ،واقعتاً،تاریخ ہے۔

یہ روس کی تاریخ کا عظیم لمحہ تھا۔جمہوری فتح کے نقطہء عروج پر بھی صاحبِ نظر روس کے جمہوری المیہ کو آتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ اس ٹینک کے چبوترے پر بیٹھ کر یلسن نے وہ اعلانات اور صدارتی حکم نامے پڑھے جو اس کے آٹھ سالہ دور حکومت کا امتیاز قرار پاتا تھے۔ اگست 1991ء (اور پھر 1993ء میں جب اس نے قانون ساز ادارے کو تحلیل کر کے نیا آئین متعارف کرایا) یلسن کمیونسٹ راہزنوں کے خلاف ننھی منی جمہوریت کی حفاظت میں

مصروف تھا۔لیکن صدارتی حکم نامے کے ذریعے حکومت کا عمومی معیار بن گیا تھا۔ جب کبھی مشکل صورتحال آتی وہ اپنے حامیوں کو متحرک کر کے سیاسی حل تلاش نہ کرتا اور نہ ہی کسی سمجھوتے پر تیار ہوتا۔ اس کے بجائے وہ اختیارات اور اپنی عوامی مقبولیت کو استعمال کرتے ہوئے فوراً صدارتی حکمنامہ جاری کرتا، جو بعض اوقات مشکوک قانونی حیثیت رکھتا تھا، اور سیاست میں لین دین کے عمومی اصول کو پسِ پشت ڈال دیتا۔ جب بلدیاتی حکومتوں نے اس کے خلاف احتجاج شروع کیا تو اس نے سارے نظام کو منتشر کر دیا۔ گورنروں نے اس کی حکم عدولی کی تو گولی سے اڑا دیا۔ روس کی آئینی عدالت نے یلسن کے ایک حکم نامہ کو کالعدم قرار دیا تو اسنے عدالتی حکم پر عملدرآمد سے انکار کر دیا اور جج کی تنخواہ روک کر اسے استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا۔ یلسن کے دل میں اپنے عہدے کے علاوہ ملک کے کسی ادارے کا احترام بہت کم تھا۔ اس نے ہر موقعہ پر قانون ساز اداروں اور عدالتوں کو کمزور کیا۔ اس نے چیچنیا جنگ مسلط کر دی اور اسکی کڑی نگرانی تو دور کی بات مشاورت کے معمول کے انداز کو بھی پس پشت ڈال دیا۔ اپنے عہدے کے آخری مہینوں میں یلسن نے وہ کیا جسے مورخ رچرڈ پائپس (جو اس کا پکا حمایتی تھا) فوجی کارروائی کہتا ہے: وہ اعلان کردہ صدارتی انتخابات سے چھ ماہ قبل مستعفیٰ ہو گیا اور اپنے وزیراعظم ولادی میر پیوٹن کو قائم مقام صدر نامزد کر دیا۔ اس صورتحال نے آنے والے انتخابات کی حیثیت مشکوک کر دی اور یہ حقیقی مقابلے کی بجائے محض تائید بن کر رہ گئے۔ پیوٹن نے صاحبِ اقتدار کی حیثیت اور سربراہِ ریاست کے پورے جاہ و جلال (اور حکمران بھی وہ جو ایک جنگ میں مصروف تھا) کے ساتھ انتخابات میں حصہ لیا۔

اپنے عہد حکومت کے اختتام تک یلسن کو ملک کے اندر اور بیرونی دنیا میں ماضی کا حصہ سمجھا جانے لگا تھا۔ بڑھاپے، بیماری اور نشے میں دھت وہ ایک سیاسی متحجر نظر آتا تھا۔ لیکن دراصل، یہ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ یلسن کو کبھی مستقبل کے پیشن بین کی حیثیت حاصل تھی، ایک ایسے سیاسی رہنما جو تیزی سے عوام میں مقبول ہو رہا تھا؛ عوامی آٹوکریٹ۔ کمیونزم کے خاتمے کے بعد سے ساری دنیا کے ممالک روسی طرز کی حکومتوں کے زیرِ نگیں ہیں جن میں انتخابات اور آمریت کا ملغوبہ تیار کیا جاتا ہے۔۔۔ غیر آزاد خیال جمہوریتیں۔

روس کی مراجعت

روس اور چین دنیا کی دو اہم ترین ریاستیں ہیں جو آزاد خیال جمہوریتیں نہیں ہیں۔ ایسے سیاسی اور اقتصادی نظام کی تلاش، جو ان کے کارآمد ہو، نے بے پناہ عالمی اثرات مرتب کیے ہیں۔ اگر یہ دونوں مغربی طرز کی آزاد خیال جمہوریتیں بن جاتے تو دنیا کی تمام بڑی طاقتوں میں مستحکم اور منتخب حکومتیں قائم ہوتیں اور وہاں قانون کی حاکمیت قائم ہوتی۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ دنیا میں امن کی حکمرانی ہو جاتی اور عالمی دشمنیاں ختم ہو جاتیں۔ لیکن یہ ایک مختلف اور زیادہ مہربان دنیا ضرور بن جاتی۔ آج دونوں ممالک کم وبیش مختلف راستوں پر چل نکلے ہیں۔ چین نے اقتصادی اصلاحات لائیں ہیں اور دھیرے دھیرے اپنے قانون اور انتظامیہ کے دوسرے پہلوؤں کو بھی درست کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، لیکن جمہوریت سامنے لانے کیلئے چند ایک اقدامات ہی کیے گئے ہیں۔ اس کے برعکس روس نے سب سے پہلے سیاسی اصلاحات پر ہاتھ ڈالا ہے۔ حتیٰ کہ گورباچوف کے دور میں بھی سیاسی آزادی اور اقتصادی اصلاحات کا وجود تھا۔ اشتراکیت کے بعد روس نے اس امید پر تیزی سے آزاد اور منصفانہ انتخابات کی طرف قدم بڑھائے کہ ان سے مغربی طرز کی جمہوریت قائم ہو جائے گی۔ عشرہ 1990ء کے آغاز میں اسی آس میں اقتصادی اصلاحات کا ایک سیلاب برپا لایا گیا لیکن پیشتر اقدامات کارآمد نہ ہوئے۔ سادہ الفاظ میں، چین سیاست سے قبل اپنی معیشت کو درست کر رہا ہے جب کہ روس مخالف راستے پر چل پڑا۔

آج روس چین سے زیادہ آزاد ملک ہے۔ اسمیں انفرادی حقوق اور پریس کی آزادی کا نسبتاً زیادہ احترام کیا جاتا ہے اور معیشت بھی چین کی نسبت مسابقت اور بیرونی سرمایہ کاری کی زد میں ہیں۔ دوسری طرف چین آج بھی کمیونسٹ پارٹی نے زیر نگیں ایک بند ریاست ہے، لیکن دھیرے دھیرے متعدد پہلوؤں پر آزاد خیال ہو رہا ہے، جن میں معاشی اور قانونی حوالے سے۔ آزاد خیال جمہوریت کے لئے کس کی حکمت عملی بالآخر کامیاب ہو گی؟ اگر اقتصادی ترقی اور متوسط طبقہ جمہوریت کی زندگی کے لیے ضروری ہیں تو چین درست سمت میں جا رہا ہے۔ اس کی معیشت نے گزشتہ 25 برس میں حیران کن ترقی کی ہے۔ روس کی مجموعی قومی پیداوار، اس کے برعکس، 1991ء سے 40 فیصد پر گھٹ گئی ہے اور

گزشتہ چند برس سے ہی بہتر ہوئی ہے --- وہ بھی تیل کی قیمتوں میں اضافے کی مرہون منت۔ اگر چین اسی راستے پر آگے بڑھے اور ترقی کرے، اگر قانون کی حاکمیت قائم کرے، اگر بورژوا طبقہ جنم دے اور پھر اپنی سیاست کو آزاد کرے --- اور یہ بہت بڑے اگر ہیں --- یہ حقیقی جمہوریت کے حصول میں غیر معمولی کامیابیاں حاصل کر سکتا ہے۔

اگر اور روس اپنا یہ سفر جاری رکھے --- اور یہ بھی بہت بڑا اگر ہے --- منتخب اشرافیہ کی طرف سفر، شہری آزادیوں کا تحفظ کاغذوں میں تو ہو لیکن عملاً غیر موجود ہو، سیاست و اقتصادیات کا ہر شعبہ کرپشن سے بھر ہو، تو یہ بخوبی جمہوری غیر آزاد خیال رہ سکتا ہے۔ یہ 1960ء اور 70 کے لاطینی امریکہ کی ریاستوں کے مشابہہ بھی ہو سکتا تھا: نیم سرمایہ داری، سماج کا نظام چلانے کے لئے اسکے اعلیٰ طبقہ کا آپسی اتحاد۔ لاطینی امریکہ میں یہ اتحاد بڑے بڑے کاروباری افراد اور فوج میں تھا؛ جبکہ روس میں امراء اور سابقہ کمیونسٹ رہنماؤں میں ہے۔ سابق سوویت یونین کے بیشتر حصہ پر ہمیں اسی قسم کی ریاستوں کا غلبہ نظر آتا ہے --- مشرقِ وسطیٰ، بیلارس، یوکرائن --- لیکن تین بالٹک ریاستوں کا اخراج گیر غیر معمولی چیز ہے۔

روسی طریقہ کار نے، ارادتاً یا غیر ارادی طور پر، وہ دو اہم سبق نہیں سیکھے جو جمہوریا نے کے تاریخی سفر سے ہم حاصل کر سکتے ہیں: حقیقی اقتصادی ترقی پر اصرار اور مؤثر سیاسی اداروں کا قیام۔ ماسکو دونوں محاذوں پر ناکام رہا ہے۔

روس کا بنیادی مسئلہ یہ نہیں کہ غریب ہے اور جدیدیت کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے بلکہ یہ امیر ہے اور جدید ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ سوویت دور میں سکول میں بچوں کو پڑھایا جاتا تھا کہ وہ دنیا کے امیر ترین ملک میں رہتے ہیں۔ اس حوالے سے کمیونسٹ پروپیگنڈہ بالکل درست تھا۔ اگر قدرتی وسائل کو امارت کا معیار تسلیم کیا جائے تو غالباً روس ساری دنیا میں سر فہرست ہوگا، اسکے پاس تیل، قدرتی گیس، ہیروں، تانبے اور دوسری معدنیات کے وسیع ذخائر ہیں۔ شاید انہی وسائل نے سوویت یونین کی عمر ایک نسل تک بڑھا دی۔ انہوں نے غیر فعال ریاست کے قیام میں بھی اپنا حصہ ڈالا۔

سوویت اشتراکیت کے دور میں ریاست کو محصولات کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ ساری معیشت ہی اس کے ہاتھ میں تھی۔ 1970ء کی دہائی لگ بھگ تک صنعت کا بڑا حصہ بالکل

بیکار سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ مصنوعات ''منفی قدر'' رکھتی تھیں: یعنی مکمل مصنوعات کی بجائے ان کے خام مال کی قدر زیادہ تھی۔ سوویت ریاست فنڈز کے لیے کلی طور پر قدرتی وسائل کے محصولات پر انحصار کرتی تھی۔ پس، جنوبی کوریا اور تائیوان کی آمریتوں کے برعکس، اس نے معاشی نشوونما کے لیے کسی قسم کے قواعد وضوابط یا پالیسیاں نہیں اپنائیں۔ امیر اور مشکوک جواز والی حکومتیں اکثر سہولتوں کی شکل میں اکثر اپنے شہریوں کو رشوت دیتی ہیں مبادا کہ وہ بغاوت پر نہ اتر آئیں (جیسا سعودی عرب)۔ اسکے برعکس سوویت یونین نے انہیں دہشت زدہ کرنے کی پالیسی اپنائی۔ ماسکو اپنے وسائل عوام تک پہنچانے پر راضی نہ تھا، کیونکہ ان وسائل کے لئے کئی بڑے مقاصد اس کے پیش نظر تھے، مثلاً ایک بڑے دفاعی نظام کا قیام اور تیسری دنیا میں اپنے ایجنٹوں کے ہاتھ مضبوط کرنا۔ سوویت اشتراکیت کے خاتمے پر گورباچوف کے جانشینوں کو اس قدر مضبوط ریاست تو ورثے میں ملی جو عوام کو دہشت زدہ کر سکتی مگر اس قدر نہیں جدید معیشت کو سنبھالنے کی اہلیت رکھے۔

بدقسمتی سے یلسن نے روس کی سیاسی ترقی میں رکاوٹوں میں مزید اضافہ کیا۔ اس کے حامی بجا طور پر اس کی عامرانہ سرگرمیوں کا یہ کہہ کر دفاع کرتے ہیں کہ صدر غیر جمہوری قوتوں کا مقابلہ کر رہا تھے۔ لیکن نئے سیاسی منظر نامے کے بانی کو تخریب کے بعد زیادہ قوت سے تعمیر بھی کرنی چاہیئے۔ جواہر لال نہرو نے برطانیہ کی نو آبادیاتی حاکمیت کے خلاف جدوجہد میں تیرہ برس جیل میں گزارے لیکن آزاد ہندوستان کا وزیراعظم بننے کے بعد کہیں زیادہ عرصہ برطانوی اداروں کی حفاظت میں صرف کیا۔ نیلسن منڈیلا نے استحصال کرنے والوں کے خلاف پرتشدد احتجاج کی توثیق کی لیکن اقتدار میں آیا تو جنوبی افریقہ کو کثیر النسلی اور پرامن ریاست بنانے کے لیے انہی سفید فاموں کے پاس بھی گیا۔

لیکن نہرو اور منڈیلا کے برعکس یلسن نے روس میں سیاسی اداروں کے قیام کیلئے بہت کم کام کیا۔ دراصل اس نے تمام حریف اداروں کو کمزور کرنے میں بہت سرگرمی دکھائی۔۔ قانون ساز اسمبلی، عدالتیں اور مقامی گورنر وغیرہ۔ 1993ء میں جو آئین یلسن نے روس کو دیا وہ اس سے تباہ کن تھا؛ کمزور اسمبلی، محتاج عدلیہ اور بے قابو صدارت۔ اس سے بھی مایوس کن پہلو یہ ہے کہ نیلسن نے کسی سیاسی پارٹی کی بنیاد نہیں رکھی۔ وہ با آسانی ایسا کر سکتا تھا، روس کے تمام اصلاح پسندانہ حلقوں کو اکٹھا کر دیتا۔ باقی تمام اقدامات کے مقابلے میں

یہی کام روس میں جمہوریت کو جڑیں پکڑتے رہنے کی ضمانت دے سکتا تھا۔لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ دیکھنے میں تو یہ چھوٹی سی بات ہے مگر سیاسی جماعتیں ہی وہ نظام ہیں جن کے ذریعے جدید سماج میں عوام اپنی سیاسی اور اخلاقی اقدار کا اظہار کرتے، انہیں ریاستی اداروں میں جگہ دلاتے ہیں۔ امریکی جمہوریت کے مورخ کلنٹن روزیٹر نے کہا تھا: ''جمہوریت کے بغیر امریکہ نہیں، سیاست کے بغیر جمہوریت نہیں اور جماعتوں کے بغیر سیاست نہیں۔'' اس کی بات ہر جگہ درست ہے۔ پارٹیوں کے بغیر سیاست افراد، مفاداتی گروپوں اور طاقتور لوگوں کا کھیل بن جاتی ہے۔ آج کی روسی جمہوریت پر یہ بات بالکل درست ترجمانی ہے۔

پیوٹن نے یلسن کی سب سے بڑی یادگار کو مضبوط کیا جو آزاد خیال اصلاحات نہیں مطلق العنان صدارت تھی۔ اقتدار کے پہلے سال میں پیوٹن نے باقی روس کی حکومت کو مختصر کر دیا۔ صوبائی گورنر اس کا بڑا ہدف تھے جنکو اس نے سات ''سینئر گورنرز''، جن کی ذمہ داری 89 صوبوں کی دیکھ بھال تھا، کے ماتحت دیکر بہت مہارت کے ساتھ غیر موثر کر دیا اور ان گورنروں کو پارلیمنٹ سے نکال باہر کیا جہاں ایوان بالا میں ان کی نشستیں تھیں۔ ان جگہ کریملن کے منتخب کردہ قانون ساز اراکین مقرر کیے گئے۔ مزید برآں، اگر صدر کو کسی گورنر کے خلاف حکم عدولی کا شک ہو جائے تو فوراً گولی بھی ماری جا سکتی ہے۔ پیوٹن نے ڈوما کو ایسی قانون سازی پر بھی راضی کر لیا جس کے تحت صوبوں کو دی جانے والی ٹیکس کی آمدنی میں کمی کر دی گئی۔ میڈیا اور روس کے بدنام امراء پیوٹن کے دوسرے ہدف رہے ہیں جنہیں چھاپوں، گرفتاریوں اور جیلوں سے خوفزدہ کر دیا ہے۔ خوفزدہ کرنے کی حد تک ان کارروائیوں نے اپنا کام کر دکھایا۔ روس میں پریس برائے نام ہی آزاد رہا ہے۔ اپریل 2000ء میں کریملن کے اتحادی گروپ نے این ٹی وی کا اختیار سنبھال لیا، جو روس کا آخری پرائیویٹ چینل تھا، اور بیشتر اعلیٰ افسران کو گولیاں مار دیں گئیں۔ این ٹی وی پر قبضے پر احتجاجاً مستعفیٰ ہونے والے صحافیوں نے ایک دوسرے ٹی وی چینل میں ملازمت کی جو این ٹی وی کے مالک ولادی میر گوزنسکی نے شروع کیا تھا، تو ادارے کے مالک کو ٹیکس حکام نے دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔ پرنٹ میڈیا برائے نام آزاد ہے لیکن تمام معاملات میں حکومت کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے(1)۔

ان تمام کارروائیوں میں پیوٹن اپنے منتخب کرنے والوں کی خواہشات ہی پوری کر رہا

ہے۔2000ء میں پبلک اوپینین فنڈ کی طرف سے منعقد کردہ ریفرنڈم میں 57 فیصد روسی عوام نے میڈیا پر سنسر پالیسیوں کی تائید کی۔ اس سے بھی زیادہ تعداد نے امراء کے خلاف کارروائیوں کی حمایت کی جن میں سے بیشتر قابل ذکر افراد تھے۔ روس کے سیٹھوں نے اپنی دولت ناجائز ذریعے سے اکٹھی کی تھی اور اس کے قائم رکھنے کے لیے ان سے بھی زیادہ غلط طریقے استعمال کرتے تھے۔ صوبائی گورنر عموماً مقامی سردار تھے جن میں کرپشن کرنے کی بڑی بھوک تھی۔ لیکن جب پیوٹن نے ان سیاستدانوں اور تاجروں پر خفیہ پولیس کے در کھولے جنہیں وہ پسند نہیں کرتا تھا تو قانون کی حاکمیت کو پس پشت ڈال رہا تھا۔ درمیانے درجے کے ایک سیٹھ، جو قدرے نیک نام تھا، نے مجھے ماسکو میں بتایا، ''ہم سب نے کوئی نہ کوئی قانون توڑا ہے۔ آپ روس میں قانون توڑے بغیر کاروبار نہیں کر سکتے۔ پیوٹن بھی یہ بات جانتا ہے۔ اس لیے صرف یہ کہنا ہے کہ وہ قانون نافذ کروا رہا ہے قطعاً نامعقول ہے۔ وہ سیاسی مقصد کے لیے گنے چنے افراد پر اس کا استعمال کر رہا ہے۔'' قانون کو سیاسی کے لیے استعمال کرنے سے برابری کا تصور باقی نہیں رہتا۔

اہم ترین وہ اثرات ہیں جو اپنے مخالفین کو بزور دبانے کی پیوٹن کی کوششوں کے نتیجے میں پیدا ہوئے۔ کثرتیت کا انحصار قوت کے تمام مراکز کا بیک وقت ایک دوسرے کا مقابلہ کرنا ہے۔ ولادیمیر ریزخوف، پارلیمنٹ میں گنے چنے آزاد خیالوں میں سے ایک، نے روس اور یورپ کے ماضی کا موازنہ کرتے ہوئے کہا: ''ارل اور بیرن جنہوں نے شاہی اقتدار [illegible] جنگ کی خود بمشکل ہی نیک نام تھے لیکن انہوں نے تاج پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ پیوٹن ک[illegible] کی صورت میں ہمارا مسئلہ یہی ہوگا کہ کریملن پر نظر رکھنے والا باقی نہ بچے گ[illegible] نیک نیت زار روس کا سہارا ہی لینا پڑے گا(2)۔'' پیوٹن بھی ایک اچھا[illegible] ایک جدید ملک بنانا چاہتا ہے۔ اس کے خیال میں معیشت کو آز[illegible] امن و امان اور فعال ریاست درکار ہے۔ شاید اس کو یہ یقی[illegible] سیاسی نظام کو جمہوریت میں بدلنے کے لائق ہو جائے گ[illegible] ہوا تو روس کو معمول کا صنعتی ملک بنانے میں [illegible]
''90ء کی دہائی کی [illegible] اشتراکیت کے بعد کا پولینڈ تھا اور اب پنوشے کے زیر نگیں چلی ہے''، ریزخوف کہتا ہے۔ پنوشے قابل عمل ہے کیونکہ بالآخر وہ اپنے ملک

میں آزاد خیال جمہوریت لانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

مگر یہ کہنا روس کے جمہوریانے کے حق میں غیر معمولی دلیل ہے کہ اس نے ایک ایسے لیڈر کا ظہور ممکن بنایا ہے جو حزبِ اختلاف کو روندتا، میڈیا کو اتھل پتھل کرتا، سیاسی جماعتوں پر پابندی لگاتا ہے اور پھر سورمائی انداز سے معیشت کو آزاد کرتا ہے جو بالاخر حقیقی جمہوریت لائیگا۔ اس مفروضہ میں غیر آزاد خیال جمہوریت اچھی ہے، کیونکہ --- اتفاق سے --- اس نے ایک آزاد خیال آٹوکریٹ کو سامنے لایا ہے جو آخر کار اسکے ملک کو آزاد خیال جمہوریت کی طرف لے جاسکتا ہے۔ یہ تو آزاد خیال آٹوکریٹ کے حق میں دلیل ہے نہ کہ جمہوریت کے۔ یقیناً یہ امکان ہمیشہ موجود رہے گا کہ پیوٹن یا اسکا کوئی جانشین بدطنیت زار ثابت ہوگا اور اپنی بے انتہا اختیارات کم نیک مقاصد کے لئے استعمال کرے گا۔ ایسا ماضی میں ہو چکا ہے۔

غلط راستہ

روس کا راستہ جانا پہچانا ہے۔ مغربی اور مشرقی ایشیائی راستے کے برعکس گزشتہ دو دہائیوں میں افریقہ اور ایشیا اور لاطینی امریکہ کے بعض حصوں میں، آمریتوں جن کی آئینی آزاد خیالی یا سرمایہ داری کی تاریخ بہت مختصر ہے بھی گزشتہ دس برسوں میں جمہوریت کی طرف بڑھے ہیں۔ یہ نتائج کچھ حوصلہ افزا نہیں رہے۔ مغربی کرہَ، جہاں کیوبا کے علاوہ تقریباً ہر ریاست میں انتخابات ہوئے، 1993ء میں ماہر جمہوریت سٹینفورڈ کے لیری ڈائمنڈ نے تحقیق کے بعد بتایا کہ لاطینی امریکہ کی 22 نمایاں ریاستوں میں سے دس میں ''انسانی حقوق کی صورتحال اس سطح پر ہے کہ (آزاد خیال) جمہوریت کے ساتھ بالکل میل نہیں کھاتی۔'' اس وقت سے لے کر سوائے برازیل جیسی غیر معمولی حوالے کے ہر ریاست میں حالات بد سے بدتر ہی ہوئے ہیں۔

وینزویلا کے ہیگو شاویز کو دیکھئے۔ فوج میں کرنل تھا لیکن 1992ء میں حکومت کا تختہ الٹنے کی ناکام کوشش کے بعد اسے جیل بھیج دیا گیا۔ 6 برس بعد ہی مشتعل عوامی پلیٹ فارم سے صدر منتخب ہوگیا اور 56 فیصد ووٹ لیے۔ اس نے ایک ریفرنڈم تجویز کیا جسے وینزویلا کا آئین تبدیل، قانون ساز ادارے اور عدلیہ کے اختیارات گھٹا اور انتظامیہ کو ''نمائندہ اسمبلی''

کے ماتحت کر دینے تھے۔ ریفرنڈم 92فیصد ووٹوں سے کامیاب رہا۔تین ماہ بعد شاویز کی جماعت نے اسمبلی میں 92فیصد نشستیں جیت لیں۔ نئے مجوزہ آئین نے صدر کی مدت عہدہ ایک برس بڑھا دی،اسے اپنا جانشین مقرر کرنے کا حق دے دیا، قانون ساز ادارے کا ایک ایوان ختم کر دیا،فوج پرسول اختیار گھٹا دیا،معیشت میں حکومتی مداخلت بڑھا دی اور اسمبلی کو ججوں کو گولیوں سے اڑا دینے کا حق دے دیا۔ تجربہ کار قانون ساز اور شاویز کے سابق حامی جورگ اولاویرا نے خبردار کیا،''ہم مکمل تباہی کی طرف جا رہے ہیں۔'''' یہ آئین ہمیں100 برس پیچھے دھکیل دے گا اور فوج سیاست کا آہنی مسلح ہاتھ بن جائے گی (3)۔'' نیا آئین دسمبر 1999ء میں71 فیصد ووٹوں کے ساتھ پاس ہو گیا۔اس حقیقت کے باوجود کہ ونیز ویلا ابتدائی برسوں کے دوران شدید معاشی بحران میں رہا،مگر شاویز عوامی مقبولیت میں 65فیصد سے نیچےنہیں آیا۔

2002ء کی ابتداء میں یوں لگا جیسے اس کی خوش قسمتی ختم ہونے کے قریب ہے۔اسکی کرپٹ حکومت اور معیشت کی ناکامی پر عوام کے عدم اعتماد نے ملکر بڑے پیمانے پر احتجاج کو جنم دیا۔ فوج اور کاروباری حلقوں نے مل کر حکومت کا تختہ الٹنے کا منصوبہ بنایا اور مارچ 2002ء میں شاویز کی حکومت ختم کر دی گئی۔۔۔ لیکن صرف 2دن کیلئے۔شاویز جو عوامی طاقت کو منظم کرنے میں مہارت رکھتا ہے۔۔۔اور بغاوت کی غیر جمہوری ہیت نے بھی اسکی مدد کی۔۔۔ با آسانی ایک ہفتے بعد دوبارہ اقتدار میں آ گیا۔

ونیز ویلا میں غیر فعال جمہوریت کے تمام لوازمات موجود ہیں: قدرتی وسائل کی فراوانی، مشرق وسطیٰ سے باہر تیل کے سب سے بڑے ذخائر سمیت۔اس کا مطلب ہے بد انتظام معیشت، سیاسی بدعنوانی، گلے سڑے ریاستی ادارے۔آج پانچ میں سے چار وینز ویلی غربت کی لکیر سے نیچے زندہ ہیں اس ملک میں جہاں بیس برس قبل لاطینی امریکہ کے بلندترین معیار زندگی کا وجود تھا۔لیکن اسے حاصل کیا ہوا،ایک نیا سورما، ایک مضبوط شخصیت جسنے اپنے ملک کیلئے باقی دنیا سے ٹکر لینے کی جرات کی (اور اس ملک سے عموماً مراد امریکہ ہی لی جاتی ہے)۔اسی لیے شاویز نے فیدل کاسترو، صدام حسین حتیٰ کہ بوڑھے قذافی کی طرف اپنا جھکاؤ ظاہر کیا تھا۔خطرناک پہلو تو یہ ہے کہ شاویز لاطینی امریکہ کی جاری امید کی علامت ہے کہ تعمیری تبدیلی کثرت پسند سیاسی نظام کے ذریعے نہیں آئے گی جس میں مختلف الخیال

سیاسی جماعتیں ایک دوسرے کے ساتھ بتدریج اصلاحات کی چکی میں پسیں، بلکہ کسی نئے مسیحا صفت رہنما کی برکت سے آئے گی جو ماضی کا ملبہ ہٹا کر ایک نیا آغاز کرے۔ خطہء اینڈین میں یہ رجحان گزشتہ چند برس سے پنپ رہا ہے۔ اگر لاطینی امریکہ کی معاشی مصیبتیں قائم رہیں تو یہ زیادہ پھیل بھی سکتی ہیں۔

افریقہ میں گزشتہ دہائی انتہائی مایوس کن رہی ہے۔ 1990ء سے صحارا افریقہ کے اڑتالیس میں سے بیالیس ریاستوں نے کثیر الجماعتی انتخابات کروائے، اس امید پر کہ شاید افریقہ کے ماتھے سے کرپشن کا داغ دھل جائے۔ نیویارک ٹائمز (*New York Times*) نے حال ہی میں افریقہ میں انتخابات کی اس لہر کا موازنہ کمیونزم کے بعد مشرقی یورپ کے عبوری دور سے کیا ہے (4)۔ تاہم، یہ تمثیل بہت گمراہ کن ہے۔ اگرچہ جمہوریت نے افریقی سیاست کے بہت سے گوشے بے نقاب کئے ہیں اور شہریوں کو آزاد کیا ہے، لیکن ایک خاص حد تک انتشار اور عدم استحکام کو بھی جنم دیا ہے جس نے بیشتر ممالک میں کرپشن اور لاقانونیت کو بدترین بنادیا ہے۔ افریقہ پر کام کرنے والے محتاط ترین محقق، مائیکل شیگے نے 90ء کی دہائی میں جمہوریانے کی لہر کا سروے کیا اور یہ نتیجہ نکالا کہ اس براعظم میں ''کثیر الجماعتی انتخابات پر ضرورت سے زور دیا گیا ہے - - - اس سے آزاد خیال انتظامیہ کے اساسی عناصر نظر انداز ہو گئے ہیں (5)۔'' مگران عناصر کا دوبارہ حصول مشکل ہوگا کیونکہ افریقہ کا بیشتر حصہ معاشی اور آئینی حوالے سے ترقی یافتہ نہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ آزاد خیال جمہوریانے والے دو ممالک، جنوبی افریقہ اور بوٹسووانا' کی فی کس آمدنی جمہوریانے کے عبوری دور کی معیاری حد، 3 ہزار ڈالر سے 6 ہزار ڈالر، سے بھی زائد ہے۔ جنوبی افریقہ کی فی کس آمدنی 8 ہزار 5 سو ڈالر جب کہ بوٹسو وانا کی 6 ہزار 6 سو ڈالر: لیکن دونوں اضافے قدرتی وسائل کی آمدنی کے باعث مصنوعی ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ افریقہ اپنے آمروں کے تحت بھی پھل پھول رہا تھا لیکن یہ ضرور پتہ چلتا ہے افریقہ کو فی الحال جمہوریت سے بھی جس چیز درکار ہے وہ (خوش انتظامی) گڈ گورننس ہے۔ اسی براعظم میں کامیابی کی مثالیں بھی ہیں، جیسے موزمبیق جو سولہ سالہ خانہ جنگی کے بعد منڈی کی معیشت کے ساتھ فعال جمہوریت بن چکا ہے۔ لیکن اسے اچھی حکومت کے قیام کے لیے عالمی برادری اور اقوام متحدہ نے بے پناہ مدد فراہم کی، اور ایسا ہونا ہر افریقی ملک میں ممکن نہیں۔

مشرق وسطیٰ میں انتخابات، جب کبھی وہ معقول حد آزاد بھی ہوں، جیسے کہ کرغزستان میں، کے نتیجے میں طاقتور سربراہ، کمزور قانون ساز ادارے اور عدلیہ اور گنی چنی شہری اور معاشی آزادیاں ہی حاصل ہوئی ہیں۔ بعض ممالک میں سرے سے انتخابات ہوئے؛ ان پر مقبول آمر ہی حکومت کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر آذر بائیجان کے غیدار علی یوف سوویت یونین کی انٹیلی جنس بیورو کے جی بی کے سابقہ سربراہ اور پولیٹو بورو کے سابق رکن ہیں۔ انہوں نے1993ء کی فوجی کاروائی میں اپنے پیشرو کا تختہ الٹا، لیکن خطے پر بیشتر سنجیدہ محققین کا خیال ہے کہ اگر آج آزاد اور منصفانہ انتخابات کرائے جائیں تو علی یوف جیت جائیں گے(6)۔ لیکن بعض حالات میں ہیرو بھی رہنما بن جائیں تو کچھ خاص فرق نہیں پڑتا۔ جارجیہ کو ایڈورڈ شیورینڈز چلا رہے ہیں، گورباچوف کے اصلاح پسند وزیر خارجہ تھے جنہوں نے سرد جنگ کے خاتمے میں مدد کی تھی۔ آج بھی شیورینڈز کامیابی کے لیے انتخابات میں دھاندلی کرواتے ہیں (گو کہ وہ منصفانہ طریقہ سے بھی جیت سکتے ہیں)، ایسے ملک کے حکمران ہیں جس میں کرپشن زوروں پر ہے اور شہری آزادیاں خطرے میں ہیں۔

قدرتی طور پر غیر آزاد خیال جمہوریت ایک انداز میں آگے بڑھتی ہے؛ ارجنٹائن معتدل جارحوں سے لیکر کم وبیش استبدادی کازکستان جیسی استحصالی ریاستوں تک اور یوکرائن اور وینیز ویلا جیسے میانہ رو ممالک۔ اس طے شدہ انداز کے ساتھ ساتھ انتخابات شاید ہی اس قدر آزاد اور منصفانہ ہوں جس قدر آج مغرب میں ہیں۔ لیکن یہ سیاست میں عوامی شمولیت اور منتخب افراد کے لیے حمایت کی عکاسی کرتے ہیں۔ جمہوریت اور آمریت کی باہمی آمیزش ممالک کے حوالے سے مختلف ہے--- روس میں انتخابات سب سے زیادہ آزاد ہوتے ہیں--- لیکن سب میں یہ منفی عناصر موجود ہیں۔ اعداد وشمار کا ایک ہی مجموعہ جسمیں تمام ممالک کا جمہوری اور آئینی ریکارڈ دیا جائے، گذشتہ عشروں کے دوران غیر آزاد جمہوریت میں اضافے کی نشاندہی کر دیتا ہے۔ 1990ء میں جمہوریاتے ہوئے 22 فیصد ممالک اس فہرست میں تھے؛ 1992ء میں یہ تعداد 35 فیصد ہوئی؛ 1997ء میں یہ 50 فیصد تھے اور اس وقت سے اس تعداد میں بہت تھوڑی سی کمی آئی ہے۔ اب بھی جمہوریاتے ہوئے دنیا کے نصف سے قریب ممالک غیر آزاد خیال جمہوریتیں ہیں۔

بعض حلقے اب بھی اس عارضی دور اور وہ تکالیف کہتے ہیں جو کم سن جمہوریتوں کو

جھیلنا پڑتی ہیں۔ اکنامسٹ (Economist) کا تجزیہ ہے کہ آئینی آزادخیالی کا ''جمہوریت میں رونما ہونے کا زیادہ امکان ہوتا ہے(7)۔'' لیکن کیا یہ عمومی خیال درست ہے؟ کیا مشرق وسطی اور افریقہ جیسے خطوں میں انتخابات ملک میں سیاسی فضا کو کھولتے ہیں، وسیع تر سیاسی، معاشی اور قانونی اصطلاحات پر مجبور کرتے ہیں؟ یا کیا یہ انتخابات آمریت کو چھپانے کے لئے ایک پردے کا کام کرتے ہیں؟ اگرچہ یہ کہنا قبل از وقت ہے -- کیونکہ متعدد ریاستیں ابھی عبوری دور میں ہیں-- لیکن آثار کچھ حوصلہ افزاء نہیں ہیں۔ بہت سی غیر آزاد خیال جمہوریتیں--- مثلاً وسطی ایشیا کی تقریباً سبھی--- جلد اور مضبوط انداز میں آمریت میں بدل گئی ہیں۔ ان میں انتخابات نے صرف قابضین کو حکومت کرنے کا ایک جواز فراہم کیا ہے۔ دوسری، جیسا کہ افریقہ میں، جمہوریت کی طرف تیز رفتار پیش قدمی نے ریاستی اقتدار کو کمزور، وفاقی حکومت کو علاقائی اور نسلی للکاروں سے نبرد آزما کر دیا ہے۔ وینز ویلا اور پیرو جیسی ریاستوں میں اب بھی خاص سطح تک حقیقی جمہوریت قائم ہے مگر غیر آزاد خیال سرگرمیاں بھی جاری ہیں۔ دوسری طرف کروشیا اور سلواکیہ جیسے ممالک بھی ہیں جہاں غیر آزاد خیال جمہوری نظام آئینی اور اصلاح پسندانہ انداز سے آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ قابل غور ہے کہ کروشیا اور سلواکیہ دونوں یورپی ممالک ہیں اور انکی فی کس آمدنی بھی قدرے زیادہ ہے: 6 ہزار 6 سو اٹھانوے ڈالر اور 9 ہزار 6 سو چوبیس ڈالر بالترتیب۔ عموماً یورپ سے باہر غیر آزاد خیال جمہوریت آزاد خیالی تک پہنچنے کے لیے نتیجہ خیز راستہ ثابت نہیں ہوا۔

پاکستان پر غور کریں۔ اکتوبر 1999ء میں مغربی دنیا اس وقت حیران رہ گئی جب پاکستانی فوج کے سربراہ جنرل پرویز مشرف نے منتخب وزیراعظم نواز شریف کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ باعث حیرت فوج کشی نہیں--- کیونکہ یہ پاکستان کی تاریخ کا چوتھا واقعہ تھا--- بلکہ اس اقدام کی عوامی مقبولیت تھی۔ لوگوں کی اکثریت گیارہ سالہ شرمناک جمہوری دور سے چھٹکارہ پانے پر بہت خوش تھی۔ اس سارے عرصے میں نواز شریف اور ان کی پیشترو بے نظیر بھٹو نے اقتدار کو ذاتی مفادات کے لیے استعمال کیا، عدالتوں کو سیاسی پٹھوؤں سے بھر دیا، بلدیاتی حکومتیں تباہ کر دیں، اسلامی بنیاد پرستوں کو خوفناک قوانین بنانے کی چھوٹ دیدی اور ریاستوں اداروں میں لوٹ مار بھی کی۔ جنوری 1998ء میں پاکستان کے ایک بڑے اخبار نے ملک کی حالت زار کو ان الفاظ میں بیان کیا: ''فاشسٹ جمہوریت: طاقت حاصل کرو،

حزب اختلاف کی دھجیاں بکھیر دو(8)۔'' لیکن مغربی' خصوصاً امریکی اخبارات کا ردعمل بہت مختلف تھا۔ تقریباً تمام حلقوں نے بجا طور پر فوج کشی کی مذمت کی۔2000ء میں اپنی انتخابی مہم کے دوران جارج ڈبلیو بش نے نئے پاکستانی رہنما کے نام سے لاعلمی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ وہ ''خطے میں استحکام لائیں گے۔'' واشنگٹن پوسٹ (*Washington Post*) نے ایک آمر کے متعلق اس قسم کے کافرانہ کلمات کہنے پر شدید تنقید کی۔

دو برس بعد مشرف نے ستمبر گیارہ کے حادثے کو اپنے حق میں استعمال کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے ایسی سیاسی، سماجی، تعلیمی اور معاشی اصلاحات کا آغاز کیا جن اس کے حامیوں کو گمان تک نہ تھا۔ پاکستان کے گنے چنے منتخب سیاستدانوں نے ان کی حمایت کی۔ مشرف محض اس وجہ سے ان پالیسیوں کو جاری رکھنے میں کامیاب رہے ہیں کہ انہیں نہ تو مدت حکومت ختم ہونے کا ڈر ہے اور نہ ہی جاگیرداروں، مجاہدین اور علاقائی سرداروں کے مفادات کی پرواہ ہے۔ اس کی کوئی ضمانت نہیں کہ ایک آمر وہی کرے گا جو مشرف نے کیا۔ لیکن پاکستان کے کسی منتخب سیاستدان نے اس قدر دلیرانہ، فیصلہ کن اور مؤثر انداز سے پیش قدمی نہیں کی۔ یہ سطریں لکھنے تک مشرف پہلے سے زیادہ آمر اور کم آزاد خیال نظر آنے لگے ہیں۔ تاہم وہ اپنے ملک کو جدید اور مذہبی پابندیوں سے آزاد کرنے پر تلے ہیں۔ اگرچہ انہیں پاکستانی سماج کے جاگیردارانہ اور مذہبی حلقوں سے مخالفت کا سامنا ہے۔ لیکن یہ طے ہے کہ پاکستان میں معاشی اور سیاسی حوالے سے اصلاحات لانا تقریباً ناممکن ہے۔ لیکن روس کی طرح اگر پاکستان میں حقیقی آزاد خیالی اور جمہوریت بھی آئی تو اس کی غیر جمہوریت روایات کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے آئے گی کہ یہ آزاد خیال آمریت کی حدوں پر منڈلا رہا ہے۔

جمہوریت کے مسائل

روس، وسطی ایشیا اور لاطینی امریکہ میں منتخب آمروں کی توجہ کے حالیہ مرکز انیسویں صدی کے آزاد خیالوں، جیسے کہ جان سٹورٹ مِل، کے لیے پریشان کن نہیں ہونے چاہئیں۔ مِل نے اپنی کلاسیکل کتاب ''آزادی پر'' کا آغاز اس نکتے سے کیا کہ جیسے جیسے ریاستیں جمہوری ہوتی ہیں لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ''حکومت کی'' طاقت پر قدغن لگانے کو

ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ یہ۔۔۔ایسے حکمرانوں کے خلاف ردعمل تھا جن کی دلچسپیاں عوامی مفادات سے متضاد تھیں۔'' لوگوں کی حکومت قائم ہو جائے تو ''قوم کو اس کی مرضی کے خلاف حفاظت کرنے کی ضرورت نہیں رہتی؟''مِل کے تحفظات کی تصدیق کرتے ہوئے الیگزنیڈر لوکیشنکو سے 1994 ء میں آزادانہ انتخابات میں بھاری اکثریت سے بیلارس کے صدر منتخب ہونے کے بعد اختیارات محدود کرنے کے سوال پر کہا، ''کسی قسم کی آمریت نہیں ہوگی۔ میں لوگوں کا ہوں اور انہی کے لیے بنوں گا۔''

آئینی آزادخیالی اور جمہوریت کے مابین کشیدگی کا مرکز حکومتی حاکمیت کی حدود ہیں۔ آئینی آزاد خیالی اختیارات پر قدغن لگانے کے بارے میں ہے؛ جب کہ جمہوریت اسے حاصل اور استعمال کرنے کا نام ہے۔ اس لیے اٹھارویں اور 19 ویں صدی کے بیشتر آزاد خیال جمہوریت کو شہری آزادیاں پس پشت ڈالنے والی قوت سمجھتے تھے۔ جمہوری حکومت کا اس یقین کی طرف رجحان کہ وہ مقتدرِ اعلیٰ ہے اختیارات کی مرکزیت کا سبب بن سکتا ہے، جس کے لئے عموماً ماورائے آئین راستے استعمال کئے جاتے ہیں اور ان کے نتائج بھی خوشگوار نہیں ہوتے۔ بالاخر جو حاصل آمریت سے زیادہ مختلف نہیں ہوتا۔

گزشتہ دہائی کے دوران عوام کی نمائندہ ہونے کی دعویدار منتخب حکومتیں سماج کے دوسرے شعبوں کے اختیارات اور حقوق پر حملہ آور ہوتی رہی ہیں، یہ حملے افقی (حکومت کے دوسرے شعبوں سے) بھی تھے اور عمودی (علاقائی اور مقامی حکام اور ذاتی کاروبار اور دوسرے غیر سرکاری اداروں جیسے پریس) بھی تھے۔ پیوٹن ،لوکیشنکو اور شاویز چند ایک مثال ہیں۔حتیٰ کہ ارجنٹائن کے نیک نیت اصلاح پسند سابق صدر کارلوس مینم جیسے حکمران نے بھی اپنے آٹھ سالہ عہد میں 300 کے قریب صدارتی احکامات جاری کئے جو1853ء سے لیکر ارجنٹائن کے تمام صدور کے احکامات کی مجموعی تعداد سے بھی زیادہ ہے۔ کرغزستان کے عسکر عکا یوف 60 فیصد ووٹ لے کر منتخب ہوئے اور اختیارات کو وسیع کرنے کے لیے 1996ء میں ایک ریفرنڈم کرایا جو وہ با آسانی جیت گئے۔ اب ان کو وزیر اعظم کے علاوہ تمام اعلیٰ سرکاری افسران کی تقرری کا اختیار ہے اور اسمبلی ان کی تین نامزدگیوں سے اختلافات کرے تو وہ پارلیمنٹ توڑ بھی سکتے ہیں۔

عمودی حملے ناگزیر ہیں جبکہ افقی زیادہ عام ہو چکے ہیں۔ گزشتہ تین دہائیوں میں

بھارت پاکستان نے بے جا الزامات کی بنیاد پر حکومتوں کا تختہ الٹ کر خطوں کو براہ راست وفاقی حکومتوں کے سپرد کر دیا ہے۔ایک کم ڈرامائی مگر مخصوص انداز سے جمہوریہ وسطی افریقہ نے اپنے یونیورسٹی نظام کو آزاد کرنے کے دیرینہ مسئلے کو ختم کر دیا ہے، ادارے کو سنٹرل ریاستی نظام کے تابع کر دیا گیا ہے۔ پیرو سے یوکرائن اور فلپائن تک صحافیوں کو محدود کرنے کے لیے طاقت کے بے دریغ استعمال نے حکومت پر بڑے محتسب ادارے کو کمزور کر دیا ہے۔ لاطینی امریکہ میں اصلاح پسند سمجھے جانے والے جمہوریت پسند، جسے کہ پیرو کا البرٹو ٹولیڈو، اکثر و بیشتر اپنے سیاسی حریفوں کو دبانے کے لئے صدارتی اختیارات استعمال کرتا ہے۔

دوسرے اداروں کے اختیارات پر قبضہ کرنے کی کاروائیاں لاطینی امریکہ اور سابقہ سوویت یونین میں عام ہیں، شاید اس کی وجہ ان علاقوں کی بیشتر ریاستوں میں صدارتی طرز حکومت ہے۔ ایسے نظاموں سے سامنے آنے والے رہنما اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ عوام کی زبان بولتے ہیں۔۔۔اس وقت بھی جب انہیں چند لوگ منتخب کرتے ہیں۔ جیسا کہ سیاسی سائنسدان جوہان لنز نے نشاندھی کی ہے کہ سلوواڈور الینڈی 1970ء میں چلی کے صدر صرف 36 فیصد ووٹوں سے بنے تھے۔ اسی طرح کے حالات میں پارلیمانی نظام میں وزیر اعظم کو اپنے اختیارات میں حصہ دار بنانا پڑتے۔ صدر جماعت کے سینئر ارکان کو وزیر بنانے کی بجائے سیاسی حلیفوں سے کابینہ تشکیل دیتا ہے اور ان کی نگرانی کے لئے داخلی پابندیاں لگا دیتا ہے۔ جب ان کے خیالات قانون ساز اداروں حتیٰ کہ عدالتوں سے ٹکراتے ہیں تو صدر سودے بازی اور اتحاد سازی کو بائی پاس کر کے ''قوم سے رجوع'' کر لیتا ہے۔ سکالرز پارلیمانی کے مقابلے میں صدارتی طرز حکومت کے فوائد پر بات کرتے ہیں لیکن اختیارات متعلقہ کے واقعات تو دونوں میں رونما ہو سکتے ہیں، طاقت کے متبادل مراکز غیر موجود ہو سکتے ہیں؛ مثلاً مضبوط مقنّنہ، عدالتیں، سیاسی جماعتیں اور بلدیاتی حکومتیں اور میڈیا۔ لاطینی امریکہ کے بیشتر ممالک نے صدارتی نظام کو تناسبی نمائندگی کے ساتھ ملا دیا ہے اور عوامی رہنماؤں اور کثیر الجماعتی نظام سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔۔۔ مگر یہ غیر مستحکم جوڑا ہے۔

اختیارات پر ناجائز قبضہ کرنے والی ریاستوں کا انجام فعال اور مستحکم ممالک پر نہیں ہوتا۔ مضبوط حکومت مؤثر حکومت سے بہت مختلف ہوتی ہے؛ بلکہ دونوں ایک دوسرے کی ضد

بھی ہو سکتے ہیں۔ افریقہ کی تمام ریاستیں اختیارات کی بھوکی اور غیر مؤثر ہیں۔ امریکہ میں حکومت کو محدود اختیارات ہیں لیکن یہ انتہائی مؤثر ہے۔ ان دو تصورات سے کنفیوز ہو کر متعدد مغربی حکومتوں اور سکالرز نے تیسری دنیا میں مضبوط اور مرکز پرست حکومتوں کے قیام کو سراہا ہے۔ ان ممالک کے رہنما یہ دلیل دیتے ہیں کہ انہیں جاگیرداری کے خاتمے، منتشر اتحاد اور سماج میں استحکام لانے کے لیے طاقت و اختیارات کی ضرورت ہے۔ اس میں کچھ حقیقت ہے مگر یہ جائز حکومت کو بھی کنفیوژ کر دیتے ہیں جو تمام اختیارات سے لیس ہوتی ہے۔ محدود اور پس جائز سمجھی جانے والی حکومتیں، امن و امان قائم اور سخت پالیسیاں اپنا سکتی ہیں، گو کہ یہ آہستہ آہستہ ہو گا، اتحاد بنا کر۔ ٹیکس کی وصولی کسی بھی حکومت کی کڑی آزمائش ہوتی ہے کیونکہ اس کے لیے پولیس فورس کی نہیں رضاکارانہ طور پر قانون کی پابندی درکار ہوتی ہے۔ کسی حکومت کو اس قدر بڑی پولیس فورس تو دستیاب نہیں ہوتی کہ وہ لوگوں کو ٹیکس ادا کرنے پر مجبور کریں۔ پھر بھی تیسری دنیا کی ریاستوں میں ٹیکس ادائیگی کی شرح بہت کم ہے۔ یہ اسلئے کہ ان۔۔۔اور انکی پالیسیوں۔۔۔کے پاس کوئی جواز نہیں ہوتا۔

اس معاملے میں بھی روس کی مثال ہمارے لئے سبق آموز ہے۔ سوویت یونین کے زوال کے بعد سے مغربی دانشور اور صحافی روسی ریاستوں کی کمزوری کا واویلا مچا رہے ہیں۔ ان کا یہ تجزیہ ٹیکس وصولی کی انتہائی شرح کی بنیاد پر ہے۔۔۔ روس کی حد تک یہ ایک مشکوک عمل ہے کیونکہ پہلے کبھی ایسا نہیں کیا گیا اسلئے اسے مابعد سوویت عہد میں یہ کام پہلی مرتبہ کرنا ہے۔ درحقیقت سوویت اشتراکیت کے بعد ریاست روس بہت مستحکم تھی۔ تاہم اسے کرپٹ اور بلا جواز بھی تصور کیا جاتا تھا۔ اب برسوں کے استحکام اور اصلاحات کے بعد (پیوٹین کے دور میں) روسی حکومت کسی بھی یورپی ریاست کے برابر ٹیکس وصول کرتی ہے۔ مغربی سیاستدان یلسن کے بیشتر حکم ناموں اور اختیارات پر قبضے کی کاروائیوں کو سمجھنے سے کوسوں دور تھے۔ انہوں نے اس بات پر یقین کر لیا کہ وفاقی حکومت حملوں کی زد میں اور اسے مدد کی ضرورت ہے۔

پیوٹن نے اس کتابی بحث کا خاتمہ کر دیا۔۔۔ کیونکہ ایک سیاستدان ہی ایسا کر سکتا ہے۔ اقتدار میں آنے کے چند ماہ کے دوران ہی اس نے کامیابی سے کریملن کی طاقت کا مظاہرہ کیا اور باور کرا دیا کہ سوویت دور کے اداروں میں دم خم باقی ہے۔ روایتی ہتھکنڈے بیکار

ہوئے تو اس نے ''قائل کرنے'' کی راہ لی۔ ججوں اور اراکن مقننہ، جنہوں نے کریملن سے اختلاف کیا، کی تنخواہیں ضبط کر لیں (روسی پارلیمنٹ کو اپنی تنخواہوں پر اختیار نہیں، حکومت کے دوسرے فنڈز تو دور کی بات ہیں)۔ اس واضح ہو جاتا ہے کہ ایوان بالا نے اپنے اختیارات اور حجم میں کمی کے حق میں ووٹ کیوں دیا، سیاست میں یہ انہونی ہے۔ جہاں تک ٹیکس کا تعلق ہے حکومت نے 2000ء میں اپنے ہدف کی سو فیصد رقم وصول کر لی۔ اس سے ثابت ہوا کہ روس کا مسئلہ بیمار ریاست نہیں بیمار یلسن تھا۔ زندہ، تازہ دم صدر کے ساتھ ہی طاقت ورحکومت واپس آ گئی۔ لیکن یہ پیش قدمی بدشگونی بھی ثابت ہو سکتی تھی؛ وفاقی حکومت کی کمزوری عظیم تر روسی ریاست کی ضرورت تھی۔

تاریخ کے تناظر میں، بے قابو وفاقیت آزاد خیال جمہوریت کی دشمن بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ جیسے ہی 19 ویں صدی یورپ میں سیاسی شراکت داری میں اضافہ ہوا تو برطانیہ اور سویڈن جیسے ممالک نے اسے با آسانی ہضم کر لیا جہاں عہد وسطیٰ کی اسمبلیاں، مقامی حکومتیں اور علاقائی کونسلیں تاوقت مضبوط تھیں۔ دوسری طرف فرانس اور پروشیا جیسے ممالک، جہاں بادشاہت نے موثر انداز سے وفاقیت بنالی (دونوں عموداً اور افقاً) کا انجام اکثر غیر جمہوری و غیر آزاد خیالی کی صورت میں نکلا۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ 20 ویں صدی کے سپین میں، آزاد خیالی کا ہراول دستہ کیٹالونیا تھا، بذات خود صدیوں سے آزاد و خود مختار خطہ تھا۔ امریکہ میں مختلف النوع اداروں--- ریاستی، مقامی اور پرائیویٹ---نے رائے دہی میں بے پناہ اضافے کو بڑی آسانی سے ہضم کر لیا جو 19ویں صدی کی ابتداء میں ہوا۔ 1922ء میں ہارورڈ کا مشہور مورخ آرتھر شیلزنگر نے رقم کیا کہ کس طرح امریکہ کے پہلے پچاس برسوں میں، کم و بیش، تمام ریاستوں، مفاداتی گروہوں اور فرقوں نے وفاقیت کو کمزور بلکہ توڑنے کی کوشش کی (9)۔ تازہ مثالوں میں بھارت جیسی نیم جمہوری ریاست اپنی مضبوط خطوں، مختلف زبانوں، ثقافت حتٰی کہ ذاتوں کے باوجود نہیں بلکہ انہی کے باعث بچ گئی ہے۔ نکتہ بہت منطقی ہے: غیر وفاقی حکومت محدود حکومت کو جننے میں مدد دیتی ہے۔

اکثریت کا ظلم

جمہوری نظام میں اگر استحصال کا پہلا ذریعہ منتخب آمر ہی ہوں، دوسرا خود عوام بن

جاتے ہیں۔جیمز میڈیسن نے فیڈرلسٹ پیپرز میں وضاحت کی کہ جمہوریت میں ''استحصال کا خطرہ سماج کی اکثریت'' سے ہوتا ہے۔ٹیوک ویل ''اکثریت کے ظلم'' سے خبردار کرتے ہوئے لکھتا ہے''جمہوری حکومت کا لب لباب اکثریت کی مطلق العنانیت ہے۔'' یہ مسئلہ میڈیسن اور ٹیوک ویل کے لیے تو زندہ اور فوری تھا مگر آج مغرب میں اسکی اہمیت کم ہوسکتی ہے کیونکہ یہاں فرد اور اقلیت کے بنیادی حقوق کی ضمانت ہے۔مگر متعدد ترقی پذیر ممالک میں گذشتہ دہائیوں میں ایسی جمہوریت رہی ہے جس میں اکثریت--- جو اکثر خاموش ہوتی ہے اور کبھی کبھار پر شور--- نے اختیارات کی تقسیم مٹا ڈالی، انسانی حقوق کو نظرانداز کیا اور رواداری وغیر جانبداری کی قدیم روایات کو نقصان پہنچایا۔

اس نکتے کی وضاحت میں بھارت، وہ ملک جہاں میں خود پلا بڑھا، کی مثالوں سے کرتا ہوں۔جمہوریت کی بحث میں بھارت کی حیثیت کھوکھلی سی حاصل ہے۔غریب ہونے کے باوجود یہاں 1947ء سے فعال جمہوریت کام کر رہی ہے۔جب کوئی ثابت کرنا چاہتا کہ معاشی ترقی کے بغیر جمہوریا جا سکتا ہے تو وہ ایک ہی مثال دیتا ہے--- بھارت۔ایسی تعریفوں سے یہی لگتا ہے کہ بھارت حقیقی معنوں میں آزاد سماج ہے۔لیکن بھارتی جمہوریت کے پردے کے پیچھے زیادہ پیچیدہ اور پریشان کن حقیقت چھپی ہے۔حالیہ چند دہائیوں کے دوران بھارت کی تصویر اس سے بہت مختلف ہوگئی ہے جو اس کے مداحوں نے اپنے دلوں میں بنا رکھی ہے۔یہ بات نہیں کہ یہ کم جمہوری ہوگیا ہے؛ اہم معاملات میں زیادہ آزاد خیال ہوگیا ہے۔لیکن یہ کم روادار۔سیکولر، قانون کی پابند، آزاد خیال میں بدل گیا ہے۔اور یہ دونوں رجحانات--- جمہوریانہ اور غیر آزاد خیالی--- آپس میں گہرے جڑے ہوئے ہیں۔

بھارت اپنی جمہوریت برطانیہ اور کانگریس پارٹی سے لی۔ بھارت میں آزاد خیال جمہوریت کے بیشتر اہم ادارے انگریزوں نے ہی قائم کئے اور چلائے: عدالتیں، مقنّنہ، انتظامی قوانین اور نیم آزاد پریس۔لیکن ان میں عام ہندوستانیوں کو زیادہ اختیارات کی اجازت نہیں تھی۔1947ء میں آزادی کے بعد بھارت نے یہ ادارے اور روایات وراثت میں لئے اور اپنی جمہوریت کی عمارت کھڑی کر دی--- رہنما تھی انڈین نیشنل کانگریس جو تحریک آزادی پر غالب رہی۔لیکن بذاتِ خود کانگریس بھی برطانوی سیاسی جماعت سے مشابہہ تھی، اپنی آزادخیال قومیت پرست نظریہ سے لیکر کمیٹی کی ساخت تک۔بھارتی

عدالتوں نے برطانوی روایات کی پیروی کی، اور اکثر اسی کے قانون کو استعمال کیا۔ نئی دہلی کی پارلیمنٹ ویسٹ منسٹر کے قوانین اور رسموں کے نقشِ قدم پر چلتی، وزیر اعظم کے وقفہِ سوالات میں بھی۔ برطانیہ اور کانگریس نکال دیں تو بھارتی جمہوریت کی آزاد شخصیت اخذ کرنا مشکل ہے، جیسا کہ یہ آج ہے۔

بھارت کے پہلے وزیر اعظم نہرو نے ایک مرتبہ خود کو ''بھارت کا آخری انگریز حکمران'' کہا تھا۔ یہ بات درست بھی تھا۔ وہ انتہائی اینگلو اور برطانیہ پرست بیرسٹر کا بیٹا تھا اور ایک استاد انہیں گھر پر انگریزی ادب اور تاریخ پڑھاتا تھا۔ اسکی شخصیت کے تشکیلی سال انگریز باؤ بننے میں گزرے تھے۔ اس نے ہیرو، برطانیہ کا پرکشش ترین اقامتی سکول، میں پڑھا اور یونیورسٹی کے لئے کیمبرج گیا۔ چند برس لندن میں بیرسٹری کی ترتیب میں گزارے۔ بعد میں بھارت کی قومیت پرستی کی طرف رجوع کرنے پر بھی دنیا کے بارے میں ان کا تصور 1940ء کے برطانوی بائیں بازو کے مفکروں جیسا تھا۔

نہرو کے بھارت۔۔۔وہ 1947ء سے 1962ء تک وزیر اعظم رہا۔۔۔ کو یک جماعتی جمہوریت کہا جا سکتا ہے۔ انتخابات آزاد اور منصفانہ تھے، لیکن بھارت کو آزادی دلانے والی واحد قومی جماعت ہونے کے باعث کانگریس ہر سطح پر غالب تھی، اکثر پارلیمنٹ اور مقنّنہ میں دو تہائی اکثریت حاصل کی۔ اس بلا مقابلہ صورت حال نے اسے رسمی اور غیر رسمی ہر قسم کے برتری دلا دی، متعدد شعبوں میں کسی جماعت میں کانگریس کو للکارنے کی ہمت نہ تھی۔ قدیم جنوب میں امریکہ کی ڈیموکریٹ جماعت کی طرح کانگریس نے بھارت کے سیاسی منظر نامے کی تمام سطحوں پر قبضہ کر لیا۔ بھارت ایک جمہوریت تھا، مگر ایسی جس میں ایک جماعت باقی تمام سے بھی باوزن تھی۔ تاہم، اسکے ساتھ یہ آزاد خیال بھی تھا۔ کانگریس نے آئین کے مطابق حکومتی نظام کے قیام کا تہیہ کر رکھا تھا۔ نہرو، بذات خود، پارلیمنٹ اور پریس جیسے آزاد خیال اداروں اور روایات کا احترام کرتا تھا۔ اس نے آزاد عدلیہ کا ساتھ دیا، حتیٰ کہ اس وقت بھی جب اس کا مطلب عدالت میں سیاسی شکست ہوتا۔ سیکولرازم اور مذہبی رواداری کا اسے جنون تھا۔ بے پناہ مقبولیت کے باوجود اس نے اختلاف رائے کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا اور بالآخر جماعت اور حکومت میں خود کو فاتح بھی ثابت کرتا۔

جب میں بھارت میں پرورش پا رہا تھا؛ 1960ء اور ستر کی دہائی کا آخر، یہ روایت

تاحال مضبوط تھی مگر لڑکھڑانے لگی تھی۔ کانگریس عوام میں جڑوں کی حامل جماعت سے بدل کر خوشامد پرست، سامراجی جماعت بن گئی۔ اندرا گاندھی نے عوامی پالیسیاں اپنائیں جو عموماً غیر آئینی، پس، غیر آزاد خیال ہوتیں: مثلاً بینکوں کو قومیانہ اور بھارتی شہزادوں کے حقوق کم کرنا۔ تاہم، عدالتیں خود مختار، پریس آزاد تھا اور مذہبی رواداری کا احترام کیا جاتا تھا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان اداروں اور اقدار کے ساتھ کانگریس کا رشتہ کمزور پڑ گیا۔ اہم ترین بات یہ ہوئی کہ کانگریس غالب قومی ادارے کی حیثیت سے نیچے آ گئی۔ نئے تازہ دم مدِمقابل اس خلا کو پر کرنے کے لیے سامنے آ گئے جن میں نمایاں ترین ہندو بنیاد پرست بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) تھی۔ تاہم، بی جے پی ان نئی جماعتوں میں سے ایک تھی جنہوں نے توجہ علاقائی، مذہبی یا ذات پات کے اختلاف سے حاصل کی تھی۔ اس کے نتیجے میں نئے رائے دہندگان---اور تقریباً یہ سب غریب، دیہاتی اور نچلی ذاتوں سے آئے تھے--- سیاسی نظام میں شامل ہوئے۔ 1950ء کی دہائی میں 45 فیصد آبادی ووٹ ڈالتی تھی؛ آج یہ شرح 60 فیصد سے بھی زیادہ ہے۔ یوگندر یادیو، اس رجحان پر نگاہ رکھنے والے سیاسی سائنسدان، کہتے ہیں کہ بھارت ایک ''بنیادی مگر خاموش تبدیلی'' سے گزر رہا ہے جو اس کی سیاست کو وسیع آبادی کیلئے کھول رہا ہے جو اس سے پہلے کنارے لگا دیئے گئے تھے۔ ان جماعتوں نے بھارت کو زیادہ جمہوری بنا دیا ہے مگر انہوں نے اسے کم آزاد خیال بھی کر دیا ہے۔

بی جے پی نہرو کے سیکولرازم کی نفی کر کے اقتدار میں آئی، نیم تشدد پسند قومیت پرستی کی حمایت کی اور مسلم و عیسائی کش عناصر کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔ اس سے شمالی بھارت (ایودھیہ) میں ایک مسجد گرانے کے لیے ملک گیر تحریک چلائی، جو بعض ہندوؤں کے مطابق ، رام کی جائے پیدائش پر تعمیر کی گئی تھی۔ رام کی دیو مالائی ہستی ہے، یہ کہ ہندومت عدم تشدد اور رواداری کا ساتھ دیتا ہے اور یہ کہ بھارت کو پہلے بھی مذہبی تشدد کے بھیانک تجربات رہے ہیں، جیسی باتیں بی جے پی کے لئے بہت کم اہم تھیں۔ نفرت بھری تقریروں نے نچلے طبقے کے ووٹر اپنی جانب کھینچے۔ حال ہی میں بی جے پی نے ایک اتحاد بنایا ہے اور یقیناً اسے اپنے مسلم و مسیحی مخالف اور نچلی ذات کے لئے غیر مفید دعووں کو کم کرنا ہوگا، ایسا نہ ہو کہ یہ اتحاد کے دوسرے اراکین کو تنہا کر دیں۔ لیکن اس نے تاحال بھارت کو ''ہندو آنے'' کی

حکمتِ عملی اپنا رکھی ہے، جس کا مطلب ہے تاریخ کی کتابیں نئے سرے سے لکھی جائیں اور مسلمان یا دوسری اقلیتوں کے حوالے کم کیے جائیں، بڑی یونیورسٹیوں میں علمِ نجوم کے شعبے جائیں اور عوامی مقامات پر ہندومت کے مذہبی نشانات استعمال کیے جائیں۔ جب کبھی یہ خود کو کسی مشکل سیاسی صورتحال میں جکڑا ہوا پائے تو مذہبی اختلاف کو ہوا دیتی ہے، جیسا 2002ء میں گجرات میں کیا گیا۔ گجرات میں بی جے پی کی مقامی حکومت نے۔۔۔ غیر متوقع انداز میں۔۔۔ ہزاروں معصوم مسلمان مرد، عورتوں اور بچوں کے قتلِ عام کی نہ صرف اجازت دی بلکہ کسی حد تک مدد بھی کی اور گردونواح کے لاکھوں لوگوں کو بے گھر کر دیا۔ کسی حد تک یہ ریاست کی مدد سے بھارت میں پہلا قتل عام تھا۔ پریشان کن ترین نکتہ ہے کہ تمام شواہد یہ ثابت کرتے ہیں کہ اس سے بی جے پی نے اپنے ہندوازم کو فروغ دیا۔ دراصل گجرات میں بی جے پی کے رہنما نے اس پرتشدد کاروائی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے چند ماہ بعد ہی انتخابات کا اعلان کر دیا۔ لیکن بھارت میں غیر جماعتی انتظامیہ، جو انتخابات کرواتی ہے، نے دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے فیصلہ دیا کہ ان حالات میں انتخابات ناممکن ہیں۔

مذہبی غیر رواداری بھارت کی جمہوریت کا نیا چہرے کی ایک جھلک ہے۔ بڑے پیمانے پر کرپشن اور قانون کی حاکمیت کے عدم احترام نے بھارتی سیاست کو بدل کر کے رکھ دیا ہے۔ اتر پردیش (یوپی) کو دیکھئے، بھارت کی سب سے بڑی ریاست اور نہرو اور کانگریس کے دوسرے قدآور رہنماؤں کا گڑھ، آج اس پر بی جے پی اور دو نچلی ذات کی جماعتوں کا قبضہ ہے۔ وہاں کے سیاسی نظام کو ''غنڈہ جمہوریت'' ہی کہا جا سکتا ہے۔ ہر برس انتخابات میں دھاندلی ہوتی ہے اور بیلٹ بکس جعلی ووٹوں سے بھرے جاتے ہیں۔ جیتنے والی جماعت افسر شاہی کو۔۔۔ اور بعض اوقات عدالتوں کو بھی۔۔۔ اپنے حمایتیوں بھرتی ہے اور اپنے مفادات پورا کرنے کے لیے حزب اختلاف کے اراکین کو رشوت دیتی ہے۔ نچلی ذات کے لاکھوں نئے ووٹروں کا المیہ یہی ہے کہ انہی نمائندوں، جنہیں کامیاب کرانے کے لیے وہ فرض شناسی سے ووٹ ڈالتے ہیں، نے عوام کو لوٹا ہے اور بے انتہا دولت من اور طاقتور ہو گئے ہیں جبکہ عوام کے استحصال کے خلاف صرف نعرے لگاتے ہیں۔

یہ سارا نظام 1997ء کے نومبر میں پست ترین سطح پر پہنچ گیا، جب یوپی کے وزیراعلیٰ نے پارلیمنٹ میں اپنی اکثریت اسطرح قائم رکھی کہ 93 وزرا کی کابینہ بنا ڈالی تا کہ وہ تمام

ارکان جو جماعتی وفا داریاں بدلتے تھے اور اسکی حمایت کی تھی کو سرکاری ملازمتیں دی جاسکیں۔ نئے وزراء کا ماضی داغدار تھا؛ انیس کے خلاف جرائم کے دستاویزی ثبوت موجود تھے۔ سائنسی اور ٹیکنالوجی کے وزیر ہری شنکر تیواری پولیس کے ریکارڈ میں تھے اور انہیں 9 قتل، دس اقدام قتل، تین ڈکیتیوں اور تین اغوا کی وارداتوں میں ملزم ٹھہرایا گیا تھا۔ عمل داری (نہ جانے اس کا مطلب کیا تھا) کے وزیر، رگھوراج پرتاب سنگھ، کے خلاف دو قتل، تین اقدام قتل اور متعدد اغواؤں کی تفتیش جاری تھی (کل جرائم 25 تھے)۔ ایک اور، پرتاب سنگھ، نے اپنا نیا عہدہ استعمال کرتے ہوئے خود کو جاگیردار بنالیا۔ آؤٹ لُک، ہندوستان کا ایک نمایاں اخبار، نے صورتحال کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

> ''اپنے صحن میں کھلی کچہری لگاتا اور لوگوں کو فوری انصاف مہیا کرتا ہے--- ''بھٹکے ہوئے لوگوں'' کو جرمانہ یا ان کی ٹھکائی کا حکم دیتا ہے۔ اس کی رعایا غریب عورتیں، مرد اور بچے اپنی پیشانی سے اسکے پیر چھوتے ہیں، رحم کی بھیک مانگتے ہیں۔ حصار شدہ بینٹی اسٹیٹ کے باہر ہر صبح سینکڑوں افراد 90 درجے کے زاویے پر جھک کر اسے سلام کرتے ہیں۔ 28 سالہ (سردار) شاندار گھوڑوں کی سواری کرتا، ہاتھی رکھتا اور (مسلح محافظوں کو لیے اپنی گاڑی میں) گھومتا ہے۔ پولیس کے مطابق وہ مخالفین کو قتل کرتا، تاوان کے لیے اغواء کرواتا اور ڈکیتیاں بھی کرواتا ہے۔ لیکن ان باتوں نے اسکے کریئر کو آگے بڑھنے سے کبھی نہیں روکا۔ 1993ء میں جب اس نے پہلی بار الیکشن تو بمشکل 24 برس کا تھا۔ تین برس بعد اس نے دوبارہ بی جے پی کی طرف سے الیکشن لڑا اور کسی کو اس کے مقابلے میں کھڑے ہونے کی جرأت نہیں تھی **(10)**۔''

یہ بھارتی جمہوریت کی حقیقت ہے۔ لیکن مغرب میں کوئی بھی اس پر غور کرنے کو تیار نہیں۔ اس کے برعکس ہم ووٹ ڈالتے ہوئے بھارتیوں کے حسین مناظر اور دنیا کی سب سے بڑی جمہوریہ کے متعلق رومانوی انداز میں گفتگو کرنا پسند ہے۔ باشعور ہندوستانی اس طرح نہیں سوچتے۔ سرکردہ صحافی کلدیپ نیئر یوپی کے واقعات کو ''جمہوریت کا دن دیہاڑے'' قتل کہتا ہے۔ ایک دوسرا مصنف پریم شنکر جھا کا خیال ہے کہ یہاں جمہوریت ''دو سو سال پیچھے'' چلی گئی ہے۔ صرف یوپی میں ہی یہ حالات نہیں۔ ہمسایہ ریاستوں بہار اور

ہریانہ میں سیاسی کرپشن اس سے کہیں بدترین ہے۔نئی دہلی کی پارلیمنٹ اورحکومت ان میں سے متعدد رجحانات کی عکاسی کرتی ہیں۔۔۔اگرچہ کم شدید صورت میں۔

بھارت کا عدالتی نظام بھی جمہوریت کے فخر سے بدعنوان سیاسی نظام کی باندی بن کررہ گیا ہے۔1975ء میں ایک مقامی جج نے وزیراعظم اندرا گاندھی کوصرف اس وجہ سے معطل کردیا کہ اسکا دعویٰ تھا کہ انہوں نے انتخابات کے قانون کی خلاف ورزی کی ہے۔1981ء میں ایک اور جج نے بھارت کی علاقائی سیاست کے طاقتورترین رہنما مہاراشٹر (بھارت کی امیرترین ریاست، بمبئی ، بھارت کا اقتصادی دارالحکومت، کا گھر) کے وزیراعلیٰ کے خلاف فیصلہ دیا۔آج کوئی جماعت بھارت کے کسی حصے میں اقتدار میں آئے تو مقامی عدالتوں کو اپنے حق میں کرنے کے راستوں کی تلاش اس کی اولین کوشش ہوتی ہے۔جج، اس صورتحال کو بھانپتے ہوئے، اپنی خدمات مقامی سیاستدانوں کو پیش کردیتے ہیں تا کہ ملازمت کے دوران بھی محفوظ رہیں اورریٹائرمنٹ پر بھی بھاری رقم مل جائے۔نئی دہلی میں سپریم کورٹ کے علاوہ کسی عدالت نے اس جرأت کا مظاہرہ نہیں کیا جس کا وہ چالیس برس قبل کیا کرتی تھیں۔

بھارت میں کرپشن ہر دور میں رہی ہے لیکن1970ءتک یہ بہت چھوٹے پیمانے پر تھی جسکا سبب ملک کے اقتصادی قوانین تھے۔1960ء کے عشرے میں کرپشن کی ایک مخصوص صورت ایک سرکاری افسر کا رشوت لے کرکسی سول آدمی کا کام کرادینا تھا۔اگرچہ یہ معیشت کے لیے تو نقصان دہ تھا لیکن سارا سیاسی نظام داغدارنہیں ہوتا تھا۔سیاسی بدعنوانی بھی تھی، لیکن دائرہ عمل محدود تھا۔کسی نے نہرو یا1950ءاور60ء کے عشروں میں، ان کے جانشینوں وزیراعظم لال بہادرشاستری یا سینئر سیاستدان پر کرپشن کا الزام نہیں لگایا۔غالباً اہم ترین چیز یہ تھی کہ اس دور میں عدلیہ بھی کرپشن سے پاک اوراعلیٰ اقدار کی حامل تھی۔1958ء میں نہرو نے مشہورترین جج ایم سی چگلہ کوامریکہ میں بھارت کا سفیر نامزد کردیا۔بمبئی بار کونسل اسے فوراً رد کرتے ہوئے رائے اپنائی کہ اس سے عدلیہ کی خودمختاری پر حرف آ سکتا ہے۔آج اپنے حمایتی ججوں کو پسندیدہ ترین عہدوں پر فائز کرنے کی کاروائیاں معمول ہیں۔اس کے نتیجے میں کرپشن اوراختیارات کا جائز استعمال تولامتناہی بلندیوں کو چھو ہی چکا ہے مگرساتھ ہی کوئی بھی جج معروف سیاستدان کے خلاف فیصلہ نہیں دیتا۔انتخابی عمل کو شفاف بنانے کی

واحد کوشش ، جوایک بیوروکریٹ کی جس نے الیکشن کمیشن کی سربراہی کی ، میں شروع کی گئی بھی بکواس ثابت ہوئی ہے۔

اس تناظر میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ نہرو کی کانگریس پارٹی نے1950ء اور 60ء کے دوران بھارت میں نیم آزاد خیال نظام متعارف کروایا جونئی جماعتوں کے سامنے آنے اور ووٹ حاصل کرنے کے لئے ذات پات، لسانی اختلافات اور مذہبی وفاداریوں جیسے حساس مسائل کو استعمال کرنے پر لڑکھڑانے لگا۔ یہ رویہ میرے آبائی شہر سے زیادہ کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ بمبئ کو اس کی اقلیتوں نے بڑا شہر بنایا ہے: پارسی صنعت کار، گجراتی تاجر، ہوٹلوں کے مسلمان مالک اور، یقیناً برطانوی۔ کلکتہ اور نئ دہلی کی طرح یہ کسی دور میں بھی انگریز حکومت کا مرکز نہیں رہا۔ بھارت میں نیو یارک اور لاس اینجلس کا ملاپ تھا:۔ بڑے بڑے ساحلی شہروں کی طرح کثرت النسلی شہر کی نمکین فضا میں رچی بسی تھی۔

بمبئ کا یہ چہرہ اب محض یادداشت کا حصہ ہے۔ گزشتہ 20 برسوں میں ہندو قوم پرستی اورMara Tha Charcusim نے بڑے منظّم انداز سے قدیم شہر کو نگل لیا ہے۔ علاقائی جماعت ،اس تحریک کو چلارہی ہے، شِوسینا، کا نام 17 ویں صدی کے ہندو سردار شِو جی کی نسبت سے رکھا گیا ہے جو خود نئ دہلی کے (مسلمان) مغلوں کے مخالف تھے۔ جماعت نے تہیہ کر رکھا ہے کہ ریاست مہاراشٹر، جس کا دارالحکومت بمبئ ہے، کو تمام ''خارجی'' عناصر سے پاک کردے گی۔ (مسلمان بارہویں صدی کے آغاز میں ہندوستان آئے:800 برس مقامی شمار کرنے کے لئے کافی نظر نہیں آتے۔) اس نیت کا اظہار شہروں، قصبوں، سڑکوں اور عمارتوں کے نئے نام رکھنے میں نظر آتا ہے جسمیں وہ تمام نام تبدیل کردیئے گئے جو معمولی سا بھی غیر ہندو تاثر دیتے تھے۔ اسی منصوبے کے تحت1996ء میں بمبئ کو ممبئ میں بدل دیا گیا، اس سے ہندو قوم پرستی کی سطح کا پتہ چلتا ہے۔ بیجنگ (ایک قدیم شہر جس کو مغرب نے اینگلو رنگ دے کر پیکنگ کر دیا) کے برعکس ممبئ پرتگالیوں سے قبل وجود نہیں رکھتا تھا اور انگریزوں نے اسے بمبئ کہا۔ سنگاپور اور ہانگ کانگ کی طرح یہ مچھیروں کا چھوٹا سا قصبہ تھا۔ اسے شہر میں نو آبادیاتی دور میں بدلا گیا۔ اس لیے ''ممبئ'' ماضی کی طرف مراجعت نہیں بلکہ ایک داستانوی کردار کی تصدیق ہے۔

نئے نام دینا محض ایک علامتی امر محسوس ہو مگر یہ رویوں میں زیرِ سطح تبدیلی کا مظہر ہے۔

بحرانی یا کشیدہ حالات میں یہ تبدیلی خونیں رنگ بھی اختیار کر سکتی ہے۔ گذشتہ دس برس میں، مسلمان، بمبئی کی سب سے بڑی اقلیت، کو1947ء برصغیر کی تقسیم پر خون میں نہانے کے بعد شدید اور خونیں ترین مذہبی فسادات کا سامنا رہا ہے۔ ہزاروں لوگ جان سے مار دیئے گئے ہیں اور لاکھوں بمبئی سے بھاگ کر دوسرے شہروں کو چلے گئے۔۔۔ عمومی رویے کا خوفناک معکوس جس میں اقلیتیں برابری اور بہتر مواقع کی تلاش میں شہروں کا رخ کرتی ہیں۔ غیر جانبدار تحقیقاتی کمیشن نے حکومت اور پولیس پر الزام عائد کیا کہ انہوں نے فسادات کا نشانہ بننے والوں کا ساتھ نہیں دیا بلکہ بعض مواقع پر فساد کاروں کی مدد کی۔ ان حالات نے مسلمانوں کو انتقام لینے پر مجبور کیا۔ اس طرح متعدد عینی شاہدوں کے مطابق، حالات مذہبی نفرت سے اس قدر کشیدہ ہو گئے کہ پہلے کبھی ایسا نہ تھا۔ بھارت میں بار بار ایسا ہوتا ہے--- تازہ ترین مثال گجرات ہے--- صرف مسلمان ہی اس کا نشانہ نہیں۔1998ء اور1999ء کے دوران مذہب کی بنیاد پر ہونے والے واقعات میں اس قدر مسیحی مارے گئے ہیں کہ ان کی تعداد گزشتہ 35 برس سے چار گنا زیادہ ہے۔1999ء سے اعداد وشمار نا مکمل ہیں لیکن مارے جانے والوں کی تعداد حیران کن حد تک زیادہ ہے۔ قتل کے علاوہ بائبل کو نذر آتش کرنے، چرچ لوٹنے اور خواتین پادریوں کی عصمت دری کی کاروائیوں کی لہریں بھی آتی رہی ہیں۔ حکومت نے اس مرتبہ بھی ان مقدمات کے لیے ہونے والی تحقیقات کو روک دیا ہے۔

نسلی فسادات اسی قدر قدیم ہیں جس قدر تاریخ اور آمرانہ حکومتیں انہیں ابھارنے کی ذمہ داری سے بری نہیں ہو سکتیں۔ لیکن کم عمر جمہوری سماج بھی ان کی طرف حیران کن رجحان ظاہر کرتے ہیں۔ وجہ سیدھی سی ہے: جیسے جیسے سماج کھلتا ہے اور سیاستدان اقتدار کے لیے کھینچا تانی کرتے ہیں تو ووٹ حاصل کرنے کے لیے ان کا مرکز وہ مسائل ہوتے ہیں جو ان سے براہ راست سروکار رکھتے ہیں، یعنی دوسرے گروہوں کے مقابلے میں اپنے گروہ کا اتحاد۔ عموماً یہی رجحان نسلی اور مذہبی فساد کا باعث بنتا ہے۔ بعض اوقات تصادم باقاعدہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

8دسمبر 1996ء میں جیک لینگ نے بلغراد کا ڈرامائی دورہ کیا۔فرانس کے معروف سیاستدان جیک لینگ ،سابق وزیرِ ثقافت، ہزاروں طلبا کے یوگوسلاوو صدرسلوبودون میلاسووچ ،جسے لینگ اور دوسرے مغربی مفکرین بلقان میں جنگ کا ذمہ دار ٹھہراتے تھے ،کے خلاف مظاہروں سے بہت متاثر تھے۔لینگ یوگوسلاویہ حزب اختلاف کی اخلاقی حمایت کرنا چاہتا تھا۔تحریک کے سربراہوں نے اپنے دفتروں--- یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ میں--اس کا استقبال کیالیکن صرف دھکے دیکر باہر نکالنے کے لئے اور''سربوں کا دشمن'' قرار دیا ملک بدر کرنے کا حکم دے دیا۔

لینگ کی پریشانی عام، اوراکثر غلط ،مفروضے کی علامت ہے: کہ جمہوری قوتیں نسلی ہم آہنگی اور امن کی قوتیں ہیں۔یہ بات پوری طرح درست نہیں۔ پختہ آزاد خیال جمہوریتیں نسلی اختلاف کو تشدد اور دہشت گردی کے بغیر سمو کر دوسری جمہوریتوں کے ساتھ پرامن طریقے سے رہ سکتی ہیں۔لیکن آئینی آزادخیالی کے پس منظر کے بغیر منقسم سماج کو جمہوریانہ قومیت پرستی، نسلی اختلافات حتٰی کہ جنگ بھی چھیڑ سکتا ہے۔ اشتراکیت کے بعد سوویت یونین کی ریاستوں اور یوگوسلاویہ میں ہونے والے انتخابات قوم پرست علیحدگی پسندوں نے جیتے اور ان کے ٹوٹنے کا سبب بنے ۔یہ اس قدر غلط بھی نہیں تھا کیونکہ یہ ممالک بزور متحد رکھے گئے تھے۔لیکن تیزی سے تبدیل ہوتی حکومتیں، نئے ابھرتے ہوئے ممالک میں بسنے والی اقلیتوں کے لئے کسی ضمانت ،اداروں یا سیاسی قوت کے بغیر، نے بغاوت، استحصال اور بوسنیا، آذربائیجان اور جارجیا جیسے ممالک میں، جنگ کا باعث بنتی ہے۔

انتخابات کا مطلب ہے کہ سیاستدان عوام کے ووٹوں کے لئے مقابلہ کریں۔جن سماجوں میں کثیرالنسلی گروہوں یا انہیں سمونے کی روایات مضبوط ہوں وہاں نسلی، لسانی اور مذہبی حوالے سے حمایت حاصل کرنا آسان تر ہوتا ہے۔ایک نسلی گروہ اقتدار میں آجائے تو دوسروں کو باہر کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ مفاہمت ناممکن دکھائی دیتی ہے؛ مادی معاملات--- گھر، ہسپتال اورغریبوں کی مدد--- پر تو سمجھوتہ کیا جا سکتا ہے مگر قومی مذہب پر اختلاف کیسے ہوتا ہے؟ اس قدر شدید سیاسی مسابقت تشدد کا رنگ اختیار کرسکتی ہے۔حزب اختلاف کی تحریکیں، مسلح بغاوتیں اورافریقہ میں فوجی کاروائیاں عموماً مذہبی ونسلی بنیادوں پر قائم حکومتوں کے خلاف ہی جاتی رہی ہیں جوانتخابات سے اقتدار میں آتی تھیں۔60ء کی دہائی

میں افریقی اور ایشیائی جمہوریتوں کی ناکامی کا تجزیہ کرتے ہوئے دو دانشوروں نے نتیجہ نکالا کہ جمہوریت ''نسل و مذہب کو اولیت دینے والے سماجوں کے لیے بالکل بھی مفید نہیں (11)۔'' افریقہ اور وسطی ایشیا پر حالیہ تحقیق نے اس افسوسناک نتیجہ کی تصدیق کر دی ہے۔ نسلی فسادات کے ماہر ڈونلڈ ہارویٹز کہتے ہیں، ''اس تاریک صورتحال میں--- منقسم سماجوں میں جمہوریت کی ناکامی کے بعد ہتھیار پھینک دینے کے علاوہ کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ انتخابات کا کیا مقصد ہے اگر یہ زیمبیا میں نینیا (Nyania) کی جگہ بیمبا (Bemba) مرکزی حکومت آئیں جو دونوں تنگ نظر ہیں، یا بینین میں جنوب کی بجائے شمال کا اقتدار آ جائے اور سماج کے دوسرا نصف قومی دھارے سے بالکل باہر ہو جائے (12)؟''

گزشتہ ایک دہائی میں بین الاقوامی تعلقات کے دانشوروں میں ایک بحث بہت زور وشور سے جاری ہے ''جمہوری امن''--- کسی بھی دو جدید جمہوریتوں نے آپس میں جنگ نہیں کی۔ اس نے دلچسپ اور بنیادی سوالات اٹھائے ہیں (کیا امریکہ کی خانہ جنگی اس میں شامل ہے؟ کیا ایٹمی ہتھیار امن کی زیادہ بہتر توجیہہ کرتے ہیں؟) حتیٰ کہ اعداد وشمار نے بھی قابل غور پہلو سامنے لائے ہیں۔ (جیسے کہ دانشور ڈیوڈ سپائرو نے نشاندہی کی ہے، گذشتہ دوسو برس میں جمہوریتوں اور جنگ کی کم تعداد کی وجہ سے ایسے مواقع شاذ ونادر آنا جمہوریتوں کے درمیان جنگوں کے غیر موجود ہونے کی توجیہہ کرسکتی ہیں۔ ان کے خاندان کے کسی فرد نے کبھی لاٹری نہیں جیتی، پھر بھی بہت کم لوگ اس قسم کے باہمی تعلق جیسی تشریحات مہیا کرتے ہیں۔) اگر اعداد وشمار درست بھی ہیں تو کیا پتہ چلتا ہے؟

عمانوئیل کانٹ، جمہوری امن کا حقیقی نظریہ ساز، کی رائے ہے کہ جمہوریتوں میں، جو جنگ کی قیمت چکاتے ہیں--- یعنی عوام--- ہی فیصلہ کن عنصر ہوتے ہیں، اس لیے ان کی احتیاط قابل فہم ہے۔ یہ دلیل بتاتی ہے کہ جمہوریتیں دوسری ریاستوں سے زیادہ امن پسند ہوتی ہیں، درحقیقت، یہ جنگ کو زیادہ پسند کرتی ہیں اور دوسری ریاستوں سے زیادہ تباہ کن لڑائی لڑتی ہیں۔ امن قائم رکھنا دوسری جمہوریتوں کا کام ہے۔ اس باہمی تعلق کے پسِ پردہ محرک تلاش کیا جائے تو ایک بات واضح ہوتی ہے: جمہوری امن دراصل آزاد خیال امن ہے۔ اٹھارویں صدی میں لکھتے ہوئے کانٹ کا خیال تھا کہ جمہوریتیں استحصالی ہوتی ہیں، پس

اس نے انہیں ''ری پبلک'' حکومتوں کے تصور سے خارج کر دیا، جو امن سے رہتی ہیں۔ کانٹ کے مطابق ''ری پبلک'' کا مطلب ہے، اختیارات کی تقسیم، احتساب، قانون کی حاکمیت، فرد کے حقوق کی حفاظت اور حکومت میں اس کی جزوی نمائندگی (گو کہ بالغ حقِ رائے دہی کے قریب تر بھی نہ تھا)۔ مستقل امن کے لیے کانٹ کی دوسری تجاویز بھی ریپبلک کے آئینی اور آزاد خیال ہونے سے گہرا تعلق رکھتی ہیں: ایک دوسرے کے شہریوں کے حقوق کا احترام، پوچھ تاچھ اور جوابدہی کا نظام، جس میں یقینی ہو کہ ایک لیڈر ملک کو جنگ میں نہ جھونک سکے اور کلاسیکل لبرل معاشی پالیسیاں— جن میں اہم ترین آزاد تجارت ہے--- جو باہمی محتاجیت پیدا کرتی ہیں جس سے جنگ اسراف اور تعاون مفید نظر آتا ہے۔ مائیکل ڈوئل، اس موضوع کے ایک ماہر شمار ہیں، 1997ء میں اپنی کتاب ''ویز آف وار اینڈ پیس'' میں تصدیق کرتے ہیں کہ آئینی آزاد خیالی کے بغیر جمہوریت بذات خود امن قائم رکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی:

> کانٹ نے آزاد، جمہوری اکثریت پسندی پر اعتبار کا اظہار نہیں کیا، اسکی دلیل اس دعویٰ کو سہارا نہیں دیتی کہ تمام شراکتی حکومتیں— جمہوریتیں--- امن پسند ہونی چاہییں، عمومی طور پر یا ایک دوسرے کے ساتھ۔ بہت سی شراکتی حکومتیں غیر آزاد خیال بھی رہی ہیں۔ جدید دور سے دو ہزار برس قبل، عوامی حکومت، عموماً، جارحیت کے ساتھ جڑی تھی (تھیوڈوسس) یا سامراجی فتح (میکیاولی)--- ایک ووٹر کی فیصلہ کن ترجیح دوسری جمہوری حکومتوں کے خلاف ''نسل کشی'' کی تحریک بھی ہوسکتی ہے۔

آزاد اور غیر آزاد خیال جمہوری ریاستوں کا باہمی اختلاف ایک اور تعلق پر روشنی ڈالتا ہے۔ سیاسی سائنسدانوں، جیک سنائڈر اور ایڈورڈ مینز فیلڈ، نے گزشتہ 2 سو برس کے جائزہ لینے کے بعد دعویدار ہیں کہ جمہوریاتی ہوئی ریاستیں اکثر جنگوں میں مصروف رہی ہیں، بہ نسبت پختہ عمر کی آمریتوں یا آزاد خیال جمہوریتوں کے(13)۔ آئینی آزاد خیالی میں غیر مستحکم ممالک، جمہوریت کا عروج اپنے ساتھ حساس قومیت پرستی اور جنگ کی خواہش لیکر آتی ہے۔ جب سیاسی نظام کھولا جاتا ہے، متنوع گروہ ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے مفادات

لیکرقوت پکڑ لیتے ہیں اوراپنے اپنے مفادات کیلئے دباؤڈالتے ہیں۔ سیاسی اور فوجی رہنما، جو پرانے آمرانہ نظام کی ہردم تیار باقیات ہوتی ہیں، ادراک کرتے ہیں کہ کامیاب ہونے کیلئے انہیں عوام کو کسی قومی مسئلے کے سہارے اپنے پیچھے لگانا ہوگا۔ نتیجہ گرما گرم تقریروں اور حکمت عملیوں کی صورت میں نکلتا ہے جو اکثر ممالک محاذ آرائی اور جنگ میں ملوث کردیتی ہیں۔

کیا کیا جائے؟

غالباً نئی جمہوریتوں کو درپیش مسائل کی بحث بہت مجرد لگے، اس قدر کہ اسے صرف یونیورسٹیوں اور تھنک ٹینکس میں ہی زیرِ بحث لایا جا سکتا ہے۔ لیکن عموماً نظریہ سیدھا عمل سے جاٹکراتا ہے۔ ممالک عموماً یہ فیصلہ کرتے رہتے ہیں کہ جمہوریت کی راہ پر کیسے آگے بڑھا جائے۔ اور امریکہ مسلسل حکمت عملیاں ترتیب دے رہا ہے تاکہ جمہوریاتے ---یا پھسلتے--- ہوئے ممالک کے مسائل سے نپٹا جائے۔ نظریہ غلط کرنے کا مطلب ہے آپ کا عمل بھی ٹھیک نہ ہوگا۔ انڈونیشیا کا معاملہ دیکھئے، جسکی جمہوریت کو اس سے کہیں زیادہ احتیاط سے رکھنے کی ضرورت تھی جس قدر کہ 1998ء میں کی گئی، جب آئی ایم ایف اور امریکہ نے اس کے آمر سہارتو کو اقتدار سے علیحدہ کر کے ملک کی جمہوریت کی راہ پر ڈالا۔ یا کم از کم یہ امید لگائی گئی تھی۔

1998ء میں انڈونیشیا جمہوریت کے لیے موزوں امیدوار نہ تھا۔ مشرقی ایشیا کے تمام ممالک میں سے یہ قدرتی وسائل پر سب سے زیادہ منحصر ہے۔ پہلا وار۔ یہ با جواز سیاسی اداروں سے محروم تھا، کیونکہ سہارتو نے ملک کو چند قریبی ساتھیوں کی مدد سے چلایا تھا اور اداروں کی تشکیل پر توجہ نہیں دی۔ دوسرا وار۔ اس میں جمہوریا نے کو بہت فی کس آمدنی کی نچلی سطح سے شروع کرنے کی کوشش کی، 1998ء میں 2 ہزار 6 سو 50 ڈالر کے لگ بھگ تھی۔ تیسرا وار۔ نتائج حیران کن تھے۔ جب سے اس نے جمہوریت اپنائی ہے کل قومی پیداوار تقریباً 50 فیصد کم ہوگئی ہے، معاشی ترقی کی ایک نسل نیست و نابود کردیا اور 2 کروڑ افراد کو غربت کی لکیر سے نیچے دھکیل دیا۔ نئے کھلے ہوئے سیاسی نظام نے اسلامی بنیاد پرستوں کو، جس میں سیاست کی روایت اس قدر مضبوط نہ تھی، اجنبی زبان نہیں بولتے تھے ---یعنی مذہب کی

--- کوسامنے لایا۔ملک کی پارلیمنٹ کے 20 فیصد ارکان خود کو اسلامی سیاستدان ہی کہلواتے ہیں۔اگر یہ کامیاب ہو گئے تو انڈونیشیا میں سیاسی اسلام کا عروج ریاست کے سیکولر چہرے کو مسخ کر دے گا اور جانشینی تحریکوں کو جنم دے گا جو اس کا اتحاد بھی خطرے میں ڈال دیں گے۔اس منتشر صورتحال میں کرپشن بدترین سطح پر پہنچ گئی ہے اور معاشی اصلاحات بھی ناکام ہو گئی ہیں۔

اگرچہ انہیں ہی قصور وار نہیں ٹھہرایا جا سکتا،آئی ایم ایف اور امریکہ حکومت نے1998ء کے بحرانی دور میں فوری اور بنیادی اصلاحات کا مطالبہ کیا،اسطرح حکومت کو بلاجواز اور ایک دوسرے کا تختہ الٹنے پر مدد دی۔اگر یہ ان اصلاحات سے آنے والے غیر مستحکم سیاسی نظام کا ادراک کر لیتے ،تو اپنے مطالبات میں تھوڑی نرمی لا سکتے تھے اور اس عمل کو مرحلہ وار بھی انجام دے سکتے تھے۔سہارتو ایک ناکام حکومت چلا رہے تھے لیکن ایسی جس نے امن و امان، سیکولر ازم اور معاشی آزادی حاصل کر لی تھی--- تیسری دنیا میں متاثر کن امتزاج ۔اہم ترین یہ کہ اس کا کوئی بہتر متبادل دستیاب نہ تھا۔درجہ بدرجہ سیاسی اصلاحات جامع انقلاب پر لائق ترجیح تھیں، یقیناً ایک عام انڈونیشیائی تو یہی سوچتا تھا، جسے مغربی پالیسیوں کا حتمی مستفید کنندہ سمجھا جاتا تھا۔

استحکام اور عدم استحکام، آزاد خیالی اور جمہوریت ،سیکولر ازم اور مذہبی بنیاد پرستی کے درمیان مشکل انتخاب مشرق وسطیٰ سے زیادہ کہیں بھی شدید نہیں ہیں۔اور کہیں بھی یہ اس قدر ضروری ہوگا کہ امریکہ اپنی پالیسیاں درست رکھے،نظریہ اور عمل دونوں میں۔

باب4

بے مثال اسلامی ممالک

ہمیشہ ایک عالیشان ماحول ہوتا ہے اور وہی اداس داستان۔ایک سینئر امریکی ڈپلومیٹ ہیلیا پولس میں واقع عظیم الشان صدارتی محلات میں سے ایک میں داخل ہوتا ہے، جہاں بیٹھ کر صدر حسنی مبارک مصر پر حکومت کرتے ہیں۔وہ سنگ مرمر سے تعمیر بڑے کمروں جو شاندار فرنیچر سے مزین تھے ـــ سب کچھ شاہی فرانس کی بدترین نقل تھا جسے مذاق سے ''لوئس فاروق'' (مصر کے آخری بادشاہ کی نسبت سے) کہا جاتا رہا ہے، سے گزرتا ہے۔تہہ در تہہ کھڑے محافظوں کو پار کر کے ایک پرتکلف مہمان خانے میں پہنچتا ہے جہاں صدر خود اس کا استقبال کرتے ہیں۔دونوں مصر امریکہ تعلقات، علاقائی معاملات اور اسرائیل فلسطین میں امن کے عمل پر تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔ پھر امریکی بہت آرام سے انسانی حقوق کا مسئلہ اٹھاتا ہے اور تجویز دیتا ہے کہ مصری حکومت سیاسی اختلاف رائے پر نرمی برت سکتی ہے، پریس کو زیادہ آزادی دے سکتی ہے اور دانشوروں کو جیل بھیجنا بھی روک سکتی ہے۔مبارک غصے میں آجاتے ہیں اور کہتے ہیں، ''اگر میں وہ کرلوں جو آپ کہتے ہیں، تو اسلامی بنیاد پرست مصر پر قبضہ کرلیں گے۔کیا آپ یہ چاہتے ہیں؟'' گفتگو دوبارہ امن عمل میں نئے موڑ کی طرف مڑ جاتی ہے۔

گذشتہ چند برس میں امریکیوں اور عربوں میں ایسے بہت سے تبادلہء خیالات ہوئے ہیں۔جب امریکی صدر کلنٹن نے فلسطین صدر یاسر عرفات پر زور دیا کہ وہ کیمپ ڈیوڈ امن معاہدہ پر متفق ہو جائیں جس پر جولائی 2001ء سے بات چل رہی تھی، ریکارڈ پر ہے کہ عرفات نے ان الفاظ سے جواب دیا: ''اگر میں وہ کرلوں جو چاہتے ہیں، کل کو حماس اقتدار

میں ہو گی۔''سعودی بادشاہت کے سب سے اہم ترجمان ،شہزادہ باندر بن سلطان ، نے امریکی حکام کو اکثر یاد کرایا کہ اگر وہ ان کی حکومت پر بہت زیادہ دباؤ ڈالیں گے، تو متبادل جیفرسن طرز کی جمہوریت نہیں طالبانی ملائیت ہو گی۔

اس کا بدترین پہلو یہ ہے کہ وہ درست بھی ہو سکتے ہیں۔مشرق وسطیٰ کے عرب حکمران آمر، کرپٹ اور سخت گیر ہیں۔ پھر بھی ان سے زیادہ آزاد خیال، روادار اور کثرت پسند ہیں جن کا ان کی جگہ لینے کا امکان ہے۔اکثر عرب ریاستوں میں انتخابات وہ سیاستدان پیدا کریں گے جنکے خیالات اسامہ بن لادن کے زیادہ قریب ہیں اردن کے آزاد خیال شہنشاہ شاہ عبداللہ کی نسبت۔گزشتہ برس امیرِ کویت نے امریکی پشت پناہی پر عورتوں کیلئے ووٹ کے حق کی بات کی۔لیکن جمہوری طریقے سے منتخب پارلیمنٹ--- جو اسلامی بنیاد پرستوں سے پر ہے--- نے تجویز کو رد کر دیا۔سعودی عرب کے شہزادہ عبداللہ نے اس سے قدرے کم ڈرامائی کام کرنے کی کوشش کی جب انہوں نے عورتوں کو گاڑی چلانے کی اجازت دینے کی تجویز دی۔لیکن مذہبی قدامت پرستوں نے ان کے خلاف عوامی تحریک چلائی اور تجویز واپس لینے پر مجبور کر دیا۔

عرب دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی یہی حالات نظر آئیں گے۔قطر، اومان، بحرین، اردن اور مراکش، کم وبیش ہر سیاسی مسئلے پر، بادشاہ ان سے زیادہ آزاد خیال ہیں جن پر وہ حاکم ہیں۔حتیٰ کہ فلسطینی علاقوں میں، جہاں سیکولر قوم پرست، جیسے یاسر عرفات اور پی ایل او، طویل عرصے سے سیاسی قوت چلے آرہے ہیں، بھی حماس اور اسلامک جہاد جیسی عسکری اور مذہبی جماعتیں، خصوصاً نوجوانوں میں، مقبولیت حاصل کر رہی ہیں۔اگرچہ وہ انتخابات کی ہی بات کرتے ہیں، اسلامی جماعتوں میں سے بہت سی جمہوریت کے لئے ان ٹھکرانے سے غلبہ حاصل کر رہی ہیں، جسے وہ مغربی طرز حکومت خیال کرتی ہیں۔ وہ بخوشی انتخابات کے ذریعے اقتدار میں آجائیں گے اور اپنی ملوکیت قائم کر لیں گے۔ یہ ایسے ہی ہو گا، جیسا کہ آرہی ہے، ایک آدمی، ایک ووٹ، ایک ہی وقت۔

مثال کے طور پر ریاست اور سماج کے متضاد ردِعمل کا جائزہ لیں جو نومبر 2001ء میں اسامہ بن لادن کی ٹیپ کے انکشاف پر سامنے آیا، جو امریکیوں فوج نے کابل میں القاعدہ کی پناہ گاہ سے حاصل کی۔ٹیپ میں اسامہ نے ستمبر گیارہ کے تفصیلی معلومات بیان کیں اور اس

میں ہونے والے جانی نقصان پر خوشی کا اظہار کیا۔ خطے کی بیشتر حکومتوں نے فوراً غور کیا کہ ٹیپ اصل ہے اور اسامہ کو قصوروار ثابت کر دیا۔ شہزادہ باندر نے بیان جاری کیا: ''ٹیپ ایک قاتل کا ظالم اور غیر انسانی چہرہ دکھاتی ہے جسے نہ تو انسانی زندگی کی عظمت کی پرواہ ہے اور نہ اپنے مذہبی عقیدہ کا احترام۔'' اس کے برعکس، شیخ محمد صالح ،ایک معروف سعودی عالم اور حکومت کے مخالف ، نے کہا،''میرا خیال ہے یہ ریکارڈنگ جعلی ہے۔'' اردن کی اسلامی جماعت، اسلامک ایکشن فرنٹ، کے سربراہ عبداللطیف اربیات نے سوالیہ انداز میں کہا،'' امریکیوں کو دنیا اس قدر بے وقوف لگتی ہے کہ وہ اس ٹیپ کو (اسامہ کے خلاف) کافی ثبوت سمجھ لیں گے؟''

بیشتر سماجوں میں حالات سے غیر مطمئن حلقے ملک کو مجبور کرتے ہیں کہ اپنی ناکامیوں پر انتہا پسندانہ رویہ اپنائیں۔ مشرق وسطی میں بھی، جمہوریت کے حامی ہی پہلے تھے جنھوں نے اردگرد کی تلخ حقیقتوں سے انکار کر کے ایک خیالی دنیا میں پناہ لی۔ یہ خطہ نظریہ سازش سے بھرا پڑا ہے، مثلاً یہ کہ بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ اسرائیلی انٹیلی جنس تنظیم، موساد، ورلڈ ٹریڈ سنٹر حملوں کے پیچھے تھی ۔ فروری 2002ء میں سی این این کے ذریعے 9 مسلمان ملکوں میں کرائی گئی رائے شماری میں 61 فیصد کا خیال تھا کہ عرب 11 ستمبر کے حادثے کے ذمہ دار نہ تھے۔ الجزیرہ، خطے کا پہلا جدید خود مختار ٹی وی چینل، کو بین عربوں کی بڑی تعداد دیکھتی ہے اور یہ اپنے مزاج میں بھی عوامی ہے۔ بہت سی خواتین اسکے پروگراموں کی میزبانی کرتی ہیں۔ یہ ایسی خبریں بھی چلا دیتا ہے جو سرکاری میڈیا عموماً سنسر کر دیتا ہے۔ اس کے باوجود یہ اپنی لہریں عرب قوم پرستی، امریکہ مخالف، سامی مخالف اور مذہبی انتہا پسندی کے عناصر سے بھرے رکھتا ہے۔

آج کی عرب دنیا آمرانہ ریاست اور غیر آزاد خیال سماج کے درمیان پھنسی ہوئی ہے ان میں سے کوئی بھی آزاد خیال جمہوریت کے لیے ذرخیز نہیں ہے۔ دونوں قوتوں کی باہمی حرکت پذیری نے ایسا سیاسی ماحول بنایا ہے جو مذہبی انتہا پسندی اور تشدد سے بھرپور ہے۔ جیسے جیسے ریاست زیادہ استحصالانہ ہوتی ہے سماج کے اندر اختلافی عناصر شدید ہوتے ہیں، ریاست کو استحصال کی نئی دلدل میں پھنسا دیتے ہیں۔ یہ مغربی دنیا میں ہونے والے عمل کا

معکوس ہے، جہاں آزاد خیالی نے جمہوریت کو جنم دیا اور جمہوریت آزاد خیالی کے لیے ایندھن ثابت ہوئی۔ اس کے برعکس عرب راستے نے آمریت کو جنم دیا جس نے دہشت گردی کی پرورش کی۔لیکن دہشت گردی تو ریاست اور سماج کے غیر فعالی رشتے کا محض ایک قابلِ غور پہلو ہے۔ وہاں تو اقتصادی فالج بھی ہے، سماجی جمود بھی اور فکری قحط بھی۔

معاصر مشرق وسطیٰ اور باقی دنیا سے منفرد مقام پر کھڑا ہے، جہاں گزشتہ دو دہائیوں سے شہری آزادیاں اور جمہوریت پنپ رہی ہیں۔ فریڈم ہاؤس اپنے 2002ء کے سروے، میں بتاتا ہے کہ اس وقت دنیا کے 75 فیصد ممالک ''آزاد'' یا ''جزوی آزاد'' ہیں۔ مشرق وسطیٰ کے 28 فیصد ممالک کو اس فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے، یہ تناسب گزشتہ بیس برس میں نیچے آیا ہے۔ دوسری طرف، براعظم افریقہ کے 60 فیصد ممالک آزاد یا جزوی آزادی شمار کئے جاتے ہیں۔

11 ستمبر کے بعد سے عرب دنیا کی سیاسی غیر فعالیت نے مغرب کے دروازے پر دستک دینا شروع کر دی ہے۔ ہر ایک کے لاشعور میں بہت سوں کے شعور میں یہی سوال ہے کہ ---ایسا کیوں ہے۔ یہ خطہ دنیا کے لئے سیاسی باسکٹ کیوں ہے؟ آگے کی طرف بڑھتی ہوئی جدید دنیا میں یہ بھٹکا ہوا کیوں ہے؟

اسلام کی وسیع وعریض دنیا

بن لادن کے پاس ایک جواب ہے۔ اس کے خیال میں عرب ریاستوں کا مسئلہ ہے کہ یہ پوری طرح اسلامی نہیں۔ صرف اسلام کی طرف رجوع کرنے سے، یہ اپنے ماننے والوں کو سکھاتا ہے، مسلمانوں کو انصاف ملے گا۔ اسامہ کے خیال میں جمہوریت ایک مغربی ایجاد ہے۔ شہری آزادی اور رواداری پر اس کا اصرار سماجی انحطاط اور زوال کو جنم دیتا ہے۔ بن لادن اور اس کے ہم خیال عرب حکومتوں کا تختہ الٹنے کی تاک میں ہیں---اور شاید ساری اسلامی دنیا کی---اور ان کی جگہ کٹر اسلامی اصولوں پر قائم حکومت لانا چاہتے ہیں جو شریعت کے مطابق چلائی جائے اور اسکی بنیاد ابتدائی خلافت (ساتویں صدی کی عرب کی اسلامی حکومت) پر ہو۔ ان تازہ ترین آئیڈیل افغانستان کی طالبان حکومت تھی۔

مغرب میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو بن لادن سے متفق ہیں کہ اسلام ہی مشرق وسطیٰ کے زوال کا سبب ہے۔ پیٹ رابرٹس اور جیری فیلویل جیسے مبلغین اور پال جانسن اور ولیم لنڈ جیسے مصنفین کہتے ہیں کہ اسلام استحصال اور قدامت پرستی کا مذہب ہے۔ دوسری طرف زیادہ سنجیدہ دانشوروں کا کہنا ہے ---اور تفصیلی جائزے کے بعد--- کہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہے: بنیاد پرستوں کیلئے اسلام ساری زندگی کے لئے ایک خاکہ ہے، سیاست سمیت۔ لیکن کلاسیکل اسلام، جو 7 ویں اور 8 ویں صدی میں بڑھا پھولا، اپنے اندر چند ایک ایسے تصورات ہی لئے ہوئے ہے جنہیں آج ہم جمہوریت سے منسلک کرتے ہیں۔ علی قادرائی، عرب سیاست کے قابل ذکر طالب علم، لکھتے ہیں، ''نمائندگی، انتخابات، بالغ رائے دہی، پارلیمانی اسمبلی کے قوانین کے تحت چلنے والے سیاسی اداروں، ان قوانین کا تحفظ کرنے والی آزاد عدلیہ اور ریاست کا لامذہبی ہونا— یہ تمام تصورات اسلام کی سیاسی روایت کے لیے سراسر اجنبی ہیں(1)۔''

قرآن کا تصورِ حاکمیت یقیناً آمرانہ ہے۔ مسلمانوں کی مقدس کتاب عادل بادشاہ، پاکباز حکمران اور حکیم ثالث کے تذکروں سے بھری پڑی ہے۔ لیکن بائبل اپنے آمرانہ رجحانات لئے ہوئے ہے۔ عہد نامہ قدیم کے شہنشاہ بمشکل ہی جمہوری تھے۔ بائبل کا سلیمان، جسے پرحکمت ترین انسان کہا گیا، بھی مطلق العنان بادشاہ تھا۔ بائبل میں ایسے حوالے بھی ملتے ہیں جن میں غلامی اور عورتوں کو ماتحت رکھنے کا دفاع کیا گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اسلام کی حقیقی ماہیت تلاش کرنے کے لئے قرآن سے کچھ زیادہ ہاتھ نہیں آتا۔ قرآن ایک وسیع کتاب ہے، جو شاعری اور تضادات سے بھری ہوئی ہے--- بائبل اور توریت کی طرح۔ تینوں کتب بادشاہوں کی تعریف کرتی ہیں، جیسا کہ بیشتر مذہبی متون کا رجحان ہے۔ روحانی اور دنیاوی مقتدر کو یکجا رکھنے کیلئے، کیتھولک مذہبی رہنماؤں نے صدیوں تک مذہبی اور سیاسی حاکمیت کو اس طرح قبضے میں رکھا ہے کہ کوئی مسلمان حکمران ایسا نہیں کرسکا۔ یہودیت کو سیاسی قوت میں حصہ لینے کے بہت کم مواقع تھے کیونکہ، اسرائیل کے قیام تک، یہودی جدید دنیا میں ہر کہیں اقلیت تھے۔ لیکن ''ملوکیت'' کی اصطلاح جوزفیس نے وضع کی، قدیم یہودیوں کے سیاسی نظریات بیان کرنے کیلئے (2)۔ تمام مذاہب کی اساسی کتب اس عہد میں تحریر کی گئیں جب ہر طرف بادشاہت، جاگیرداری، جنگ اور عدم تحفظ کا راج تھا۔ ان پر

یقیناً اپنے وقتوں کی چھاپ لگی ہے۔

19ویں صدی اور ابتدائی 20ویں صدی کے مغربی دانشور سمجھتے ہیں کہ اسلام آمریت کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ غالباً ان کی یہ رائے عثمانی سلطنت سے متاثر ہے، کروڑوں مسلمانوں کی کا معاشرہ جو بڑے مودبانہ انداز سے دور افتادہ قسطنطنیہ میں سلطان کی خدمت کرتے تھے، اور ہر جمعہ کو نماز سے قبل اسکے نام قصیدے پڑھتے تھے۔ لیکن اس وقت کی بیشتر دنیا میں سیاسی مقتدر کی طرف سیاسی رجحان تھا۔ روس میں زار کو کم و بیش ایک خدا سمجھا جاتا تھا۔ جاپان کا شہنشاہ ایک دیوتا تھا۔ غرضیکہ ایشیا کی سلطنتیں مغربی ریاستوں کی نسبت زیادہ مطلق العنان تھیں، لیکن اسلامی حکومت چین، جاپان یا روس سے زیادہ آمرانہ نہ تھی۔

اگر اسلام کا کوئی پہلو قابل ذکر ہے تو یہ مقتدر کی طرف رعایا کی بے لاگ اطاعت نہیں بلکہ اس کے برعکس ہے: اسلام ایک مقتدر مخالف رجحان رکھتا ہے جو آج کی ہر مسلمان ریاست میں نظر آتا ہے۔ غالباً اس کا ماخذ متعدد احادیث--- حضرت محمدؐ کے اقوال--- ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ مسلمان پر حاکم کی اطاعت تا وقت ہی فرض ہے اگر اسکے احکامات اللہ کے قانون سے متضاد نہیں*۔ اگر بادشاہ تمہیں ایمان شکنی کا حکم دے تمام شرائط ختم ہیں۔ (''اگر وہ کسی گناہ کا حکم دے تو مسلمان کو نہ اس پر کان دھرنا چاہیے اور نہ اس پر عمل کرنا چاہئے (3)۔'') یقیناً مذاہب بہت مبہم ہوتے ہیں۔ یعنی ان پر عمل آسان ہوتا ہے--- آپ ان کے احکامات کی تشریح اپنی پسند کے مطابق کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ آپ راہ سے باآسانی بھٹک سکتے ہیں--- آپ ہمیشہ کسی نہ کسی حکم کی خلاف ورزی کرتے رہیں گے۔ لیکن اسلام میں مذہبی انتظامیہ نہیں ہے --- کوئی پوپ یا بشپ وغیرہ نہیں--- جو اپنے حکم سے کسی تشریح کو درست قرار دے۔ اس کے نتیجے میں، ریاست کی مخالفت کرنے کا فیصلہ کرنا، اس بنیاد پر کہ یہ ناکافی حد تک اسلامی ہے، ہر اسکے اختیار میں ہے

---

* عام طور پر حدیث قرآن سے زیادہ اہم سمجھی جاتی ہے کیونکہ یہ مسلمانوں کو بتاتی ہے کہ وہ قرآن کے عمومی احکامات پر کیسے عمل کریں۔ مثلاً، قرآن مسلمانوں کو نماز پڑھنے کا حکم دیتا ہے، لیکن یہ نہیں بتاتا کہ نماز کیونکر ادا کیجائے؛ یہ احادیث میں ہے۔ (یقیناً احادیث بہت سی ہیں، جن میں بہت سی مشکوک ہے، اور بعض ایک دوسرے کی تردید بھی کرتی ہیں۔)

جو ایسا کرنا چاہے۔ اس قدر اسلام پروٹسٹنٹ ازم سے میل کھاتا ہے۔ جسطرح کوئی بھی پروٹسٹنٹ تھوڑی سی تربیت کے ساتھ --- جیری فیلول، پیٹ رابرٹس --- خود کو مذہبی رہنما قرار دے سکتا ہے، اسی طرح کوئی بھی مسلمان مذہب کے مسائل میں اپنی رائے دے سکتا ہے۔ ایسے مذہب میں جہاں کوئی سرکاری ملائیت نہیں، اسامہ بن لادن کو فتویٰ جاری کرنے کا اتنا ہی زیادہ --- یا اتنا ہی کم --- اختیار ہے جتنا نیو یارک کے ایک پاکستانی ٹیکسی ڈرائیور کو ہے۔ دوسرے لفظوں میں، مسئلہ اسلام میں مذہبی مقتدر کی غیر موجودگی کا ہے نہ کہ اس کے غالب آنے کا۔

عرب ریاستوں میں حالیہ انتشار کے مواخذ کا جائزہ لیں۔ مصر، سعودی عرب، الجیریا اور کسی بھی جگہ، اسلام پسند* ان ریاستوں کے خلاف متشدد کاروائیاں کرتے ہیں، جن پر وہ اسلام سے غداری کا الزام لگاتے ہیں۔ بن لادن اور ان کے مشیر، مصر کے ایمن الظواہری، دونوں عام لوگ ہیں، نے اپنی جدو جہد کا آغاز اپنی حکومتوں کے خلاف لڑ کر کیا ان پالیسیوں کے خلاف جنہیں وہ غیر اسلامی جانتے تھے (الظواہری کیلئے یہ 1978ء میں مصر کے صدر انور سادات کے اسرائیل کے ساتھ امن معاہدہ تھا؛ بن لادن کیلئے یہ 1991ء میں شاہ فہد امریکی فوجوں کو سعودی عرب میں داخلے کی اجازت دینے کو فیصلہ تھا)۔ 1996ء میں اپنے اعلان جہاد میں بن لادن نے اعلان کیا کہ سعودی حکومت دائرہ اسلام سے خارج ہو چکی ہے، اسلئے اسکے خلاف ہتھیار اٹھانا جائز ہے: ''حکومت نے امت سے دغا کیا اور کفر کے ساتھ مل گئی ہے، مسلمانوں کیخلاف ان کی مدد اور ساتھ دے رہی ہے۔'' پس اسامنہ نے حکمرانوں کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا اور کئی اس کے پیچھے چل پڑے۔

اسکے منظر عام پر آنے کا وقت بھی ایک سوال ہے: اگر جھگڑا اسلام کا ہی ہے تو یہ تصادم اسی وقت کیوں ہو رہا ہے؟ اسلامی بنیاد پرستی نے 1979ء کے ایرانی انقلاب کے بعد ہی کیوں رفتار پکڑی ہے؟ اسلام اور مغرب 14 سو برس سے اکٹھے رہ رہے ہیں۔ جنگیں بھی

*''اسلام پسند'' بن لادن جیسے لوگوں کے لئے استعمال ہوتی ہے جو اسلام کو سیاسی نظریہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں، اسلامی ریاست کے قیام کیلئے جو سختی سے اسکے اصولوں پر عمل پیرا ہو۔ میں نے بعض جگہوں پر ان کی جگہ دوسری معروف اصطلاح لگائی ہے، ''اسلامی بنیاد پرست''، اگرچہ بہت سے دانشور اولذکر کو ترجیح دیتے ہیں۔

ہوئی ہیں لیکن بہت سا وقت پرامن بھی گزرا ہے۔ بہت سے دانشوروں کی رائے ہے کہ 1940ء کی دہائی تک اقلیتوں بالخصوص یہودیوں، کیساتھ جس قدر کم ظلم مسلمان حکومتوں کے تحت ہوا کسی اقلیت کے دور میں نہیں ہوا۔ اسلیے مشرق وسطیٰ صدیوں تک متعدد اقلیتوں کا گہوارہ رہا ہے۔ عام رائے ہے کہ 1948ء میں اسرائیل کے قیام کے بعد دس لاکھ یہودی عرب ملکوں سے چلے گئے یا انہیں نکال دیا گیا۔ کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ اتنی زیادہ تعداد وہاں مقیم کیوں تھی؟

"اسلام کی ماہیت" کے بارے میں یہ طوفانی اعلان کی مشکل یہ ہے کہ اسلام، کسی بھی مذہب کی طرح، وہ نہیں جو اسکی کتاب نے اسے بنایا بلکہ وہ ہے جو اسکے ماننے والے اسے بناتے ہیں۔ مٹھی بھر بنیاد پرستوں کی ہرزہ سرائی کو بھول جائیں، جو قلیل ہیں۔ بیشتر مسلمانوں کی روزمرہ زندگی اس عقیدہ کی تصدیق نہیں کرتی بنیادی طور پر مغرب یا جدیدیت مخالف ہو۔ آبادی کے لحاظ سے بڑے ترین اسلامی ملک، انڈونیشیا، میں 1949ء میں آزادی کے بعد سے سیکولر حکومت ہے اور کمزور سا مذہبی حزب اختلاف ہے (جو اگرچہ اب بڑھ رہا ہے)۔ جہاں تک اسلام اور سرمایہ داری میں مطابقت کی بات ہے، انڈونیشیا ماضی قریب تک تیسری دنیا کیلیے عالمی بینک کا مثالی ملک تھا، آزاد معیشت قائم کی اور 3 دہائیوں تک 7 فیصد کی شرح سے ترقی کی۔ اب اس نے جمہوریت اختیار کی ہے (جو اگرچے ابھی ایک نازک سا تجربہ ہے) اور ایک خاتون کو صدر منتخب کیا ہے۔ انڈونیشیا کے بعد دنیا کے تین مسلم اکثریتی علاقے، پاکستان، بنگلہ دیش اور بھارت (بھارت میں مسلمانوں کی تعداد 120 ملین سے زائد ہے) ہیں۔ انہیں نہ صرف جمہوریت کا خاطر خواہ تجربہ تھا بلکہ خاتون وزراء اعظم بھی منتخب کیں، اور یہ انہوں نے مغربی ممالک سے کافی پہلے کیا۔ پس اگرچہ اسلام کے بعض پہلو حقوق نسواں سے متصادم ہیں لیکن زمینی حقائق بعض اوقات مختلف ہوتے ہیں۔ اور جنوبی ایشیا مسلم عورتوں کے حوالے سے منفرد نہیں ہے۔ افغانستان میں، 20 سالہ خانہ جنگی اور انتشار میں گرنے سے قبل، کل ڈاکٹروں میں 40 فیصد خواتین تھیں اور کابل عورتوں کیلیے ایشیا کا آزاد خیال ترین شہر تھا۔ اگرچہ اسامہ نے اسلام کا طالباتی تصور قبول کر لیا ہو، لیکن بیشتر افغانیوں نے نہیں — جیسا کہ مابعد طالبان کابل اور مزار شریف میں فلمیں دیکھتے، موسیقی سنتے، رقص کرتے، داڑھی منڈواتے اور پتنگیں اڑاتے مردوں کے مناظر سے پتہ چلتا ہے۔

اس کے بعد دنیا ترکی، دنیا میں پانچویں بڑی ترین مسلم آبادی، ناکام مگر فعال جمہوریت، نیٹو (نارتھ اٹلانٹک ٹریٹی آرگنائزیشن) اور یورپی یونین کا ممکنہ رکن، ہے۔ نائیجیریا اور مالی جیسی ناتجربہ جمہوریتوں کو شامل کرلیں تو آپ کو عالم اسلام کے بارے میں زیادہ منظر نظر آئے گا۔ یہ تصویر کچھ زیادہ خوبصورت نہیں۔ بیشتر مسلم ممالک تیسری دنیا میں ہیں اور غربت، کرپشن اور بدانتظامی جیسے مسائل میں الجھے ہیں۔ لیکن اسلام اور استحصال میں تعلق تلاش کرنا آسان نہیں۔ جیسا کہ فریڈم ہاؤس نے لکھا، ''دنیا کے مسلمانوں کی بڑی تعداد منتخب جمہوریتوں میں رہتے ہیں۔'' اگر اسلام اور جمہوریت میں کوئی بنیادی تضاد ہے تو آٹھ سوملین مسلمان اس سے بے خبر ہیں۔

مسئلہ کی جڑ اسلامی دنیا نہیں مشرق وسطٰی میں ہے۔ آپ اس علاقے میں جاتے ہیں تو سنگین صورتحال میں وہ تمام خرابیاں دیکھتے جو لوگ اس وقت شمار کرتے ہیں جب وہ آج اسلام کے بارے میں سوچتے ہیں۔ ایران*، مصر، شام، عراق، مغربی کنارے، غزہ کی پٹی اور خلیج فارس کی تمام ریاستوں میں آمریت مختلف رنگوں میں مسلط ہے اور آزاد خیال جمہوریت کے دور دور تک آثار نہیں۔ اسلامی بنیاد پرستی کے سبز باغوں کی کشش بہت مضبوط دکھائی دیتی ہے، چاہے اسکا ذکر بند دروازوں میں کیا جائے یا مسجدوں کے شعلا بیاں تقریروں میں۔ یہ جھنڈے جلانے والوں، دھواں دھار ملاؤں اور خودکش حملہ آوروں کی دنیا ہے۔ امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیا لیکن ایک بھی افغانی امریکیوں کے خلاف دہشتگردی میں ملوث نہیں تھا۔ افغانستان ایک کیمپ تھا جہاں سے عربوں کی ایک فوج امریکہ خلاف نبردآزما تھی۔

عرب ممالک اسلامی دنیا کا اہم بلکہ---دلوں کی دھڑکن--- ہیں۔ لیکن یہ صرف ایک حصہ ہے اور عددی لحاظ سے بہت چھوٹا۔ دنیا کے ایک ارب 20 کروڑ مسلمانوں میں سے 26

* میں نے اس باب میں اکثر ایران کو عرب ممالک میں شمار کیا ہے۔ تکنیکی لحاظ سے ان میں نہیں ہے؛ ایرانی فارسی بولتے ہیں نہ کہ عربی۔ لیکن ایران کے 1979ء کے انقلاب نے بنیاد پرستی کی تحریک کو بہت عروج دیا اور، اب تک، اسلام کے دو بڑے اور قدیم فرقوں: سنی (عرب) اور شیعہ (ایرانی) میں تقسیم کم کردی۔

کروڑ عرب میں رہتے ہیں۔ مغرب میں لوگ ''اسلامی'' ''مشرق وسطیٰ کا'' اور ''عرب'' کی اصطلاحیں بدل بدل کر استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ان کا مطلب ایک سا نہیں ہے۔

عرب ذہنیت

کیا میں تیزی سے آگے بڑھ گیا ہوں؟ عملی اسلام کو جمہوریت اور آزاد خیالی کا کم شدید مخالف، جیسا کہ بہت سے کہتے ہیں، ظاہر کر کے کیا میں اور ثقافتی دلیل کی طرف بڑھ گیا ہوں، جو عربوں کے متعلق ہے؟ یہ بھی ایک دلیل ہے جو مغربی دانشور مدت سے استعمال کرتے آرہے ہیں، آغاز نو آبادیاتی برطانوی افسروں نے کیا جو 19 اور 20 ویں صدی کی ابتداء میں عرب پر حاکم تھے۔ ٹھیٹھ نتیجہ وہ ہے جو جان بیگٹ گلب ،1939ء سے 1956ء تک اردن فوج کے عرب حصے کا برطانوی کمانڈر، نے بیان کیا:

> ہم نے انہیں خود اختیاری دی ہے جس کیلئے قطعی غیر موزوں ہیں۔ ان کا فطری رجحان آمریت کی طرف ہے۔ جمہوری اداروں کو توڑ مروڑ کر استحصال کا ذریعہ بناتے ہیں--- پس ہر انقلاب کے بعد وہی گروہ ایک نئے روپ میں سامنے آجاتا ہے، اسوقت تک جب تک کہ قتل نہ ہو جائے (4)۔''

ٹی ای لارنس--- برطانوی افسر اور مہم جو، عربوں کا دوست، جو ڈیوڈ لین کی فلم ''لارنس آف عریبا'' میں امر ہو گیا--- بھی عربوں کو رومانوی انداز میں پیش کرتا ہے، اپنے قریب آنے والے کسی بھی اجنبی سے باآسانی مانوس ہو جاتے ہیں:

> ''عربوں عقیدے پر ایسے ہی نچایا جا سکتا ہے جسطرح ایک رسی پر؛ کیونکہ ان کی کی وفاداری نے ان کے ذہنوں کو فرمانبردار غلام بنا دیا ہے۔۔۔ ان کے ذہن عجیب وغریب اور تاریک تھے، اداسی اور بلند خیالی سے بھرے ہوئے، حکومت کرنے کی اہلیت سے عاری لیکن ایمان اور عقیدے میں ان جیسا زرخیز ذہن دنیا میں کسی اور کو عطا نہیں ہوا (5)۔''

کم جذباتی، مگر اسی قدر ناکام عربوں کی یہ اہلیت کہ وہ اپنے معاملات نہیں چلا سکتے، ایولین بیرنگ، جو بعد میں لارڈ کرومر کہلایا، جس نے 1883ء سے 1907ء تک تن تنہا تاج

برطانیہ کیلئے مصر کو انتظام چلایا، کا تجزیہ ہے۔جدید مصر کی تفصیلی تاریخ میں وہ ''مشرقی'' اور ''مغربی'' سوچ میں فرق بتاتا ہے:

> حتمیت کی خواہش، جو باآسانی غیر صدقیت میں گر جاتی ہے، مشرقی ذہن کی بنیادی صفت ہے۔۔۔مشرق کا ذہن ۔۔۔اسکی دل لبھا لینے والی گلیوں کی طرح، توازن میں لانے کی ضرورت ہے(6)۔

آج ''مشرق'' کی ایسی صفات بلاجواز ہونے کا شائبہ دیتی ہیں، ان دنوں کی یاد دلاتی ہیں جب علم کا ہر شعبہ سائنس شمار ہوتا تھا۔(اور اگر ''مشرق'' میں ہندوستانیوں اور چینیوں کو بھی شامل کیا جائے۔۔۔جیسے وہ خود کرتے ہیں۔۔۔تو ان کی سائنس، ریاضی اور عقلیت کے ایسے دوسرے مظاہر میں حیران کن کامیابی کا کیا کریں؟) لیکن حالات ایک انتہا سے دوسری انتہا تک پہنچ گئے ہیں۔ جو لوگ اسطرح کے ثقافتی قدامت پرستی میں پھنس گئے، ''مشرقی'' کی جگہ نئے دانشور آ گئے ہیں جو سیاسی حوالے سے درست سوچتے ہیں اور اس سوال کی جُرات نہیں کریں گے کہ ایسا کیوں ہے کہ عرب ممالک باقی دنیا سے الگ تھلگ سماجی اور سیاسی ماحول میں الجھے ہوئے لگتے ہیں۔ نہ ہی اس دنیا میں خود تنقیدی کی گنجائش ہے۔ بیشتر عرب مصنفین اپنی قومی عزت کے دفاع کے لئے زیادہ فکرمند ہیں، مردہ مستشرقین کے دعووں کے خلاف، بجائے اسکے کہ عرب دنیا کے المیہ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

حقیقت سے انکار ناممکن ہوتا ہے۔عرب لیگ کے 22 رکن ممالک میں سے ایک بھی منتخب جمہوریت نہیں، جبکہ ساری دنیا کے 63 فیصد ہیں۔اگرچہ چند ایک۔۔۔ اردن، مراکش۔۔۔ کسی حد تک آزاد خیال مطلق العنان ہیں مگر بیشتر نہیں ہیں۔خطے کی حالیہ تاریخ تاریک ہے۔اس کے گزشتہ پانچ عشرے عربوں کی ایک کے بعد ایک آمر کو نجات دہندہ سمجھ کر اسکے پیچھے بھاگنے سے بھری ہیں۔مصر میں جمال عبدالناصر، لیبیا میں معمر قذافی اور عراق میں صدام حسین۔۔۔سب عرب عوام کی دلی عقیدت کے وصول کنندہ رہے ہیں۔

چند عرب دانشور جو ثقافت کے میدان میں مہم جوئی میں مصروف ہیں نشاندہی کرتے ہیں کہ عرب کا سماجی ڈھانچہ آمریت پسند ہے۔مصری دانشور بہاگت قرآ نے لکھتے ہیں کہ ''عرب کے سیاسی تصورات روشن خیال آمر، سورما طرز کے لیڈر، غیر معمولی زعیم، معزز سربراہ خاندان سے بھرے پڑے ہیں۔'' لبنانی سکالر حلیم برکات تجویز کرتے ہیں کہ مرد

مرکزی تعلقات اور اقدار جو عرب خاندان میں مروج ہیں دفتر، سکول، مذہبی، سیاسی اور سماجی تنظیم میں بھی کام کرتی نظر آتی ہیں۔ ان سب میں پدر نما ایک ہستی باقی پر حکومت کرتی ہے، فیصلے پر اسکی اجارہ داری ہوتی ہے، فرمانبرداری کی امید رکھتا ہے اور اختلاف رائے کو شاذ و نادر ہی برداشت کرتا ہے۔ پدری تاثر کو نمایاں کر کے، ذمہ دار افراد (حکمران، رہنما، اساتذہ، افسران اور سپر وائزر وغیرہ) اقتدار کے اہرام کی چوٹی پر اپنی جگہ محفوظ بنا لیتے ہیں۔ ایک مرتبہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد اس سربراہ کو تخت سے ہٹایا نہیں جا سکتا تاوقتیکہ کوئی اس سے بڑا مرد پرست ہو۔

عرب سردار کا نقشِ اول ہم مصر کے نوبل انعام یافتہ ناول نگار ناغیب محفوظ کے ناولوں میں دیکھ سکتے ہیں۔ ان کے مشہور تین سلسلہ وار ناول--- بین القصرین، قصرالشوق اور شکریہ--- مصر کے ایک تاجر، السید احمد الجواد، کے حالات زندگی ہیں۔ سِل سید، جیسا کہ اسکی اہلیہ اسے پکارتی تھی، اپنے گھر کا بلا شرکت غیر سلطان ہے۔ اہلخانہ اسکے ماتحت ہیں، ہوشیار کھڑے رہتے ہیں جبکہ وہ تنہا رات کے کھانے سے لطف اندوز ہوتا ہے؛ جب وہ ختم کرتا ہے تو اسکے بیوی بچوں کو کھانے کی اجازت ہے۔ جب اسکی اہلیہ بلا اجازت گھر سے باہر نکل جاتی تو اسے میکے واپس بھیج دیتا ہے۔ آج مصری سِل سید حاکم شوہر سے لیکر قومی رہنما تک ہر چیز کیلئے استعمال کرتے ہیں (8)۔

ہم بیشتر عرب رہنماؤں میں سِل سید کی جھلک دیکھ سکتے ہیں: ناصر میں، ایک معجزہ کار مگر آمر رہنما جس نے خوف کیساتھ اپنے لیے محبت بھی جگائی؛ اس کے جانشین سادات میں، جو عوام کو "میرے بچے" کہتا تھا غیر معمولی ظلم دکھاتے ہوئے بھی۔ ہم سِل سید کو دیکھتے ہیں خلیجی شاہوں کی ماہانہ مجلس میں، جس میں رعایا اپنی شکایات (جو احتیاط سے پہلے ہی طے ہوتی ہیں) شاہ تک پہنچائیں۔ اسکی بیٹی بیمار ہے، اسکا ہمسائے سے اراضی کا جھگڑا ہے۔ شیخ ایک کو وزارت صحت میں بھیج دیتا ہے، دوسرے کو وزارت داخلہ کے سپرد کرتا ہے۔ درخواست گزار اسکے ہاتھ چومتا اور اللہ کی تعریف کرتا ہے کہ اس نے ان پر اس قدر مہربان حکمران مقرر کیا۔ وہ جواب میں ہاتھ ہلاتا ہے جیسے کہتا ہو کہ وہ تو اپنا فرض پورا کر رہا تھا۔ "میں ہمیشہ لوگوں کے ساتھ قریبی رابطہ میں رہنا چاہوں گا کیونکہ اسی طرح ان کی خواہشات پوری کی جا سکتی ہیں۔ اسی لیے میری مجلس کے دروازے شرکت کے ہر خواہشمند کیلئے کھلے ہوں گے،"

شاہ عبدالعزیز بن سعود، سعودی عرب کے بانی، کہتے ہوں گے۔

لیکن یہ سب باتیں مغرب کے کانوں کے لئے جس قدر اجنبی ہیں اسی قدر ان--- مرد مرکزیت، مطلق العنانیت، رومانویت--- میں سے کوئی بھی صرف عربی نہیں ہے۔عرب ثقافت پر تباہ کن نکتہ چینی جو برطانوی سپاہیوں نے قلم بند کی اور اوپر حوالہ بھی دیا گیا ایسی ہی ہے جیسی انہوں نے چینیوں، جاپانیوں، ہندوستانیوں، بلکہ ''مشرق'' اور'' ایشیائیوں'' پر کی تھی۔ ماضی قریب تک بیشتر ایشیائی اور افریقی ممالک پر طاقتور مردوں کی حکومت تھی جو عوام میں خوف اور دہشت سے ہی معزز سمجھے جاتے تھے؛ انڈونیشیا کے سکارنو، تنزانیہ کے جولیس نائیر، ارجنٹائن کے یوان پیرن اور یوگوسلاویہ کے ٹیٹو کو سوچیں۔مغرب کا ماضی قریب بھی طاقتور آمروں اور پجاری عوام سے بھرا ہے۔فرانسسکو فرینکو، اینٹونیو سالزر، بینیٹو مسولینی اور ایڈلف ہٹلر ایک دور میں اپنے ملکوں کے وسیع حلقوں کے محبوب تھے۔ وسیع تناظر میں، اگرچہ مغرب صدیوں سے زیادہ ترقی پسند اور آزاد خیال رہا ہے، ہزار ہا برس تک اس میں بھی مضبوط مرد مرکزی نظام تھا۔ چند صدیاں قبل تک عورتیں مردوں کی ملکیت شمار ہوتی تھیں۔لیکن جب مغرب نے ترقی کی اور بعض غیر مغربی خطے بھی اس کے پیچھے چلے— خصوصاً گزشتہ 50 برس میں— عرب قدیم سیاسی اور سماجی نظام میں اٹک کر رہ گیا۔عرب سیاست ثقافتی حوالے سے انوکھی نہیں؛ یہ محض وقت کے بھنور میں پھنس گئی ہے۔

20ویں صدی کے وسط کے عالمِ عرب، یورپ کی نوآبادیاتی سلطنتوں سے نیا آزاد ہوا تھا، پر نظر ڈالی جائے تو اس کے سفید ہاتھی بننے کے بارے میں کسی نے نہ سوچا ہو گا۔دوسرے ایشیائی ممالک، جیسے کہ جنوبی کوریا یا ملائیشیا، آج سے قبل کہیں زیادہ بری حالت میں تھے، نے اچھی کارکردگی دکھائی ہے۔1945ء میں شاید ہی کسی نے ان نتائج کی پیشگوئی کی ہوگی۔ آج کے بیشتر مشاہدہ کاروں نے غور کیا کہ، نوآبادیاتی نظام سے آزاد ہونے والے دوسرے ممالک کی نسبت ،عرب اچھا کر رہے تھے۔بیروت، دمشق، قاہرہ اور بغداد زیادہ مہذب، زیادہ تجارتی اور زیادہ ترقی پسند تھے ،بیشتر ایشیائی اورافریقی دارالحکومتوں کے۔یہ بات سمجھ آتی ہے۔آخر عربوں کا تعلق عظیم تہذیب سے ہے، جو سائنس، فلسفہ اور عسکری کامیابیوں کی طویل تاریخ رکھتی ہے۔انہوں نے الجبراء ایجاد کیا، ارسطو کو محفوظ کیا، جب وہ مغرب میں فراموش ہو چکا تھا، اور وقت کی عظیم طاقتوں سے جنگیں جیتیں۔اسلامی

فنون اور ثقافت عروج پر تھے، جب یورپ عہدِ تاریک میں تھا۔

1940ء اور 50 کی دہائی میں عالمِ عرب کو امید تھی کہ یہ اپنا کھویا ہوا وقار بحال کر لے گا۔ اس عرصے میں، اگرچہ ان ملکوں میں مغرب سے مابعد نوآبادیاتی شکوک تھے، لیکن ہمیشہ امریکہ سے رجوع کیا۔ مصر کے مشہور ترین صحافی محمد ہیکل نے وضاحت کی، ''امریکہ کا مجموعی تاثر۔۔۔ بہت رنگین تھا۔ برطانیہ اور فرانس دھندلاتی اور نفرت زدہ حکومتیں تھیں۔ سوویت یونین 5 ہزار میل دور اور اشتراکیت اسلام کے لیے زہر قاتل تھا۔ لیکن امریکہ دوسری عالمی جنگ کے بعد زیادہ دولت مند، طاقتور اور پرکشش بن کر سامنے آیا (9)۔'' اس نئی اشرافیہ کا مذہب کی طرف رجحان بہت جدت پسند اور آزاد خیال تھا۔ 1956ء میں عرب دانشور اسحاق حسینی ''ماہنامہ اٹلانٹک'' کے لیے سروے میں لکھ سکتا تھا، ''آج اسلام اس مقام کی طرف بڑھ رہا ہے جو مغربی سے ملتی جلتی ہے، مذہب اور ریاست کی علیحدگی۔'' تاہم اب یہ بات عجیب لگے گی، یہ زمانے کی روایتی سوچ کی ٹھیک ٹھیک نمائندگی تھی۔

اس وقت سے لیکر آج تک کچھ ہوا۔ عرب دنیا کے حالیہ بحران کو سمجھنے کیلئے ہمیں نیچے کی طرف چلتے اس چکر کو جاننا ہوگا۔ ہمیں گزشتہ 4 سو برس نہیں صرف 40 برس میں ایک غوطہ لگانا ہے۔

سیاست کی ناکامی

1950ء کی دہائی کے آخر میں مصر میں جمال عبدالناصر کے اقتدار میں آنے پر عرب دنیا میں جو ولولہ پیدا ہوا اسے بیان کرنا مشکل ہے۔ کئی عشروں سے عرب نوآبادیاتی گورنروں اور سال خوردہ بادشاہوں کے زیرِ نگیں تھے۔ اب وہ آزادی کے خواب کی تعبیر پا رہے تھے، ناصر انکا نیا مسیحا تھا، مابعد جنگ کیلئے جدید آدمی۔ وہ برطانوی حکومت میں پیدا ہوا تھا، اسکندریہ میں، کثیر النسلی شہر جو عرب سے زیادہ رومی تھا۔ اس کے تشکیلی برس فوج میں گزرے تھے، مصری سماج کا مغرب زدہ ترین حصہ تھا۔ نفیس سلے ہوئے سوٹ اور نئی طرز کے کالی عینک کیساتھ، عالمی منظر پر جرأت مندانہ شخص سمجھا جاتا تھا۔ ''مصر کا شیر'' سارے عربوں کی ترجمانی کرتا تھا۔

ناصر کا خیال تھا کہ عرب سیاست کو حق خودارادیت، سوشلزم اور عرب اتحاد جیسے

نظریات سے گرمانے کی ضرورت ہے۔ یہ جدید تصورات تھے؛ مغربی تھے۔ تیسری دنیا کے بیشتر معاصر رہنماؤں کی طرح ناصر برطانوی ''نیوسٹیٹس مین'' شوق سے پڑھتا تھا۔ 1962ء میں اسکا ''نیشنل چارٹر'' پیرس یا لندن میں بائیں بازو کے کسی دانشور کا لگتا تھا۔ حتیٰ کہ اس کا دلی مقصد، پین عرب ازم، بھی یورپ سے متاثر تھا۔ یہ قوم پرستی کا نیا روپ تھا جس نے پہلے اٹلی اور پھر جرمنی کو 1870ء میں متحد کیا تھا—یہ تصور کہ جو لوگ ایک زبان بولتے ہیں انہیں ایک قوم ہونا چاہیے۔

اس سے پہلے کہ دولت کی چربی خلیجی ریاستوں کو سنہری بطخ میں تبدیل کرتی، مصر مشرق وسطیٰ کا قائد تھا۔ پس ناصر کی سوچ پورے خطے نے اپنا لی۔ ہر حکومت، شام اور عراق میں بعث پارٹی اور جرنیلوں سے لے کر خلیج کی قدامت پرست ریاستوں تک، ایک ہی لب و لہجہ بولنے لگے۔ وہ صرف ناصر کی نقل نہیں کر رہے تھے۔ عالمِ عرب کو جدت پسندی ہر قیمت پر چاہیے تھی، اور اس نے جدیدیت مغربی تصورات اپنانے میں دیکھی۔

اس حوالے سے عرب بیشتر غیر مغربی خطوں جیسا تھا۔ مغرب کا عروج دیکھنے پر، پیچھے رہ جانے والی تہذیبیں— چین، ہندوستان اور عثمانی سلطنت— سوچنے لگے کہ اس کے برابر کیونکر پہنچا جا سکتا ہے۔ جدید تاریخ کے بیشتر دور میں اسلامی اشرافیہ ایسا کرنے کیلئے سب سے زیادہ بے تاب تھے۔ ویانا سے باہر 1683ء میں عثمانی سلطنت کی شکست کے بعد عربوں کو احساس ہوا کہ انہیں مغرب سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ جب مغرب نے عرب کی سرزمین پر قدم رکھے، 1798ء میں نپولین کی فتحِ مصر کی صورت میں، مقامی آبادی اس طاقتور تہذیب میں بہت کشش محسوس کرنے لگے۔ جیسا کہ مورخ البرٹ ہورانی نے اپنی دستاویزات میں لکھا، 18 ویں اور 19 ویں صدی نے یورپ سے متاثرہ آزاد خیال سیاسی اور سماجی نظریات کو مشرق وسطیٰ میں پھلتے پھولتے دیکھا۔

19 ویں صدی کے اختتام اور 20 ویں صدی کے آغاز کا نوآبادیاتی عہد نے برطانیہ کے ساتھ دوستی کی امیدیں بڑھائیں جنہیں ناکام ہونا تھا، لیکن عرب اشرافیہ مغرب سے مرعوب رہی۔ مستقبل کے فرمانروا اور جرنیل اسکندریہ کے وکٹوریہ کالج پڑھتے، تقریر اور انگریزی باؤ بننے کے آداب سیکھا کرتے۔ بہت سے آگے آکسفورڈ، کیمبرج یا سینڈ ہرسٹ چلے جاتے---ایک روایت جو اردن کے شاہی خاندان میں آج بھی قائم ہے، اگرچہ اب

وہ امریکی سکولوں میں جاتے ہیں۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد عالمِ عرب میں آزاد خیال نسل کی جھلک دکھائی دی، جبکہ مصر، لبنان، عراق اور شام میں سیاست اور سماج کو آزاد کرنے کے خیالات نے رواج پائے۔ شاہوں کے آزاد خیال ناقدین اور ارسٹوکریٹ پرانی حکومتوں کے ساتھ ہی بہہ گئے۔ عسکری جمہوریت، ریاستی سوشلزم اور عرب قوم پرستی کا جدید اور کمتر فلسفہ رواج پانے لگا۔ یہ تمام نظریات، اگرچہ، بنیادی طور پر مغربی تھے؛ بعثی اور ناصری سوٹ پہنتے اور اپنے ملکوں کو جدید کرنا چاہتے تھے۔

عالمِ عرب کی نئی سیاست اور پالیسیاں کہیں بھی نہ پہنچ پائیں۔ پوری توانائیاں لگا کر عرب ریاستوں نے غلط نظریات کا انتخاب کیا اور انہیں بدترین طریقے سے نافذ کیا۔ سوشلزم نے افسر شاہی اور جمود پیدا کیا۔ مرکزی منصوبہ سازی کی کوتاہیوں سے سمجھوتہ کرنے کی بجائے معیشت آگے نہ بڑھی۔ جمہوریت کی طرف بڑھنے کی بجائے، ری پبلکیں آمریت میں جکڑی گئیں۔ تیسری دنیا کی ''غیر جانبداری'' سوویت یونین کے پروپیگنڈہ میں بدل گئی۔ جیسے جیسے ممالک پر اپنے مفادات اور مواقعوں کا انکشاف ہوا عرب اتحاد میں دراڑیں پڑنے اور لڑکھڑانے لگی۔ مغرب کے حامی شہنشاہوں (خلیجی ریاستیں اور اردن) اور انقلابی جرنیلوں (شام، عراق) کے درمیان ایک ''سرد جنگ'' چھڑ گئی۔ بدترین ہوا، اسرائیل نے عربوں کو میدان جنگ میں ذلت آمیز شکستوں سے دوچار کیا۔ 1967ء میں ان کی سبک رفتار اور حیران کن شکست، کسی حد تک ایک نیا موڑ تھا، یہ بتا رہا تھا کہ گرم جوش تقریروں اور نعروں کے پیچھے ناکام ہوتی ہوئی ریاستیں ہیں۔ 1990ء میں صدام حسین نے کویت پر حملہ کیا تو اس نے عرب اتحاد کی آخری یادگار بھی تہس نہس کر دی۔

تب سے حالات بدتر ہوئے ہیں۔ مصر پر نظر دوڑائیں۔ ناصریت کے وعدے ڈراؤنے خواب میں بدل گئے ہیں۔ حکومت صرف ایک کام میں تیز ہے: اختلاف رائے کو دبانا اور سول سوسائٹی کا گلا گھوٹنا۔ فواد عجمی، لبنانی نژاد امریکی دانشور، ماتم کیا ہے کہ مصر، جو دانشوروں کا گڑھ تھا، اب صرف 375 کتابیں سالانہ پیدا کرتا ہے، مقابلتاً اسرائیل کی چار ہزار کتابوں کے، جسکی آبادی مصر کے دسویں حصے کے برابر ہے۔ عجمی شارح کریم آہوی کا حوالہ دیتا ہے، جس نے خبردار کیا تھا ''جدیدیت کا لازمہ جو 1800ء کی ابتدا سے مصر پر غالب ہے اور اسے آگے بڑھا رہا ہے، یورپ کے ساتھ اسکے ٹاکرے کے بعد، الٹی سمت میں چلنے لگا

ہے(10)۔"

حیران کن ہے، مصر اپنے ہمسایہ عرب ممالک سے کہیں بہتر ہے۔ شام دنیا کی استحصالی ترین پولیس ریاست بن چکا ہے، ایسا ملک جہاں 30 ہزار افراد کو بغیر کسی خوف کے قتل کئے جا سکتے ہیں، جیسا کہ 1982ء میں شہر ہم میں ہوا۔ (یہ وہ ملک ہے جسکا دارالحکومت، دمشق، دنیا کا قدیم ترین مسلسل آباد شہر ہے۔) تیس برس میں عراق عرب خطے کا سیکولر ترین ملک ہونے سے پرے چلا گیا ہے--- جہاں عورتیں کام کرتی تھیں، فنکاروں کی فروانی تھی اور صحافی لکھتے تھے--- اورانتہا پسند بن گیا۔ جدید آمروں میں صدام حسین واحد شخص ہیں جنہوں نے اپنے ہی لوگوں (عراقی کرد) کے خلاف کیمیائی ہتھیار استعمال کئے۔ لبنان، متنوع، کثیر النسلی سماج جس کا دارالحکومت بیروت، جسے کسی دور میں "مشرق کا پیرس" کہتے تھے، ہے، نے خود کو جنگ اور دہشتگردی میں گرالیا جہاں سے اب وہ دوبارہ ابھر رہا ہے۔

ان تمام ممالک کا ماضی آمرانہ ہے، مگر گزشتہ چند عشروں سے روایتی آمریت نے اختیار کی نئی ٹیکنالوجی اور طریقے ایجاد کیے ہیں تا کہ ایسی حکومتیں پیدا کی جا سکیں جو ان سماجوں کے ہر پہلو پر گرفت رکھتی ہوں۔ جیسا کہ اسلام کے مورخ برنارڈ لوئیس نے نشاندہی کی، عصر حاضر کے آمر قدیم دور کے شہنشاہوں سے کہیں زیادہ با اختیار ہیں، جیسا سولہویں صدی کا عظیم عثمان سلیمان یا آٹھویں صدی کا خلیفہ ہارون الرشید (جو الف لیلیٰ و لیل میں امر ہوا)۔ شیوخ کی خلیجی ریاستیں، مثال کے طور پر، جو کسی زمانے میں بے تکلف بدوی انداز میں حکومت کرتی تھیں ان بادشاہوں کے ذریعے جنہیں اپنی بدو عوام پر بہت کم اختیار تھا، اب دولت مند ریاستیں ہیں جو اپنی دولت کو پولیس، فوج اور جاسوسی ادارے بنانے میں استعمال کرتی ہیں، جو ان کی عوام پر گرفت مضبوط کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ امیر خلیجی ریاستوں میں وہ اضطراب اور غصہ دیکھا جا سکتا ہے جو اس عوام کا ہے جسے دولت تو حاصل ہے لیکن آواز نہیں دی گئی--- ایک سنہرے پنجرے میں قید ہیں۔ بیشتر امریکیوں کا خیال ہے کہ عربوں کو خلیج کی جنگ میں امریکی مداخلت پر اس کا شکر گزار ہونا چاہئے جس نے کویت اور سعودی عرب کو بچایا۔ تاہم، بیشتر عربوں کا خیال ہے کہ امریکہ نے کویت اور سعودی عرب کے شاہی خاندانوں کو بچایا--- بہت بڑا فرق ہے۔

1980ء کے عشرے کے اختتام تک جب ساری دنیا ماسکو سے پیرا گوئے اور سیول

سے جوہانسرگ تک پرانی حکومتوں میں دراڑیں پڑتے دیکھتی تھی، عرب اپنے کرپٹ آمروں اور بوڑھے بادشاہوں سے اٹکے تھے۔ 60ء کی دہائی میں جو حکومتیں مستحکم نظر آ سکتی تھیں آج تھکی ماندی، انتہائی غیر مقبول اور بلا جواز ہیں۔ عالمی نظام کے ناقابلِ حد تک الٹا چلنے سے، آج کا تقریباً ہر عرب ملک 40 برس پیشتر سے کم آزاد ہے۔ دنیا میں چند اور ایسی جگہیں ہیں جن کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے۔

معاشیات کی ناکامی

11 ستمبر 2001ء کے بعد یونیورسٹیوں اور تھنک ٹینکس نے جتنے سیمینار منعقد کیے، ان میں سنجیدہ اور باشعور نظر آنے کی کوشش میں ہر مقرر نپے تلے الفاظ میں کہتا ہے، ''ہمیں صرف دہشتگردی سے نہیں اسکے اسباب سے بھی مقابلہ کرنا ہے۔'' اس بناوٹ کے فوراً بعد مسلمان مملکوں سے غربت ختم کرنے کیلئے مارشل پلان تجویز کیا جاتا ہے۔ غربت کے خاتمے پر کون متفق نہیں ہوگا؟ لیکن ان تشخیصوں کیساتھ مسئلہ ہے کہ ایک بڑی حقیقت نظر انداز کر دی جاتی ہے: القاعدہ نیٹ ورک غریب اور محروم افراد کا گروہ نہیں۔

اسکے اوپری طبقے کے بارے میں یہ بات بالکل درست ہے؛ بن لادن اس خاندان میں پیدا ہوئے جن کے اثاثے 5 ارب ڈالرز کے لگ بھگ ہیں۔ لیکن یہ انکے قریبی ساتھیوں کیلئے بھی درست ہے؛ جیسے کہ الظواہری، قاہرہ کے سابق سرجن، جو مصری معاشرے کے اعلیٰ طبقے سے ہیں۔ ان کے والد قاہرہ یونیورسٹی کے ممتاز پروفیسر، دادا جامعہ الاظہر (عالم عرب میں اسلام کے مرکزی دھارے کا اہم ترین مرکز) کے امام تھے، چچا عرب لیگ کے پہلے سکریٹری جنرل تھے۔ ان سے نیچے محمد عطا، ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں ٹکرانے والے پہلے جہاز کا پائلٹ، کو دیکھیں۔ ایک جدید--- اور معتدل مزاج--- مصری خاندان سے تھا۔ والد وکیل تھے۔ دو بہنوں تھیں، ایک پروفیسر اور دوسری ڈاکٹر۔ عطا خود بھی ہیمبرگ میں ہی پڑھا تھا، جیسا کہ دوسرے دہشتگرد تھے۔ حتیٰ کہ القاعدہ کے نچلے درجوں کے زیرِ تربیت نوجوان بھی پڑھے لکھے اور متوسط گھرانوں سے لگتے ہیں، متوسط طبقہ کے لوگ۔ اس حوالے سے جان واکر، کیلیفورنیا کا بچہ جو امریکی زندگی سے نکل کر طالبان میں شامل ہو گیا، بھی اپنے ساتھی بنیاد پرستوں سے مختلف نہیں۔ دراصل انجینئرنگ ڈگریوں کی نسبتاً اسے کم تعلیم یافتہ کہا

جا سکتا ہے۔

دراصل دہشتگردوں کی نرسری وہ علاقے ثابت ہوئے ہیں جو گذشتہ 30 برسوں میں دولت کی ریل پیل دیکھتے رہے ہیں۔ چار جہازوں کے 19 ہائی جیکر جنہیں 11 ستمبر حملوں میں استعمال کیا گیا، میں سے 15 سعودی عرب سے تھے، تیل کا سب سے بڑا برآمد کنندہ ہے۔ اسلیے بہت کم امکان ہے انکے غصے کی بنیاد غربت تھی۔ مصر--- القاعدہ کو پالنے والا دوسرا بڑا ملک — بین الاقوامی معیار سے غریب ملک نہیں۔ اس کی فی کس آمدنی 3690 ڈالر اسے متوسط درجے میں شمار کراتی ہے اور یہ گزشتہ دہائی سے 5 فیصد سالانہ کی معقول شرح سے ترقی کر رہی ہے۔ آبادی میں اضافے کی شرح شمار کی جائے تو شاید یہ کافی نہ لگے--- آبادی بڑھنے کی شرح 3 فیصد سالانہ ہے-- لیکن بہت سے ممالک کہیں زیادہ بری حالت میں ہیں۔ لیکن پھر بھی انہوں نے ایسے لوگوں کے ہجوم پیدا نہیں کئے جو جہاز مین ہیٹن کی فلک بوس عمارتوں میں ٹکرانے پر تیار ہوں۔ اگر غربت ہی دہشتگردی کا سرچشمہ ہے، زیرِ تربیت لوگوں کا تعلق افریقہ یا جنوبی ایشیا سے ہونا چاہیے، مشرقِ وسطیٰ سے نہیں۔

صرف عدم مساوات بھی اس کی توجیہہ نہیں کر سکتی۔ کسی ملک میں آمدنی میں عدم توازن ناپنے کے طریقہ کو ''جنی انڈیکس (Gini Index)'' کہا جاتا ہے۔ نیچے کی طرف جنی انڈیکس بہتر ہے؛ برازیل کا 60 ہے، بیلجیم کا 25 اور مصر کا 28.9، لاطینی امریکہ کے تقریباً تمام ملکوں اور دوسرے ترقی پذیر ملکوں سے بھی کم۔ دراصل اس میں فرانس کی نسبت آمدنی کی تقسیم زیادہ ہے، جو 32.7 پر ہے۔ مصر کی 30 فیصد آبادی کل آمدنی میں 64 فیصد حصہ ڈالتا ہے؛ فرانس میں 30 فیصد کل قومی آمدنی کے 65 فیصد کا شریک ہے۔ جبکہ مصر میں نچلا 30 فیصد کل قومی آمدنی میں 14.2 حصہ ڈالتا ہے؛ جبکہ فرانس میں اسی کے برابر نچلا طبقہ صرف 10 فیصد کا شریک ہے۔ خلیجی ریاستیں، جو اسطرح کے اعدادوشمار جاری نہیں کرتیں، میں غالباً عدم توازن کی شرح زیادہ ہے لیکن اس سطح پر نہیں ہے جس قدر، مثلاً برازیل، کولمبیا اور نائیجریا میں۔

تاہم، عرب دنیا کو درپیش بحران کا ایک معاشی پہلو ضرور ہے۔ مسئلہ دولت ہے غربت نہیں۔ دوسرے باب میں ہم نے دیکھا کہ کیسے حکومتیں، جو قدرتی وسائل سے امیر ہوتی ہیں آگے بڑھنے، جدید ہونے یا جواز حاصل کرنے کی طرف رجحان نہیں رکھتیں۔ عالم عرب

ٹرسٹ فنڈ ریاستوں کے نظریہ کی سچی مثال ہے۔ یہ بات درست ہے، صرف تیل کے بڑے برآمد کنندگان کے لیے نہیں۔ مصر کو دیکھئے، چھوٹا مگر تیل اور گیس کا اہم برآمد کنندہ ہے۔ یہ دو ارب ڈالر سالانہ راہدری لیتا ہے، نہر سویز سے گزرنے والے جہازوں سے اور امریکہ سے 2.2 ارب ڈالر سالانہ امداد لیتا ہے۔ مزید برآں، اسے بڑی مقدار میں رقم زرِ مبادلہ--- جو پیسہ گھر بھیجا جاتا ہے--- کی صورت میں خلیجی ریاستوں میں کام کرنے والے مصری بھیجتے ہیں۔ لہٰذا، مجموعی طور پر یہ اپنی کل قومی پیداوار کی خاصی رقم بغیر محنت کے کماتا ہے۔ یا اردن پر غور کریں، ترقی پسند اور آزاد خیال ہوتا ہوا: یہ ایک ارب ڈالر سالانہ امریکہ سے امداد لیتا ہے۔ اگرچہ یہ مقدار کم محسوس ہوسکتی ہے، یہ دیکھ کر کہ اردن کی کل قومی آمدنی صرف 17 ارب ڈالر ہے۔ اسکی سالانہ آمدنی کا کم و بیش 6 فیصد ایک ہی ملک سے امداد پر مشتمل ہے۔

آسان دولت کا مطلب ہے کم معاشی یا سیاسی جدت۔ بنا کمائی آمدنی حکومت کو اس پریشانی سے آزاد کر دیتی ہے کہ وہ عوام پر ٹیکس عائد کرے--- اور بدلے میں انہیں کچھ دے، احتساب، نظام کی شفافیت حتیٰ کہ نمائندگی (12)۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ٹیکس لگانے کی ضرورت حکومت کو عوامی ضروریات کی طرف ردِعمل ظاہر کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ مشرق وسطیٰ کی حکومتیں عوام سے کم مطالبات کرتی ہیں اور بدلے میں کم ہی دیتی ہیں۔ قدرتی وسائل سے حاصل ہونے والی آمدنی کا ایک اور نقصان حکومت کا اس قدر دولتمند ہو جانا ہے کہ استحصالی ہو جاتی ہے۔ پولیس اور فوج کے لیے کافی وسائل دستیاب رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر سعودی عرب، کل قومی پیداوار کا 13 فیصد فوج پر خرچ کرتا ہے، اومان کی طرح۔ کویت 8 فیصد کرتا ہے۔ متعدد اندازوں کے مطابق خلیج کی جنگ سے قبل عراق اس ضمن میں 25 سے 40 فیصد رقم کرتا رہا ہے، غیر معمولی زیادہ شرح یقیناً ایک تو ایران عراق جنگ کے باعث تھی بلکہ بڑے پیمانے پر داخلی جاسوسی نظام کی وجہ سے بھی تھا جو صدام حسین اور بعث پارٹی نے قائم کر رکھا تھا۔

بہت برسوں تک تیل سے امیر مما لک مے کہا جاتا رہا کہ ان کی بے انتہا دولت ہی جدیدیت لائے گی۔ ان کا اشارہ عربوں کی مغربی اشیا کے لئے بھوک کی طرف تھا، میکڈونلڈ کے ہیم برگرز سے رولیکس گھڑیوں سے کیڈلک کاروں تک۔ مغربی اشیا درآمد کرنا آسان ہے؛ جدید سماج کا اندرونی سامان--- آزاد منڈی، سیاسی جماعتیں، احتساب، قانون کی

حاکمیت--- مشکل حتیٰ کہ حکمران طبقے کے لیے یہ زہر قاتل ہے۔ مثال کے طور پر، خلیجی ریاستوں نے جدیدیت کا انتہائی بھونڈا تصور اپنایا ہے، اشیا بلکہ افرادی قوت تک باہر سے منگوائی جاتی ہے۔ ان کی جدیدیت بہت تھوڑی اپنی پیدا کردہ ہے؛ اگر کل تیل ختم ہو جائے تو ان کے پاس دہائیوں پر مشتمل دولت کے بدلے، غالباً، دکھانے کے لئے کچھ نہیں ہوگا، ماسوائے حد سے بڑھی ہوئی عیاشی کی عادتوں کے۔

مغربیت کا خوف

تقریباً دس برس قبل، ایک معمر عرب دانشور سے غیر رسمی گفتگو کے دوران، میں نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا کہ مشرق وسطیٰ کی حکومتیں معیشت اور سماج کو اسطرح آزاد کرنے میں ناکام رہی تھیں جیسے مشرقی ایشیا کی حکومتوں نے کیا۔ ''ہانگ کانگ، سنگاپور اور سیئول کی طرف دیکھیں''، میں انکی غیر معمولی معاشی کامیابیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ صاحب، نرم مزاج، پرکشش، فاضل اور مغرب حمایتی صحافی سیدھے ہوگئے اور تیزی سے مجھے جواب دیا، ''ان کی طرف دیکھیں۔ انہوں نے صرف مغرب کی نقل کی ہے۔ انکے شہر ہویسٹن اور ڈلاس کی سستی نقل ہیں۔ یہ مچھیروں کے دیہاتوں کیلئے تو درست ہوسکتا ہے، مگر ہم دنیا کی عظیم ترین تہذیبوں میں سے ایک کے وارث ہیں۔ ہم مغرب کی جھونپڑیاں نہیں بن سکتے۔''

فخر اور شکست کا احساس عرب مسائل کی جڑ ہے۔ یہ معاشی ترقی ناممکن بنا دیتی ہے اور سیاسی پیش قدمی بھی مشکلات میں گھر جاتی ہے۔ امریکہ جدیدیت کو خیر کل خیال کرتا ہے— اور یہ اسکے لئے ثابت بھی ہوئی ہے۔ لیکن عالم عرب کیلئے یہ ایک ناکامی سے دوسری ناکامی ہے۔ جس راستے پر چلا جائے --- سوشلزم، سیکولرازم، نیشنلزم--- بند گلی میں بدل جاتا ہے۔ اکثر لوگ سوچتے ہیں کہ عرب سیکولرازم کیوں نہیں آزمائیں گے۔ دراصل، گزشتہ صدی کے دوران، ان میں سے بیشتر عرب ریاستوں نے اسے آزمایا۔ اب لوگ حکومتوں کی ناکامی کو سیکولرازم اور مغربی انداز حکومت کی ناکامی کیساتھ جوڑتے ہیں۔ عالم عرب نے اس وقت مغرب سے آنکھیں کھولیں ہیں جب انہیں اپنے حکمرانوں کے فریب سے نکلنا چاہیے تھا۔

نئی اور تیز گلوبلائزیشن جو1990ء کے عشرے میں اٹھی، عالم عرب سے عجیب

انداز میں ٹکرائی ہے۔اسکے سماج اس قدر کھلے ہیں کہ جدیدیت سے منتشر ہوجائیں،لیکن اس قدر کھلےنہیں کہ اس لہر پر قابو پائیں۔عرب ٹی وی دیکھتے ہیں، فاسٹ فوڈ کھاتے ہیں اورسوڈا پیتے ہیں،لیکن اپنے سماجوں میں حقیقی آزادخیالی نہیں دیکھ پاتے،جن میں زیادہ مواقع اور کھلا پن ہو۔ یہ معاشی مواقع بھی نہیں دیکھتے،وہی اعلیٰ طبقہ حالات پر اختیار رکھے ہوئے ہے۔عرب دنیا میں گلوبلائزیشن ایک ناقد کیلئے گلوبلائزیشن کی مضحکہ خیز تصویر ہے،مغربی اشیااور اشتہاروں کی بہتات اور اسکے علاوہ بہت تھوڑا۔عرب سماجوں کے اعلیٰ طبقہ کیلئے یہ زیادہ خریداری سے آگے کچھ نہیں۔لیکن ان میں سے کچھ کیلئے یہ پریشان کن بھی ہے جوان کے مرکزِ اقتدار کو خطرے میں ڈال سکتا ہے۔

مغرب---جدیدیت کیساتھ---کے ساتھ کشش اور مدافعت کے اس امتزاج نے عالم عرب کو منتشر کر کے رکھ دیا ہے۔نوجوان نسل،اکثر اپنے والدین سے بہتر تعلیم یافتہ،کام کی تلاش میں آبائی گھر چھوڑ دیتے ہیں۔قاہرہ، بیروت،دمشق کے پرشوروہجوم شہروں میں پہنچتے ہیں یا تیل پیدا کرنیوالی ریاستوں کا رخ کرتے ہیں۔(ایک وقت میں مصر کی کام کرنے والی آبادی کا تقریباً10 فیصد حصہ بھی رہا ہے۔) نئی دنیا میں وہ دولت کا وسیع تفاوت اور جدیدیت کے منتشر کر دینے والے اثرات دیکھتے ہیں؛ذہن کو ہلا دینے والا منظر ہوتا ہے،وہ عورتوں کو دیکھتے ہیں، بے پردہ اور سرِ بازار،بسوں پر چڑھتی ہوئیں،ہوٹلوں میں کھاتی ہوئیں اور ان کے ساتھ ساتھ کام کرتے ہوئے۔انکا سامنا جدید زندگی کے تضادات سے ہوتا ہے،نئی دنیا کی دولت کی تلاش مگر روایات اور یقین پرانی دنیا کا۔

گلوبلائزیشن نے آبادیات کے حوالے سے بھی عرب دنیا کو ناخوشگوار حالت میں لا کھڑا کیا ہے۔اسکے سماج نوجوان کی قلت کا شکار ہورہے ہیں؛عالمِ عرب کی نصف سے زائد آبادی25 برس سے کم عمر افراد پر مشتمل ہے۔75 فیصد سعودی عرب30 برس سے کم عمر ہے۔ کم وبیش ہر سماج میں تمام جرائم پندرہ سے20 برس کے لوگ کرتے ہیں۔تمام نوجوانوں کو قید کر دیں، ایک سماجی سائنسدان کہتا ہے، متشدد جرائم 95 فیصد تک گر جائیں گے۔ (اسلیے نوجوانوں کی معاشرتی تربیت---سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور کیمپس میں--- مہذب معاشروں کے لیے ایک بڑا چیلنج رہی ہے۔)اسکے ساتھ اگر اقتصادی اور سماجی تبدیلی چھوٹے پیمانے پر ہو، یہ نوجوان احتجاج کی نئی سیاست شروع کر سکتے ہیں۔ماضی میں،سماج ان

حالات سے دو چار ہو کر انقلاب علاج کی تلاش کرتے رہے ہیں۔ فرانس 1789ء کے انقلاب سے ذرا پہلے نوجوانوں کے اس بحران سے گزرا، جیسا کہ ایران کیساتھ 1979ء کے انقلاب سے پہلے ہوا۔ حتیٰ کہ امریکہ کو بھی اس دباؤ کا سامنا کرنا پڑا جو 1968ء، کساد بازاری کے بعد ملک میں شدید ترین سماجی احتجاج کا دور، میں انتہا پر تھا۔ عالمِ عرب کے معاملے میں، اس اتھل پتھل نے مذہب کی تجدید کا روپ دھارا ہے۔

مذہب کا عروج

ناصر اچھا خاصا پکا مسلمان تھا، لیکن اسے مذہب اور ریاست کو یکجا کرنے میں دلچسپی نہیں تھی، وہ اسے پیچھے کی جانب حرکت تصور کرتا تھا۔ یہ ان چھوٹی اسلامی جماعتوں میں تکلیف دہ حد تک واضح ہو جاتا ہے جنہوں نے ناصر کی اقتدار میں آنے تک مدد کی۔ اہم ترین، اخوان المسلمین، نے 50 کے عشرے کے آغاز میں شدومد اور، اکثر متشدد انداز سے، اسکی مخالفت شروع کر دی۔ ناصر ان پر جھپٹا، ایک ہزار سے زائد رہنماؤں کو قید کر لیا اور 6 کو 1954ء میں ہلاک کروا دیا۔ قید ہونیوالوں میں ایک سید قطب تھے، ناتواں مگر پر تاثیر اہلِ قلم تھے، جنھوں نے دوران قید ایک کتاب ''سائن پوسٹس آن دی روڈ'' لکھی، یہ بعض حوالوں سے جدید سیاسی اسلام یا اسلامی بنیاد پرستی* کا نقطۂ آغاز کہی جا سکتی ہے۔

کتاب میں، سید قطب نے ناصر کو گناہگار مسلمان قرار دیکر، اور حکومت غیر اسلامی قرار دیکر اسکی مذمت کی۔ دراصل، وہ اس سے آگے بڑھے، تقریباً تمام مسلمان حکومتیں اسکی طرح ناکام تھیں۔ قطب نے ایک زیاہ بہتر اور نیک معاشرے کا خواب دیکھا، جو اسلامی اصولوں پر قائم ہو۔ 1880ء سے قدامت پرست مسلمانوں کی بنیادی مقصد (13)۔ جیسے جیسے مشرقِ وسطیٰ کی حکومتیں استحصالی اور ناصر کے بعد کے عشروں میں کھوکھلی ہوتی گئیں، بنیاد پرستوں میں کشش بڑھتی گئی۔ اسکے پھیلنے کیوجہ یہ تھی کہ اخوان المسلمین اور اس جیسی دوسری جماعتوں نے تیزی سے بدلتی دنیا میں لوگوں کو ایک معنی اور زندگی کی بامقصدیت کا احساس دیا تھا، جس طرح مشرقِ وسطیٰ کے کسی لیڈر نے کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اپنی اساسی

*بہت سے حوالوں سے اصل بنیاد پرست قطب کی ہمعصر پاکستانی دانشور ابوالاعلیٰ مودودی ہیں۔ قطب مودودی کے معترف تھے اور ان کی کتب کا عربی میں ترجمہ کیا۔ قطب ہی ہیں جو آج سارے عالمِ عرب میں پڑھے جاتے ہیں۔

کتاب The Arab Predicament میں فواد عجمی عربوں کے سیاسی کلچر کی معذوری بیان کرتے ہیں، ''بنیاد پرستوں کی آواز کی بازگشت اسلیئے سنائی دیتی ہے کہ یہ لوگوں کو شرکت کا احساس دلاتے ہیں . . . (اس کے برعکس) سیاسی کلچر میں جو شہریوں کو تماشائیوں تک محدود کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ سب چیزیں حکمرانوں پر چھوڑ دیں۔ ایسے وقت میں جب مستقبل غیر یقینی ہے یہ انہیں ایسی روایت کے ساتھ جوڑتے ہیں جو ویرانی کو کم کرتی ہے۔''
بنیاد پرستوں نے عربوں، جو اپنے نظام سے غیر مطمئن تھے، ایک زبان دی۔

اس محاذ پر اسلام کا کوئی مقابلہ نہیں ۔عالمِ عرب سیاسی صحرا ہے جسمیں حقیقی سیاسی جماعتیں، آزاد صحافت غیر موجود اور اختلاف رائے کے اظہار کیلئے راستے محدود ہیں۔ نتیجے میں مسجد سیاست پر بحث کیلئے مقام قرار پائی۔ مسلم معاشروں میں پابندی سے مستثنیٰ واحد جگہ ہونے کے ناطے، اسی جگہ حکومتوں کے خلاف نفرت اور اختلاف جمع ہوتا اور آگے بڑھتا۔ ان علاقوں میں حزب اختلاف کی زبان ہی مذہب کی بن جاتی ہے۔ مذہب وسیاست کا یہ ملاپ آتش گیر ثابت ہوا ہے۔ مذہب، کم از کم ابراہیمی روایت (یہودیت' مسیحیت اور اسلام) کا اخلاقی معیار پر زور دیتے ہیں۔ جبکہ سیاست سمجھوتوں کا نام ہے۔ نتیجہ بے رحم اور سیاسی زندگی کی طرف ''جیتنے والے کا سب کچھ'' کا رویہ رہا ہے۔

بنیاد پرست تنظیموں نے صرف باتوں سے زیادہ بھی کیا ہے۔ اخوان المسلمین سے حماس اور حزب اللہ تک، یہ فعال طریقے سے سماجی خدمات، طبی امداد، مشاورت اور عارضی رہائش فراہم کرتی ہیں۔ جو لوگ سول سوسائٹی کی تعریفیں کرتے ہیں، کیلئے یہ منظر پریشان کن ہے کہ مشرق وسطی میں یہ غیر آزاد خیال جماعتیں ہی سول سوسائٹی ہیں۔ شیری برمن، جو یورپ میں فاشسٹ جماعتوں کے عروج پر تحقیق کرتی ہیں، نے ایک دلچسپ موازنہ کیا ہے۔'' فاشسٹ عموماً سماجی خدمات فراہم کرنے میں بہت تیز ہوتے تھے۔''

> ''جب ریاست اور سیاسی جماعتیں زمین بوس ہوتی ہیں، اس میں کہ اپنے ہونے کا جواز یا مقصد یا بنیادی ضروریات مہیا کرنے میں ناکام ہو جائیں تو دوسرے ادارے اس خلا میں آنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اسلامی ممالک میں مذہب حکومت کرنے کا بنا بنایا جواز ہے۔ اسلیے حیران کن نہیں اگر بنیاد پرست گروہ اسی بنیاد پر فروغ پائیں۔ یہ مخصوص صورت ـــ اسلامی بنیاد

پرستی۔۔۔اس خطے کا خاصہ ہے، مگر بنیادی حرکیات نازی ازم، فاشسزم حتیٰ کہ
امریکہ میں عوام پرستی کے عروج سے مشابہہ ہیں۔''

عالمِ اسلام میں بنیاد پرستی کے عروج کی کوئی وجہ ہے تو یہ عرب دنیا میں سیاسی اداروں کی مکمل ناکامی ہے۔

اسلامی بنیاد پرستی کو عروج 1979ء میں حاصل ہوا جب آیت اللہ خمینی نے امریکہ حمایتی شاہ ایران کا تختہ الٹا۔ ایرانی انقلاب نے واضح کیا کہ طاقتور حکمران سماج کے اندورنی گروہوں کا نشانہ بھی بن سکتا ہے۔ اس نے یہ بھی عیاں کر دیا کہ کیسے ترقی پذیر سماج میں بظاہر مفید قوتیں۔۔۔ تعلیم وغیرہ۔۔۔ بھی جلتی پر تیل کر کام کرسکتی ہیں۔ 70ء کے عشرے تک مشرق وسطیٰ کے بیشتر مسلمان ان پڑھ اور دیہاتوں قصبوں میں رہنے والے تھے۔ وہ ایک قسم کے دیہاتی اسلام پر عمل پیرا تھے جس نے مقامی ثقافت اور انسانی ضروریات کے مطابق خود کو ڈھال لیا تھا۔ کثرت پسند اور روادار یہ دیہاتی اور قصبوں کے باسی صوفیوں کی پوجا کرتے ،خانقاہوں پر جاتے ، مذہبی گیت گاتے اور فنون لطیفہ پر خوش ہوتے تھے۔۔۔ تکنیکی لحاظ سے یہ سب اسلام میں ممنوع ہیں۔ 70ء کی دہائی تک، یہ علاقے کو بلدیات میں بدلا جانے لگا۔ لوگوں نے کام کی تلاش میں دیہاتوں سے نکل کر قصبوں اور شہروں کا رخ کرنا شروع کر دیا تھا۔ انکا مذہبی تجربہ مخصوص ماحول اور مقامی ثقافت وروایات سے جڑا ہوا نہیں تھا۔ اسی وقت وہ پڑھنا سیکھ رہے تھے، ان پر انکشاف ہوا کہ مصنفین ، مبلغین اور اساتذہ کی نئی نسل کی طرف سے ایک نئے اسلام کی تبلیغ کی جا رہی تھی۔ یہ مجرد عقیدہ تھا جس کی جڑیں تاریخ میں نہیں تھیں بلکہ لغوی اور بے لچک تھا۔۔۔ ملاؤں کا اسلام، جو گلیوں محلوں کے اسلام کے برعکس تھا۔

ایران میں، آیت اللہ خمینی نے مضبوط ٹیکنالوجی استعمال کی: آڈیو کیسٹ۔ اسوقت بھی جب وہ 70ء کے عشرے میں پیرس میں جلاوطن تھے، ان کے خطابات پورے ایران میں تقسیم کئے جاتے اور شاہ کی استحصالی حکومت کے خلاف نفرت کا سبب بنے۔ لیکن انہوں نے لوگوں کو ایک غصیلہ اور چڑچڑا اسلام سکھایا جس میں مغرب شر ہے، امریکہ ''ابلیس اول'' اور غیر ایمان والوں سے لڑنا ہے۔ خمینی تنہا نہیں تھے جنہوں سیاسی مقاصد کے لئے اسلام کی زبان بولی۔ دانشور، جو غیر پختہ اور غیر معمولی سبک رفتار جدیدیت، جس نے انکی دنیا منتشر کر کے رکھ دی، بھی اس ''مغربیانے'' کیخلاف کتابیں لکھ رہے تھے اور اس جدید ایرانی کو۔۔۔ آدھا

مغربی،آدھا مشرقی۔۔۔''بے جڑ'' کہتے تھے۔فیش ایبل دانشور، لندن اور پیرس کی آسائشوں میں بیٹھ کر لکھنے والے، امریکی سیکولرازم اور صارفیت پر تنقید کرتے اور اسلامی متبادل پیش کرتے تھے۔عرب دنیا میں یہ نظریات پھیلے تو غریبوں کو اس میں کشش محسوس نہ ہوئی، ان کیلئے جدیدیت جادواثر تھی، کیونکہ اس کا مطلب تھا خوراک ودوا۔ بلکہ انہوں نے پڑھے لکھوں کو اپنی طرف کھینچا جو مشرقِ وسطیٰ کے شہروں میں داخل ہو رہے تھے، یا مغرب میں تعلیم اور ملازمت کی تلاش میں تھے۔ اس وقت وہ منتشر اور یہ بات سکھانے کے لئے بالکل تیار تھے کہ ان کا انتشار نئے اور سچے اسلام کی طرف رجوع سے حل ہوسکتا ہے۔

سنی دنیا میں ،اسلامی بنیاد پرستی کو بنانے اور فروغ دینے اس حقیقت کا کردار تھا کہ اسلام مساوات پسند مذہب ہے۔اپنی تاریخ کے بیشتر دور میں یہ آواز ان کیلئے کارآمد ثابت ہوئی جو خود کو سماج میں بے بس اور لاچار سمجھتے تھے۔ اسکا یہ مطلب بھی ہے کہ کسی مسلمان کو اختیار نہیں کہ دوسرے کی ''مسلمانی'' کے بارے میں سوال کرے۔عہد وسطیٰ میں غیر رسمی طور پر طے تھا کہ تربیت یافتہ علماء کی جماعت ایسے معاملات پر حکم لگا سکتی ہے(14)۔لیکن بنیاد پرست مفکرین، پاکستان کے مولانا مودودی سے لیکر مولانا قطب اور انکے پیروکاروں تک، نے اس معاملے پر بہت کھینچا تانی کی۔ انہوں نے علی الاعلان اور مسلسل یہ حکم جاری کئے ہیں کہ آیا لوگ ''اچھے مسلمان'' ہیں یا نہیں۔ دراصل انہوں نے ان کو رد کر دیا جن کا اسلام ان سے متصادم تھا۔اس عمل نے اسلامی دنیا کو دہشت زدہ کر دیا۔لیڈر اسلام پسندوں کی اٹھتی ہوئی لہروں پر بند باندھنے کی جرأت نہ کرتے۔ دانشور اور سماجی اشرافیہ، حکومتی پالیسیوں کی غلامانہ حمایت کر کے پہلے ہی مقبولیت کھو چکے تھے، بھی حقیقی آزاد ملائیت کی بات کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔نتیجہ یہ نکلا، اعتدال پسند مسلمان بنیاد پرستوں پر تنقید کرنے یا انہیں جھٹلانے سے ہچکچانے لگے۔شمالی آئر لینڈ کے اعتدال پسندوں کیطرح، بعض اپنی حفاظت سے فکرمند تھے اگر وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے۔حتیٰ کہ نوگیب محفوظ جیسی محترم شخصیت بھی اسلام پسندوں پر ہلکی سی تنقید پر خنجروں کی زد میں آیا۔ بہت سے لوگوں نے خاموشی میں ہی عافیت جانی۔ میں نے ہندوستان، جہاں میں پلا بڑھا، میں یہ تبدیلی دیکھی۔ میرے بچپن کا رنگین، کثرت پسند اور نرم مزاج اسلام جوانی تک سخت گیر اور ملا پرست بن چکا تھا۔

یہ بات خلیج فارس کی اعتدال ریاستوں ،خصوصاً سعودی عرب، کے علاوہ کہیں بھی اسقدر درست نہیں۔سعودی حکومت نے خطرناک کھیل کھیلا :اس نے اپنی معاشی اور سیاسی ناکامیوں سے توجہ ہٹانے کیلئے انتہا پسند ملاؤں کو کھیل کھیلنے کا موقعہ فراہم کیا ہے کہ اس امید پر کہ ان سے تعلق پر انکی حکومت کو جواز مل جائے گا۔سعودی عرب کا تعلیمی نظام بھی قرونِ وسطیٰ کے خیالات کے مذہبی افسر چلاتے ہیں۔گزشتہ تین عشروں سے سعودی امراء۔۔۔اکثر پرائیوٹ ٹرسٹ کے ذریعے۔۔۔نے مدرسہ اور ایسے مراکز کو رقوم دی ہیں جنہوں نے ساری دنیا میں وہابیت پھیلائی۔گذشتہ تیس برسوں میں سعودی پیسوں سے چلنے والے مدرسوں نے لاکھوں کی تعداد میں نیم تعلیم یافتہ ،انتہا پسند مسلمان پیدا کیے ہیں جو جدید دنیا اور غیر مسلموں کو مشکوک دیکھتے ہیں۔دنیا کے اس منظرنامے میں امریکہ تقریباً ہمیشہ شر قرار پایا ہے۔

اس درآمدی بنیاد پرستی نے نہ صرف ہمسایہ عرب سماجوں کو متاثر کیا ہے بلکہ باہر کے مما لک بھی اس کی زدآئے ۔ یہ اپنے ساتھ مخصوص مقامی عرب سیاسی منصوبہ بھی لے جاتا ہے۔پس،انڈونیشیائی مسلمان ،جو آج سے بیس برس قبل بے خبر تھے کہ فلسطین کہاں ہے،آج اسکی حمایت میں اسلحہ اٹھائے ہوئے ہیں۔عرب اثرات حتیٰ کہ فنِ تعمیر میں بھی نظر آتا ہے۔اپنی عمارتوں میں عالمِ اسلام نے مقامی انداز۔۔۔ہندو، جاوا یا روسی وغیرہ۔۔۔کیساتھ عرب فن تعمیر کو شامل کیا ہے۔لیکن انڈونیشیا اور ملائیشیا جیسے مما لک میں مقامی ثقافت کو نظرانداز کیا جارہا ہے، کیونکہ انہیں ناکافی طور پر غیر اسلامی (یعنی عرب) تصور کیا جاتا ہے۔

پاکستان کو درآمدی بنیاد پرستی کا کافی تلخ تجربہ ہے۔80ء کے عشرے میں جنرل ضیا الحق نے اپنے 11 سالہ اقتدار میں، فیصلہ کیا کہ انہیں حلیف درکار ہیں، کیونکہ سیاسی جماعتوں اور حزبِ اختلاف کو کچل دیا تھا۔اس نے یہ مقامی بنیاد پرستوں میں حاصل کر لئے، جو اسکے حلیف بن گئے ۔سعودی امراء اور منتظموں کی مدد سے،اس نے ملک میں لاتعداد مدرسے قائم کر دیئے۔افغان جنگ نے مذہبی دیوانوں کو اپنی طرف کھینچا، اشتراکیت کے کفر سے لڑنے کے لیے بے چین تھے۔ یہ بیشتر ''جہادی'' سعودی عرب سے آئے تھے۔سعودی دولت اور افرادی قوت کے بغیر، طالبان نہ ہوتے نہ ہی پاکستان بنیاد پرستوں کی جنت ہوتا جیسا کہ آج ہے۔ضیاء کی اسلام پسندی نے ان کی حکومت کو ایک جواز دیا،لیکن اس نے پاکستان کا سماجی تانا بانا ادھیڑ دیا۔ آج پاکستان مسلح بنیاد پرستوں سے بھرا پڑا ہے، جنہوں نے پہلے

طالبان کا ساتھ دیا، پھر کشمیر کی تحریک میں مل گئے اوراب جنرل پرویز مشرف کی سیکولر حکومت کو نیچا دکھانے میں لگے ہیں۔ انہوں نے قانونی اور سیاسی نظام کو بھی ارتداد، عورتوں کی ماتحتی اور جدید بنکاری کی برائیوں جیسے پرانے قوانین سے آلودہ کرر کھا ہے۔

پاکستان اکیلا نہیں ہے۔ اسی قسم کا عمل یمن، انڈونیشیا اور فلپائن جیسے مختلف النوع کثرت پسند ممالک میں بھی جاری وساری ہے۔ 80ء اور 90ء کے عشروں میں مشرق وسطیٰ کی دو بڑی مسلمان ریاستوں — ایران اور سعودی عرب--- کے مابین ایک مقابلہ شروع ہو گیا، کہ کون عالم اسلام میں بڑی قوت ہے۔ نتیجے میں، جو کسی دور میں چھوٹے اور اسلام کے انتہا پسندانہ رجحانات تھے، مشرقِ وسطیٰ کے کچھ علاقوں تک محدود تھے، ساری دنیا میں جڑیں پکڑنے لگے--- بنیاد پرست اسلام کی گلوبلائزیشن کے عمل میں۔

اسلامی احیاء

اگر مسئلہ عرب خطے کا ہے اسلام نہیں، بعض کے خیال میں اسلام اسکا حل ہے۔ بہت سے مغربیوں اور کچھ مسلمانوں نے دلیل دی ہے کہ اسلام کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ مذہب اور ریاست میں صاف ستھری تقسیم ہے، احیاء کیلئے اسکا اپنا تصور جو اسلام کیلئے وہی کام کرے گا جو اس نے مغرب کیلئے کیا۔ کاہنوں کا گروہ اب یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ عام لوگ کیا کر سکتے ہیں اور کیا نہیں۔ احیائے علوم نے پروہتی طاقت اور اقتدار کی کمر توڑ دی۔ خاص طور پر، اس نے مسیحیت پر پوپ کی تنہا حکمرانی ختم کر دی۔

لیکن اسلام میں، کسی ایسی عالمگیر ملاؤں کا مراتبی نظام موجود ہی نہیں رہا جس سے عوام چھٹکارا پائیں۔ اسلام میں مذہبی طبقے کا کوئی وجود نہیں، اور نہ ہی مذہبی درجہ بندی ہے، جیسا کہ کاتھولک یا پروٹسٹنٹ فرقوں میں ہے۔ اسلام میں مسجد عبادت کا ایک سادہ سا مقام ہے نہ کہ، کلیسیا کی طرح، ایک الٰہیاتی ادارہ۔ بہت سی نمازوں میں امامت کرنے والا، دوسروں کے شانہ بشانہ کھڑا ہوتا ہے، وہی ہوتا ہے جو نماز کو بہتر طریقے سے جانتا ہے۔ مرکزی مذہبی حاکمیت کی غیر موجودگی میں، مذہب پر ریاست کی برتری — جو یورپ میں مذہبی جنگوں کے بعد حاصل ہوئی--- ہمیشہ سے اسلام میں موجود رہی ہے۔ مسلمان خلیفہ پہلے اور بنیادی طور پر شہزادہ ہے، وہ پوپ نہیں تھا اور نہ اس کا امیدوار۔ وہ مساجد تعمیر کرا سکتا تھا، علماء کی سرپرستی کر

سکتا تھا لیکن خود مذہبی مقتدر نہیں تھا۔ (پہلے بھی ایک حدیث کا حوالے دیا گیا تھا کہ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ اقتدار کا جواز قائم رکھنے کیلئے حکمران کو واحد چیز کی ضرورت ہے کہ وہ نماز کو پھیلائے۔) بات کچھ زیادہ نہیں بنتی، یہ کہنا کہ مسلمانوں کو تاریخی تجربے سے گزرنا، اس مرض کے علاج کیلئے جو اسے کبھی لاحق ہی نہیں تھا۔

دراصل یہی حقیقت--- کہ مسلمانوں کا کوئی پوپ ہی نہیں تھا جسکے خلاف وہ بغاوت کریت--- جھگڑے کی وجہ ہے۔ عالمِ اسلام میں، دنیاوی مقتدر روحانی مقتدر پر غالب رہا ہے * اسلئے انکی علیحدگی کا مسئلہ کبھی پیدا نہیں ہوا۔ اسکا مطلب ہے حکمران اور انکے مخالفین مذہب کو اپنے مقاصد کیلئے استعمال کر سکتے ہیں۔ حکمران ایسے ملا تلاش کر سکتے تھے جو انکو جواز فراہم کرتے، اور باغی اپنے ہم خیالوں سے متاثر ہوتے تھے۔ سعودی بادشاہوں کے اپنے عالم ہیں؛ بن لادن کے اپنے۔

ایک ملک اس اصول سے مبرا ہے: ایران۔ شیعہ فرقہ، جو ایران میں غالب ہے، میں بھی ملاؤں کی اسٹیبلشمنٹ ہے؛ خمینی انقلاب کے بعد انکا دائرہ وسیع ہوا، اب اس میں باقاعدہ مراتبی نظام ہے اور سب سے اوپر پوپ طرز کی ایک ہستی ہے۔ برنارڈ لوئس لکھتا ہے کہ کیسے یہ چیز ایران میں اصلاح کا عمل شروع کر سکتی ہے:

> ''خمینی نے اپنے دور میں ایران کے اسلامی اداروں کو ایک قسم کا ''مسیحیا آیا''، خود کو معصوم عن الخطا پوپ بنایا اور اپنے ارد گرد آرچ بشپ، بشپ اور پادریوں کے برابر ایک فعال جماعت قائم کی۔ یہ سب اسلامی روایات کیلئے اجنبی تھا، ایک ایسا ''اسلامی انقلاب'' تشکیل دیا جو اس سے بہت مختلف ہے جسکا حوالہ عموماً خمینی کی ذات سے دیا جاتا ہے ... ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ مسلمان، مسیحی بیماری کی تشخیص پر اسکا علاج بھی مسیحی ہی کریں، یعنی مذہب اور ریاست کی تقسیم (15)۔''

خلافِ قیاس ایران کی ملوکیت اصلاحات کی راہ پر بھی چل سکتی ہے۔ یہ نا قابلِ غور نہیں کہ جس ملک نے مشرق وسطیٰ کو اسلامی بنیاد پرستی میں دھکیلا اسے باہر بھی نکالے گا۔ لیکن ایران جدیدیت اپنا سکتا ہے، اسلئے نہیں، جیسا کہ ریاست کا جمہوریت کا دعویٰ ہے، کیونکہ

* رسول اللہ کے بعد جنہوں نے دنیاوی اور روحانی مقتدر کو یکجا کر دیا۔

ایرانی جمہوریت انتہائی محدود ہے۔امیدوار مُلاؤں کے ہاتھوں پہلے آزمائش میں مبتلا کر دیا جاتا ہےاس سے پہلے کہ وہ الیکشن میں حصہ لیں،آزاد صحافت کا منہ بند کر دیا گیا ہےاور طلباء کے احتجاج پر پابندی عائد ہے۔مُلا تمام اختیارات قبضے میں لئے ہوئے ہیں،جبکہ منتخب صدر،محمد خاتمی،ایک مہذب فلسفی مُلا،متاثر کن مگر بے اثر تقریریں اور بیانات ہی دیتا ہے۔ خاتمی کے اصلاح پسندانہ اعلانات اور ملک کی بھاری اکثریت کی طرف سے انتخاب،یقیناً، اہم ہے۔ایران اصلاحات اور انقلاب کے امتزاج سے ایک سیکولر جمہوریت بن جائے گا۔وجوہات واضح ہیں:حکومت نے اقتصادیات سے بدانتظامی کی،سیاسی طور پر استحصالی ہےاوراسے لاکھوں بیگانہ مزاج نوجوان لڑکوں اورلڑکیوں کا سامنا ہے۔اہم ترین یہ کہ ایران ملوکیت ٹھکرادی گئی ہے۔اسلام پسند اپنا ٹرمپ کارڈ کھو چکے ہیں۔مشرق وسطیٰ اورشمالی افریقہ میں ہر جگہ یہ ورغلا رہے ہیں،خستہ حال حقیقت ،جسمیں لوگ زندہ ہیں،کا ایک دیومالائی متبادل۔جبکہ ایران میں بنیاد پرستی وہ خستہ حال حقیقت ہےے جس میں لوگ رہتے ہیں۔اگلی مرتبہ کوئی مُلا ایرانی کے دروازے پر دستک دے تو یہ کہتے ہوئے پیٹھ پھیر لے گا:''تمہارے یہاں رہنے نے یہ کیا۔''

ایرانی مثال نے بتیہروں کو سوچنے پر مجبور کیا کہ کیا اسلام پسندوں کومشرق وسطیٰ اور دوسری ریاستوں میں برسرِاقتدار آنا ہوگا تا کہ ٹھکرائے جا سکیں۔ اسکے مطابق مُلاؤں کو بغاوت ابھارنے کی ضرورت ہے جو اسلامی اصلاحات کا محرک ہوں گی،اور پھر حقیقی جمہوریت۔لیکن یہ طریقہ استدلال شیعہ ایران کے غیر معمولی تجربے کے عمومی اصول کوتمام سنی ریاستوں پر لاگو کرنے کی غلطی کر رہا ہے۔دوسری طرف ایران نے 25 برسوں میں طویل سفر طے کیا ہے۔کسی زمانے کا اسکا متنوع کلچر خاموش کر دیا گیا ہے،معیارِزندگی کے ساتھ معیشت بھی زمیں بوس ہے۔اسلئے حل یہ تجویز نہیں ہے کہ دوسرے ممالک بھی اس کھائی میں اتریں تا کہ بالاخراس سے باہر نکل سکیں،اگر وہ خوش قسمت ہیں تو۔

یہ درست ہے کہ جہاں کہیں اسلامی بنیاد پرست روایتی سیاست میں ملوث ہوئے ---بنگلہ دیش، پاکستان،ایران،ترکی---انکی ہوس دم توڑ جاتی ہے۔یہ روایتی سیاسی جماعتوں سے کہیں کم ووٹ لیتے ہیں۔لوگوں کو احساس ہو گیا ہے کہ گلیاں صاف ہونی چاہئیں،حکومتی خزانے کو بہتر انداز میں استعمال کیا جانا ہےاور تعلیم پر توجہ دی جانی ہے۔مُلا تبلیغ کر سکتے ہیں

لیکن حکومت نہیں۔ تا ہم یہ کافی وجہ نہیں کہ مصر یا سعودی عرب میں حکومت تبدیل کرنے کا خطرہ مول لیا جائے ، جو انہیں بیس سال تک بھول بھلیوں میں ڈال دے۔ اگر یہ حکومتیں تھوڑی سی سیاسی فضا کھولیں اور اپنے بنیاد پرست دشمنوں کو عملی حقائق سے نبرد آزما ہونے پر مجبور کریں نہ کہ خواب ہی دیکھیں، بہت جلد انتہا پسندوں کے سبز باغ تباہ کر دیں گے۔ اسکا مطلب جمہوریت کی طرف راتوں رات انتقال نہیں ہونا چاہیے۔لیکن مصر، مثال کے طور ،اہم سیاسی اصلاحات کیلئے بالکل تیار ہے۔ اسکی فی کس آمدنی تقریباً 4 ہزار ڈالر،عبوری دور میں، ہے۔اس میں متوسط طبقہ اور ترقی یافتہ سول سوسائٹی ہے۔پھر بھی یہ بنیاد پرستوں کو انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دیگا، اپنی بالکل بے اختیار پارلیمنٹ کیلئے۔ حکومت کے سیاسی حریفوں، آزاد خیال اور اسلام پسند، دونوں، پر اعلانِ جنگ کا فائدہ بنیاد پرستوں کو ہی ہوا ہے۔ چند عرب ریاستیں جنہوں نے قدرے مختلف راستہ اختیار کیا ہے--- مثلاً اردن اور مراکش وغیرہ ـــ نے اپنے نظام کے اندر ہی جزوی اختلاف کی اجازت دی، اچھی چل رہی ہیں۔اگر ممالک بنیاد پرستوں کو نظام میں شامل کرنے کیلئے مزید کچھ کریں، وہ اجنبی ہیرو لگنے کی بجائے ایک عام سیاستدان سمجھے جائیں گے۔

جیسا کہ یہ ثابت کرتا ہے، کنجی مذہبی اصلاحات نہیں، سیاسی اور اقتصادی اصلاحات ہیں۔ پس اسلام کی ہیئت بدلنے کا سارا پروگرام بھٹک گیا ہے۔ مسیحیت کو جدیدیت کے مطابق ڈھالنے کی کنجی یہ نہیں تھی کہ کلیسیا فوراً الٰہیات کی آزاد خیال تشریحات قبول کر لے۔ پہلے سماج کو جدید کرنا تھا حتیٰ کہ چرچ اپنے اردگرد کے مطابق بدلنے پر مجبور ہو جائیں۔ جدیدیت مخالف متعدد رجحانات مسیحیت اور اسلام دونوں میں ہیں۔ قرآن کیطرف سے سود اور قمار بازی کی مذمت، غذائی پابندیاں، روزوں کا مطالبہ--- سب بائبل کی تعلیمات سے مشابہہ ہیں۔لیکن مسیحی ان سماجوں میں رہتے ہیں جو سیاسی، اقتصادی اور سماجی لحاظ سے جدید ہو چکے ہیں، اور ساتھ ہی ساتھ ، مذہب کو بھی ڈھال لیا ہے۔ مغرب میں اب مذہب روحانی سکون کا ذریعہ ہے نہ کہ زمرہ زندگی کا لائحہ عمل۔ بائبل مشت زنی، سود اور بُنے ہوئے لباس سے روکتی ہے؛ مسیحی معاشرے اب اسے ان معاملات پر حرف آخر نہیں سمجھتے۔

جو لوگ اسلام کو مختلف سمجھتے ہیں میں، یقیناً انہیں جواب دے سکتا ہوں۔لیکن کیا یہ اس قدر مختلف ہے کہ ایک جدید، سرمایہ دار اور جمہوری معاشرے میں ہوتے ہوئے تبدیل نہ ہو؟

ایک مرتبہ پھر، نظریہ سے عمل کی طرف بڑھیں تو اسکے حق میں چند شواہد ہیں۔ ترکی، بوسنیا، ملائیشیا اور کسی حد تک جنوبی ایشیا، جدید مسلمان ریاستیں رکھتے ہیں۔ غالباً اہم ترین یہ کہ امریکہ، کینیڈا اور یورپ میں مسلمانوں کی بڑی تعداد ہے۔ ان تمام خطوں میں اسلام بغیر کسی بڑے انقلاب کے جدید ہو رہا ہے۔ ان تمام ممالک میں مسلمانوں کی اکثریت ---اگر سارے نہیں تو ایسی ہے جو جدیدیت سے خوفزدہ ہوئے بغیر باعمل مسلمان ہیں۔ گذشتہ ابواب میں جدیدیت تک جن مختلف راستوں کی نشاندہی کی گئی۔۔ پروٹسٹنٹ، کیتھولک، آرتھوڈکس، کنفیوشس، لاطینی—— سے یہی سبق ملا کہ سیاست اور اقتصادیات کو درست کرلیں تو ثقافت بھی پیچھے چلے گی۔

شاہراہِ جمہوریت

زیادہ حد تک، مشرق وسطیٰ میں اصلاحات کی زیادہ ذمہ داری خطے کے عوام پر عائد ہوتی ہے۔ کوئی بھی جمہوریت، آزادخیالی یا سیکولرازم کو ان معاشروں میں جڑیں نہیں پکڑا سکتا، جب تک کہ یہ خود نہ تلاش کریں، کوشش یا حاصل نہ کریں۔ لیکن مغرب عموماً اور امریکہ، خصوصاً، اس کی مدد کرسکتا ہے۔ امریکہ مشرق وسطیٰ کی غالب طاقت ہے، ہر ملک واشنگٹن کے ساتھ کو اہم اور نازک ترین رشتہ سمجھتا ہے۔ تیل، سٹریٹجک اتحاد اور اسرائیل کیساتھ مخصوص تعلق نے خطے میں امریکی مداخلت کو یقینی بنادیا ہے۔ واشنگٹن مصری حکومت کو امداد دیتا رہے گا، سعودی بادشاہت حفاظت کریگا، اسرائیل فلسطین میں مذاکرات کرائے گا۔ اصل سوال یہ ہے، کیا اسے بدلے میں مطالبہ نہیں کرنا چاہئے؟ ان حکومتوں پر دباؤ نہ ڈال کر امریکہ حالات کو جوں کا توں رکھنے کا شعوری فیصلہ کرچکا ہوگا—— استحکام کیلئے۔ بہت نیک مقصد ہے، قطعِ نظر کہ مشرق وسطیٰ کی موجودہ صورتحال انتہائی نازک ہے۔ سٹریٹجک تناظر سے بھی، یہ امریکہ کی سلامتی کے مفاد میں ہے کہ مشرق وسطیٰ کی حکومتوں کو بنیاد پرستوں اور دہشتگرد حزب اختلاف کی جائے پیدائش بننے کے رجحان کو کم کیا جائے۔

اولاً، مغرب کو یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ مشرق وسطیٰ میں جمہوریت کی نہیں چاہتا—— کم ازکم فی الحال نہیں۔ پہلے ہمیں آئینی آزاد خیالی حاصل کرنا ہے، جو بالکل مختلف ہے۔ فوری مقاصد کا تعین انکا حصول آسان بنادیتا ہے۔ مشرق وسطیٰ کی حکومتیں یہ جان کر خوش ہونگی کہ

ہم کل کوان پر انتخابات کے انعقاد کیلئے دباؤ نہیں ڈالیں گے۔ یہ جان کر انہیں کم خوشی ہوگی کہ ہم دوسرے مسائل کے سلسلے میں ان پر مسلسل ڈالیں گے۔ سعودی بادشاہت کو اسلامی انتہا پسندی کی سرکاری اور غیر سرکاری پشت پناہی روکنے کے لیے مزید اقدامات کرنا ہونگے، جو اس وقت حکومت کی دوسری بڑی درآمدی جنس ہے۔ اگر یہ آزاد پریس کے حامیوں کو بھی ناپسند ہے تو، انہیں رہنے دیں۔ اسے اپنے مذہبی اور تعلیمی رہنماؤں کو لگام ڈالنا ہوگی اور مجبور کرنا ہوگا کہ بنیاد پرستوں کیساتھ دل لگی ترک کریں۔ مصر میں، ہمیں صدر مبارک پر دباؤ ڈالنا چاہیے کہ ریاستی ملکیتی پریس امریکی اور سامی مخالف رجحانات کو ختم کرے اور ملک سے اٹھنے والی دوسری آوازوں کیلئے خود کو کھولے۔ ان میں بعض ان سے بھی سخت ہونگے جواب ہم سنتے ہیں لیکن بعض بہتر ہونگے۔ اہم ترین یہ کہ ان ملکوں کے عوام اسکے بارے میں بولنا شروع کریں گے جو براہ راست ان کیلئے باعث فکر ہے--- نہ صرف یروشلم یا خلیج میں امریکی پالیسیوں کے بارے میں بلکہ حکومتوں اور سیاست کے متعلق، جنکے زیرِ سایہ وہ رہتے ہیں۔

اسرائیل عالمِ عرب کی متعدد ریاستوں کیلئے ایک بہانہ بن گیا ہے، اپنی ناکامیوں پر پردہ ڈال کر توجہ ہٹانے کیلئے ایک طریقہ۔ دوسرے ممالک کو بھی ایک دوسرے خارجہ پالیسی پر اختلاف ہوتے ہیں--- جیسے جاپان اور چین--- لیکن ان کا معیار زہر آلود نہیں ہوتا جیسے کہ اسرائیل عرب تعلقات ہیں۔ مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی پر اسرائیلی قبضہ عرب کیلئے بڑا ایشو بن گیا ہے۔ چاہے اسے کلبی سوچ کے عرب حکمرانوں نے ہی ہوا دی ہے، یہ مسئلہ ایک حقیقت ہے جسے نظر انداز نہیں کی جا سکتا۔ مشرق وسطیٰ میں نئی عرب گلیاں بن گئی ہیں، جن کی بنیاد الجزیرہ اور انٹرنیٹ کی چیٹ سائیٹس پر ہے۔ ہر طرف فلسطینیوں کے استحصال کا چرچا ہے۔ نظر انداز ہوا تو یہ مسئلہ اہمیت اختیار کرتا جائے گا، ساری مسلم دنیا کیساتھ امریکی تعلقات کو زہر آلود کرے گا اور اسرائیل کیلئے مستقل خطرہ رہیگا۔ امریکہ کو اسرائیل کی حفاظت کی غیر مشروط حمایت جاری رکھنی چاہئے۔ لیکن اسے وہ سب بھی کرنا چاہیے جو اسکے اپنے، اسرائیل اور فلسطین کے بہترین مفاد میں ہے، جو یہ ہے کہ ایسی آباد کاری کیلئے دباؤ ڈالے جو اسرائیل کو حفاظت اور فلسطینیوں کو جائز ریاست کا ضامن ہو۔ فلسطین اور اسرائیل میں امن

عرب خطے کی غیر مطمئن کارکردگی کے مسائل کو ختم نہیں کریگا، لیکن یہ مغرب اور عرب کے

درمیان کشیدگی کو کم ضرور کرے گا۔

مستقل حل اقتصادی اور سیاسی اصلاحات ہیں۔پہلے اقتصادی اصلاحات آنی چاہئیں، کیونکہ یہ اساسی ہیں۔ اگرچہ مشرق وسطیٰ کو جن مسائل کا سامنا ہے انکی نوعیت خالصتاً اقتصادی نہیں ،انکا حل اقتصادیات میں ہو سکتا ہے۔سرمایہ داری کی طرف پیش قدمی، جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، محدود اور جوابدہ حکومت اور حقیقی متوسط طبقے کے قیام کا یقینی راستہ ہے۔ جیسے سپین، پرتگال، چلی، تائیوان، جنوبی کوریا اور میکسیکو میں ہوا،اقتصادی اصلاحات مشرق وسطیٰ میں بھی سیاسی اثر ڈال سکتی ہیں۔اقتصادی اصلاحات کا مطلب ہے قانون کی حقیقی حاکمیت کا آغاز (سرمایہ داری کو معاہدے درکار ہوتے ہیں)، معاشرے کو کھولنا، معلومات تک رسائی اور، غالباً، اہم ترین، کاروباری طبقے کو جنم دینا۔عرب کاروباری مرد اور عورتوں سے پوچھیں تو وہ پرانے نظام کو بدلنا چاہتے ہیں۔وہ اپنے معاشرے کو جدید دیکھنا چاہتے ہیں، آگے بڑھتا ہوا نہ کہ فرقہ پرستی اور جنگ میں الجھا ہوا۔کسی نظریئوں سے انسیت کی بجائے وہ مادی ترقی کی حقیقت کی تلاش میں ہیں۔معاصر مشرق وسطیٰ میں بہت سے لوگ سیاسی سپنوں کا شکار اور تھوڑی تعداد میں عملی اقدامات میں دلچسپی رکھتے ہیں۔اسلیئے بلقان کے متعلق ونسٹن چرچل کی بات کا خلاصہ کرتے ہوئے کہ یہ خطہ جتنی تاریخ ہضم کرتا ہے اس سے کہیں زیادہ پیدا کرتا ہے۔

مشرق وسطیٰ میں یقیناً غالب کاروباری طبقہ موجود ہے لیکن یہ بھی تیل یا حکمران خاندان سے تعلقات کا مرہون منت ہے۔* اسکی دولت جاگیر داری ہے، نہ کہ سرمایہ داری، اور اسکے سیاسی اثرات بھی جاگیر دارانہ ہیں۔حقیقی تاجر طبقہ کا قیام ہی مشرقِ وسطیٰ میں تبدیلی کا سب سے بڑا محرک ثابت ہوگا، اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی کھینچ لیگا۔اگر ثقافت سے فرق پڑتا ہے تو یہاں یہ مدد دیگا۔ ہزاروں برس سے عرب کلچر تجار، دکانداروں اور کاروباری افراد کا گڑھ رہا ہے۔ بازار غالباً مشرق وسطیٰ کا قدیم ترین سماجی ادارہ ہے۔تاریخی تناظر میں بھی اسلام کاروبار کا بڑا داعی رہا ہے، محمدؐ خود بھی ایک تاجر تھے۔ پس، اصلاحات کیلئے واحد جنگ ہے جو مشرق وسطیٰ کے باسیوں کو لڑنا ہوگی، اسلیے ان معاشروں میں ایسے گروہوں اور تنظیموں کی ضرورت ہے جو اقتصادی اور سیاسی اصلاحات کے حامی اور ان سے

* خلیج کی چند ریاستوں پر یہ اصول لاگو نہیں ہوتا؛ دبئی، بحرین حتیٰ کہ سعودی عرب۔

فائدہ اٹھاتے ہوں۔

یہ تصور اس قدر خوش کن نہیں جس قدر نظر آتا ہے۔ حقیقی معاشی سرگرمیاں مشرق وسطیٰ کی بعض ریاستوں میں پہلے ہی دیکھی جاسکتی ہیں۔ اردن ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کا رکن بن گیا ہے، امریکہ کیساتھ آزاد تجارت کا معائدہ کیا ہے، نمایاں صنعتوں کی نجکاری کی، حتیٰ کہ اسرائیل کیساتھ مشترکہ کاروباری منصوبے بھی سراہے ہیں۔ سعودی عرب ڈبلیوٹی او کی رکنیت کی کوششوں میں ہے۔ مصر نے بھی اصلاحات کے سفر میں تھوڑی پیشقدمی کی ہے۔ تیل سے امیر ممالک، بحرین اور متحدہ عرب امارات تیل پر انحصار گھٹانے کے جتنوں میں ہیں۔ دبئ، عرب امارات کا حصہ، پہلے ہی کل قومی پیداوار میں تیل کو گھٹا کر 8 فیصد تک لے آیا ہے اور تجارتی اور بینکاری کا گڑھ بننے کے ارادوں کا اعلان اظہار کر چکا ہے--- ''مشرق وسطیٰ کا سنگاپور'' (اچھا ہوگا اگر یہ نسلی اور مذہبی اقلیتوں کیلیئے سنگاپور کی رواداری بھی اپنا لے۔) حتیٰ کہ سعودی عرب بھی جانتا ہے کہ اسکی تیل کی صنعت تین نوجوانوں میں سے ایک کو روزگار دے سکتی ہے، جو افرادی قوت میں شامل ہو رہے ہیں۔ الجیریا میں صدر عبدالعزیز بھی بیرونی سرمایہ کاری لانے پر ڈٹے ہیں تاکہ چیتھڑے چیتھڑے معیشت کی مرمت کی جائے۔

اگر ہم کسی ریاست کا انتخاب کر سکیں جس پر اصلاحات کے لیے دباؤ ڈالا جائے تو وہ مصر ہے۔ گو کہ اردن کے پاس زیادہ ترقی پسند رہنما ہے، اور سعودی عرب تیل کی وجہ سے حساس ہے، مصر عرب خطے کا فکری روح ہے۔ اگر اسے اقتصادی اور سیاسی حوالے سے ترقی پسند بنایا جاتا تو کسی مضمون یا تقریر سے زیادہ پر اثر طریقے سے بتا دیتا کہ اسلام جدیدیت سے موافق ہے اور عرب آج کی دنیا میں آگے بڑھ سکتے ہیں۔ مشرقی ایشیا میں، جاپان کی معاشی ترقی نے ایک مثال ثابت کر دی ہے جسے خطے کے دوسرے ملکوں نے دیکھا اور نقالی کی۔ مشرق وسطیٰ کو بھی مقامی سطح پر ایسی ہی کسی کامیابی کی ضرورت ہے۔

اس کردار کے لیے ایک اور ممکنہ امید وار بھی ہے: عراق۔ صدام حسین کا کھلونا بننے سے قبل عراق خطے کا ترقی یافتہ، پڑھا لکھا اور آزاد خیال ترین ملک تھا۔ اسکے پاس تیل ہے، لیکن، اہم ترین، پانی بھی ہے۔ عراق دنیا کی قدیم ترین دریائی وادیوں کی تہذیبوں میں سے ایک کا ملک ہے۔ اسکا دارالحکومت، بغداد، قدیم دنیا کے عجائبات کا مسکن ہے ''بابل کے باغات معلقہ''، صدیوں سے اہم ترین شہر رہا ہے۔ 50ء کے عشرے میں عراق ترقی یافتہ سول

سوسائٹی کا ملک تھا جو ڈاکٹروں، انجینئروں اور ماہرین تعمیرات جن میں خواتین بھی ہیں، کام کرتے ہیں۔ اگر امریکہ صدام حسین کو ہٹا کر۔۔۔اور اہم ترین یہ۔۔۔ سنجیدگی سے ملک کی تعمیر کے طویل المیعاد منصوبہ پر کمر کس لے تو اغلب ہے کہ عراق عالمِ عرب کا پہلا ملک ہو جہاں اقتصادی حرکیات یا مذہبی رواداری، آزاد خیال سیاست، جدیدیت اور ثقافت یکجا ہوں۔ کامیابی ایک وبائی مرض ہے۔

سرکردہ سیاستدان، ایوان کے سابق سپیکر تھامس اونیل نے کہا تھا کہ ہر سیاست مقامی ہوتی ہے۔ یہی نوعیت غصے کی سیاست کی ہے۔ عام عربوں کو تہذیبوں کے تصادم، میکڈونلڈز کے عروج یا امریکہ کی سامراجی خارجہ پالیسی کی پریشانی نہیں۔ یہ استحصالی حکومت کے زیرِ نگیں ہونے کا ردِ عمل جسمیں انکی کوئی سیاسی آواز نہیں۔ اور یہ امریکہ پر ان حکومتوں کی حمایت کا الزام لگاتے ہیں۔

یہ سمجھنے والے کہ یہ مسئلہ عالمِ عرب سے مخصوص ہے یا عرب کبھی نہیں سدھریں گے، یاد کریں کہ 25 برس قبل شدید ترین امریکہ مخالف مظاہرے چلی، میکسیکو اور جنوبی کوریا میں ہوئے۔ وجہ وہی تھی: لوگ ان حکومتوں کو ناپسند کرتے تھے جو ان پر حاکم تھیں اور امریکہ کو انکا پشت پناہ سمجھتے تھے۔ پھر یہ آمریتیں آزاد خیال ہوئیں، لوگوں کا معیار زندگی بلند ہوا، اقتصادی اصلاحات آئیں اور پھر جمہوریت کو کھولا گیا۔ نتیجہ: امریکہ مخالف رجحانات خاموش ہیں اس حد تک کہ اب اپنی ثقافت کے امریکیانے پر معمول کے احتجاج تک رہ گئے ہیں۔ اگر مستقبل میں میکڈونلڈز کیخلاف سڑکوں پر مظاہرے امریکہ مخالفت کی واحد صورت رہ گئے تو ہمیں فکر کرنا ہوگی، مشرقِ وسطیٰ کو، واقعی، آگے بڑھنا ہوگا۔

میجسٹک کلاک ورک

جمہوریت کا فروغ کٹھن ہے۔ اسکا یہ مطلب نہیں کہ مغرب۔۔۔ خصوصاً امریکہ کو۔۔۔ آزاد خیال جمہوری قوتوں کی مدد ترک کر دے۔ نہ ہی یہ ثابت ہوتا ہے کہ آمریتوں کو کم برے متبادل کے طور پر قبول کر لیا جائے۔ تاہم یہ ایک شائستگی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ممالک کو، گذشتہ دہائی میں، انتخابات پر مجبور کرنا، اکثر صورتوں میں، غیر موافق ثابت ہوتا رہا ہے۔ ملکوں جیسے کہ بوسنیا، جو ڈیٹن امن معاہدہ کے محض ایک برس بعد انتخابات میں ملوث ہو

گیا، الیکشن صرف ان گندی نسلی قوتوں کو مضبوط کرتے ہیں جنہوں نے وہاں حقیقی آزاد خیال جمہوریت کا قیام مشکل بنا رکھا ہے۔ نسل پرست ٹھگ حکومت میں رہے، عدلیہ کو اپنے لوگوں کو بھرے اور پولیس کو خوب کھلایا۔ پرانا نظام اپنی جگہ قائم رہا ہے، سالوں تک حقیقی تبدیلی کو روکے رکھا، بلکہ کئی عشروں تک۔ مشرقی تیمور اور افغانستان میں، طویل المیعاد قومی تعمیر نو مفید ثابت ہوئی ہے۔ عمومی طور پر، سیاسی اصلاحات اور ادارتی نشو ونما کے 5 برس کے عبوری دور کے بعد کثیر الجماعتی انتخابات ہونے چاہئیں۔ ملک جسمیں شدید علاقائی، نسلی اور مذہبی فرقہ بندی ہو--- جیسے عراق--- میں یہ مشکل ہے۔ یہ یقینی بناتا ہے کہ انتخابات اس وقت ہوتے ہیں جب شہری ادارے، عدلیہ، سیاسی جماعتیں اور معیشت بہترین کام کرنے لگیں۔ زندگی میں ہر کام کیطرح یہاں بھی وقت کا تعین کا انتخاب فرق ڈالتا ہے۔

اگرچہ کسی ملک پر انتخابات مسلط کرنا آسان ہے، سماج کو آئینی آزاد خیالی کیطرف دھکیلنا مشکل ہے۔ حقیقی آزاد خیالی اور جمہوریانے کا سفر، جسمیں انتخابات محض ایک قدم ہیں، مسلسل اور طویل ہے۔ یہ جانتے ہوئے، حکومتیں اور غیر سرکاری تنظیمیں ایسے اقدامات کو فروغ دے رہی ہیں جو ترقی پذیر ممالک میں آئینی آزاد خیالی کو ابھاریں۔ نیشنل اینڈ وومنٹ فار ڈیموکریسی (NATIONAL ENDOWMENT FOR DEMOCRACY) آزاد منڈی، افرادی قوت کی خودمختار نقل وحرکت اور سیاسی جماعتوں کو فروغ دیتی ہے۔ یو ایس ایجنسی فار انٹرنیشنل ڈویلپمنٹ (U.S. AGENCY FOR INTERNATIONAL DEVELOPMENT) آزاد عدلیہ کیلئے فنڈز دیتی ہے۔ اگر ایک ملک انتخابات کرواتا ہے، واشنگٹن اور عالمی برادری، نتیجے میں قائم ہونیوالی حکومت کو برداشت کرنے کیلئے بہت آگے تک جائے گا، جیسا کہ انہوں نے روس میں بورس یلسن، کرغزستان میں عسکر عکایوف اور ارجنٹائن میں کارلوس منیم کیلئے کیا۔ علامتوں اور تصورات کے دور میں انتخابات کا انعقاد کیمرے کی آنکھ میں بند کرنا آسان ہے۔ لیکن آپ قانون کی حاکمیت کیسے نشر کریں گے؟ لیکن انتخابات کے بعد ایک نئی زندگی ہے، خصوصاً انکے لئے جو وہاں رہتے ہیں۔

دوسری طرف، آزادانہ اور شفاف انتخابات کی غیر موجودگی نظام کی جزوی ناکامی شمار کی جانی چاہیے، نہ کہ استحصال کی تعریف نہیں۔ انتخابات انتظامیہ کی اہم صفت ہیں، لیکن یہ

واحد صفت نہیں۔ یہ زیادہ اہم ہے کہ حکومتوں کو آئینی آزاد خیالی کے معیار پر پرکھا جائے۔ اگر ایک حکومت محدود جمہوریت کیساتھ ان آزادیوں کو بڑھاتی چلی جائے، اسے آمریت نہیں کہا جانا چاہیے۔ محدود سیاسی انتخاب سے قطع نظر سنگاپور، ملائیشیا، اردن اور مراکش اپنے شہریوں کو زندگی، شہری آزادیوں اور خوشی کیلئے بہتر ماحول فراہم کر رہے ہیں، عراق یا لیبیا کی آمریتوں یا وینیز ویلا، روس یا گھانا کی غیر آزاد خیال جمہوریتوں کے۔ اور عالمی سرمایہ داری کا دباؤ آزاد خیالی کے عمل کو آگے بڑھا سکتا ہے، جیسا کہ چین میں۔ منڈی اور اخلاقیات ایک ساتھ کام کر سکتے ہیں۔

اقتصادی حوالے سے مشکل ترین کام ٹرسٹ فنڈ ریاستوں میں اصلاحات لانا ہے۔ یہ تقریباً ناممکن ہی ثابت ہوا ہے کہ ان ریاستوں کو آسان دولت سے دور رکھا جائے۔2002ء میں عالمی بینک نے مشرقی افریقہ کی ریاست چاڈ میں ایک نئے تجربے کا آغاز کیا۔ چاڈ میں تیل کے وسیع ذخائر ہیں لیکن بین الاقوامی ادارے تیل نکالنے اور لیجانے کیلئے بڑی سرمایہ کاری سے ڈرتے تھے اور اسکی وجہ سیاسی عدم استحکام کی تاریخ تھی۔2002ء میں عالمی بینک میدان میں آنے پر راضی ہوا، پراجیکٹ کے سر پر ہاتھ رکھا، اور حکومت کو قرض دیا تاکہ وہ ایک کثیر الملکی کنسورشیم۔۔ ایگزن موبل(Exxon Mobi)۔۔ کیساتھ تیل نکالے۔ لیکن بینک نے چند شرائط بھی عائد کیں۔ چاڈ پارلیمنٹ کو قانون منظور کرنا تھا جسکے مطابق تیل کی 80 فیصد آمدنی صحت، تعلیم اور دیہاتوں میں ضروریات زندگی کی فراہمی، 5 فیصد تیل کے کنوؤں کے قریبی علاقوں میں خرچ کی جائیگی اور 10 فی صد آئندہ نسلوں کیلئے خاص اکاؤنٹ میں رکھی جائیگی۔ اسطرح صرف 5 فیصد رقم حکومت کی مرضی سے خرچنے کیلئے بچی۔ یہ یقینی بنانے کیلئے کہ نظام پر تھیوری کیساتھ ساتھ عمل بھی ہو، بینک نے مطالبہ کیا کہ تیل کی تمام آمدنی بیرون ملک اکاؤنٹ میں رکھی جائے گی، جسے ایک خودمختار کمیٹی (جو چاڈ کے سرکردہ شہریوں پر مشتمل ہوگی) سنبھالے گی۔ اسکی کامیابی کے متعلق رائے کا اظہار قبل از وقت ہوگا لیکن اگر یہ کامیاب رہا تو کسی بھی دوسرے جگہ نقل کیا جا سکتا ہے۔ چاڈ نظام ایک طریقہ بتاتا ہے جسکے ذریعے قدرتی وسائل کی آمدنی ملکوں کیلئے رحمت بن سکتی ہے نہ کہ زحمت، جیسا کہ اب ہے۔

آخر میں یہ کہ، ہمیں آئین کو زندہ کرنیکی ضرورت ہے۔ حقیقی جمہوریت پر دینے کا ایک

اثر یہ ہے کہ عبوری دور سے گزرنے والے ممالک کیلئے فرضی آئین کی تشکیل پر بہت کم محنت کی جاتی ہے۔آئین پرستی ،جیسا کہ اسکے اٹھارویں صدی کے سرکردہ سیاسی سائنسدانوں، مونٹیسکو اورمیڈیسن، نے سمجھا، چیک اور بیلنس کا پیچیدہ نظام ہے، اختیارات کے ارتکاز اور ناجائز استعمال روکنے کیلئے۔ یہ محض حقوق کی فہرست تیار کر دینے سے نہیں ہوتا، بلکہ ایسا نظام قائم کرنے سے ہوگا جسمیں حکومت ان حقوق کی خلاف ورزی نہیں کریگی۔سماج کے مختلف گروہوں کو بااختیار کرنا ہوگا کیونکہ، جیسا کہ میڈیسن نے کہا، ''ارادوں کو مات دینے کیلئے ارادہ ہونا ضروری ہے۔''

آئین کا مطلب عوام کی خواہشات کو سدھانا بھی ہے، نہ صرف جمہوری بلکہ باشعور حکومت قائم کرے۔جنوبی افریقہ کا آئین ایک غیر معمولی مہارت بلکہ کسی حد تک غیر جمہوری ڈھانچے کی مثال ہے۔اس میں اقلیتوں کو اختیارات ہیں، دونوں کو جو مقامی ہیں، جیسے زولو وغیرہ اور وہ جو منتشر ہیں، جیسے سفید فام۔ایسا کرتے ہوئے اس نے بحیثیت جمہوریت کامیابی کے امکانات روشن کرلئے ہیں،قطعِ نظر اسکی غربت اور بڑھتے ہوئے سماجی ناہمواریوں کے۔

بدقسمتی سے، بھانت بھانت کے غیر منتخب اداروں، بالواسطہ رائے دہی، وفاقی انتظامات اور چیک اور بیلنس جس نے یورپ میں بہت سے رسمی اور غیر رسمی آئین قائم کیے ہیں، کی حیثیت مشکوک ہوگئی ہے۔ جسے ویمار سائنڈ روم کہا جا سکتا ہے--- دو عالمی جنگوں کے درمیانی جرمنی کے خوبصورت آئین کے بعد رکھا گیا نام، جو بہرحال فاشزم سے نہ بچا سکا--- نے لوگوں کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا ہے کہ آئین ایک کاغذی کاروائی جو حالات میں زیادہ تبدیلی نہیں لاسکتا (اسطرح جیسے کہ جرمنی میں کوئی بھی سیاسی نظام فوجی شکست، سماجی انقلاب، کساد بازاری اور افراطِ زر کو بے رنگ کر دیگا)۔ بلا واسطہ جمہوریت لانیوالے عناصر غیر مصدقہ اور رائے عامہ کو دبانے والے سمجھتے ہیں۔آج بیشتر ریاستوں میں اکثریت پرستی کا تصور تھوڑے بہت فرق کیساتھ رائج ہے۔لیکن '' فاتح کا سب کچھ'' کے اس نظام کا مسئلہ یہ ہے کہ، جمہوریاتے ممالک میں، جیتنے والا واقعی سب کچھ لے جاتا ہے۔

یقیناً، کلچر میں فرق ہوتا ہے،اور مختلف معاشروں کو حکومت کے مختلف ڈھانچوں کی ضرورت ہوگی۔یہ ایک درخواست ہے کسی ایک طریقہ حکومت کو وسیع پیمانے پر اپنانے کی

نہیں، بلکہ مختلف رنگوں سے سجی آزاد جمہوریت کی، ایسی جو ایک فقرے میں دونوں لفظوں پر زور دے۔ حقیقی جمہوریت نازک نظام ہے جو نہ صرف ان دو (آزاد خیالی اور جمہوریت) کے درمیان توازن قائم کرتا ہے بلکہ دوسری قوتوں--- جسے ٹیوکیول نے "وسطی نسبتیں" کہا--- میں بھی توازن قائم کرتا ہے، تا کہ، آخر کار، ایک شاندار گھڑی کو چلایا جائے۔ یہ نظام سمجھنے کیلیئے آئینی آزاد خیالی کی روایات کو دوبارہ دریافت کرنیکی ضرورت ہے، جو مغرب کے سیاسی تجربہ اور ساری دنیا میں بہتر انتظامیہ کا مرکز ہے۔

یہ دوبارہ حصول اس وقت تک نامکمل رہیگا اگر ہم اپنا ذہن دور افتادہ غریب مما لک کی ہونیوں تک محدود کر لیں جو الجھے اور غریب اور مستحکم، جمہوری مغرب سے قطعاً مختلف ہیں۔ جمہوریت لحہ بہ لحہ تبدیل ہوتا نظام ہے، باہر اور گھر میں بھی۔ جمہویت اور آزاد خیالی میں کشیدگی وہی ہے جو ماضی میں خود مغرب میں پیدا ہوتی رہی ہے۔ بہت ہی مختلف صورت میں، یہ آج بھی موجود اور مغربی دنیا میں بڑھ رہی ہے۔ یہ ایک ملک میں خاص طور پر وسیع پیمانے پر موجود ہے: ریاست ہائے متحدہ امریکہ۔

باب نمبر 5

اچھی چیز کی فروانی

کہتے ہیں کہ دولت خوشیاں نہیں خرید سکتی لیکن آپ سوچیں گے 5 کھرب ڈالر کچھ فرق ڈالیں گے۔ گزشتہ ایک چوتھائی صدی میں امریکہ نے اپنی کل قومی پیداوار میں ٹھیک اتنی رقم بڑھائی ہے(1)، مگر ہر سروے اور پیمانہ جو ماہر نفسیات استعمال کرتے ہیں، بتاتا ہے کہ امریکی اس قدر خوش نہیں رہے جس قدر 25 برس قبل تھے۔ نہ صرف ملک امیر ہوا ہے بلکہ تقریباً ہر پہلو میں اچھی حالت میں ہے۔ بیشتر امریکیوں کو بمشکل یاد ہے کہ 70ء کے عشرے میں انکا ملک کس قدر منتشر دِکھتا تھا۔ ویتنام میں شکست خوردہ یہ افراط زر، تیل کے بحران، نسلی فسادات اور بڑھتے ہوئے جرائم سے لڑ رہا تھا۔ لیکن آئندہ دو دہائیوں میں امریکی معیشت تقریباً بلا رکاوٹ آگے بڑھی*، فی کس آمدنی 50 فیصد بڑھ گئی، جرائم کم ہوئے، نسلی تعلقات بہتر ہوئے، شہر دوبارہ آباد ہونے لگے، غرضیکہ غربت دکھانے والا ہر نشان نیچے کی جانب گرا۔ بین الاقوامی سطح پر تبدیلی مزید ڈرامائی تھی۔ 90ء کی دہائی کے آغاز میں سرد جنگ جیتی جا چکی تھی، کمیونزم پاش پاش تھا، سوشلزم متروک تھا اور امریکہ سیاسی، اقتصادی، عسکری اور ثقافتی حوالے سے اقوام عالم میں سینہ تانے کھڑا تھا۔ آپ سوچیں گے ایسی کامیابیاں کسی کو بھی خوشیاں لا سکتی ہیں۔

سوائے اسکے امریکی حالات کو اسطرح نہیں دیکھتے۔ ان تمام محاذوں پر پیش قدمی کے

*یقیناً اس عرصے کے دوران زوال اور برے دن بھی آئے ہیں، تاریخی تناظر میں 1980ء اور 1990ء کا دور پرامن توسیع کے طویل کی حیثیت سے یاد کیا جائے گا۔ حتیٰ کہ درمیانی آمدنیاں، جو 1970ء اور 1980ء کے درمیان جامد ہو گئی تھیں، 1990ء کے دوران امریکہ سماج کے ہر گروہ کیلئے بڑھیں، غریب سے لیکر امیر شہری تک۔

کے باوجود یہ سوچتے ہیں کہ کوئی چیز انکے ملک میں بری طرح غلط ہوئی ہے— خصوصاً سیاسی نظام کیساتھ۔ آسان الفاظ میں کہیں تو، بیشتر امریکی اپنی جمہوریت پر اعتماد کھو چکے ہیں۔ اگر آپ تلاش کریں کہ امریکہ کی بے چینی کے نیچے کیا ہے تو پتہ چلے گا کہ اسکے مسائل وہی ہیں جن سے ساری دنیا کے ممالک گزر رہے ہیں۔ جمہوری لہر نے امریکہ کو قوت، شاید کسی بھی مغربی ملک سے زیادہ قوت سے تھپیڑا ہے۔ جمہوریہ کی بنیادوں پر قائم، جو اکثریت کی رائے اور اقلیت کے حقوق کے توازن پر یقین رکھتی ہے—یا وسیع تناظر میں، آزادی اور جمہوریت پر--- امریکہ تیزی سے یک ذہنی عوامیت کو قبول رہا ہے جو عوامی مقبولیت اور کھلے پن کو بڑے جواز سمجھتے ہیں۔ اس نظریے نے پرانے اداروں کا خاتمہ، روایتی مقتدر حلقوں کو نیچا دکھانا اور منظم مفاداتی گروہ کی فتح ناگزیر کردی ہے، سب ''عوام'' کے نام پر۔ نتیجہ امریکی نظام میں انتہائی غیر متوازنیت ہے، زیادہ جمہوریت لیکن کم آزادی۔

اجنبی اسے انہونی کہ سکتا ہے اگر اسے بتایا جائے کہ دنیا کی طاقتور ترین جمہوریہ یقین کے بحران سے گزر رہی ہے--- لیکن ایسا ہے۔ اس میں انتہا پسندی نظر آئے، سادہ اور قائل کرنے والے اعداد و شمار پر غور کریں، قومی اثاثوں پر اعتماد میں کمی کا رجحان جو سیاسی نظام کی علامت ہے۔ 60ء کے عشرے کے آغاز میں امریکیوں کی اکثریت--- 70 فیصد سے زائد---اس سے متفق تھے'' آپ واشنگٹن میں حکومت پر اعتماد کر سکتے ہیں کہ وہ اکثر وہی کریگی جو درست ہے۔'' 30 برس بعد یہ تعداد 30 فیصد کے قریب ہے۔ سرویز نے 11 ستمبر 2001ء کے ٹھیک فوراً واشنگٹن پر اعتماد میں اضافے کی نشاندہی کی: اکتوبر 2001ء کے گیلپ سروے نے بتایا کہ 60 فیصد شہری ہر معاملے یا اکثر میں واشنگٹن پر اعتماد کرتے ہیں، لیکن جون 2002ء تک تعداد دوبارہ 11 ستمبر سے قبل کی حد تک آ گئی۔ قومی اہمیت کے احساس کے باوجود جو دہشتگردی کیخلاف جنگ نے پیدا کیا ہے، ''اعتماد کرنے والوں'' کی تعداد 50,40ء یا 60ء کے عشرے کے برابر نہیں آئیگی۔ صرف یہی ایک سروے نہیں ہے۔ اسطرح کے بیانات پر ردِعمل کہ ''سرکاری افسران پروا نہیں کرتے کہ مجھ جیسے لوگ کیا سوچتے ہیں'' دراصل 1960ء کے بعد سے جاری تنزل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ہیرس کی رائے شماری (Harris poll's) کا ''بیگانگی کا اعشاریہ'' 60ء کے 34 فیصد سے 90ء میں 63 فیصد تک پہنچ گیا۔ اور آگے ہی آگے۔ عوامی اعتماد کا ہر پیمانہ اسی تاریک صورتحال کی طرف اشارہ کرتا ہے (2)۔

ووٹ ڈالنے کی شرح (صدارتی انتخابات میں) 60ء کی دہائی سے 20 فیصد تک کم ہوگئی ہے۔کمی کا یہ رجحان سفید فاموں میں ڈرامائی ہے کیونکہ 60ء کے عشرے سے افریقی امریکیوں کی ووٹنگ میں اتار چڑھاؤ آتا رہا ہے، جب سے جم کرو قانون جس نے جنوب کے سیاہ فاموں کا حقِ رائے دہی ختم کیا تھا،کو کالعدم کیا گیا ہے۔یہ تنزلی اسکے باوجود واقعہ ہوئی ہے کہ گذشتہ دو دہائیوں نے ''موٹر ووٹر قوانین''(3) کے ذریعے لوگوں کو ووٹ ڈالنے پر مائل کرنے کیلئے جان توڑ کوششیں دیکھی ہیں۔بعض دلیل دیتے ہیں کہ ووٹنگ کا کم ٹرن آؤٹ اطمینان کی علامت ہے،اسلئے پریشان مت ہوں،خوش رہیں۔لیکن یہ دلالت کرتا ہے کہ ماضی میں جب ٹرن آؤٹ کی شرح زیادہ تھی— مثلاً 50ء کی دہائی— تو عوام انقلاب کے خواہشمند تھے، جو درست نہیں۔کسی بھی معاملے میں،ووٹنگ کی کوئی بھی وجوہات ہیں،ایسی سنگین کمی کھنگالنے کی ضرورت ہے۔

ووٹنگ نہ صرف آزاد معاشرے میں شہریت کا عالمگیر عمل ہے بلکہ کم ترین کا بھی طالب ہے۔آپ کو جو کرنا ہے وہ ہر چند برس بعد ایک مرتبہ پولنگ بوتھ پر جانا۔دوسری شہری ذمہ داریوں جو زیادہ لگن اور توجہ مانگتی ہیں--- مثلاً کسی سیاسی جماعت یا سکول کونسل کی رکنیت— میں اس سے بھی تیز زوال آیا ہے۔اعداد وشمار کی مدد لیتے ہوئے ،سیاسی سائنسدان رابرٹ پٹنم نے حساب لگایا ہے کہ عوامی اور شہری معاملات میں شرکت عمومی طور پر 60 کے عشرے کے وسط سے لیکر 40 فیصد تک کم ہوئی ہے(4)۔

اپنے سیاسی نظام سے عدم اطمینان دیکھا جا سکتا ہے جسطرح امریکی ووٹ ڈالتے ہیں،عوامی رائے شماری پر ردِعمل ظاہر کرتے ہیں، ایڈیٹرز کے نام خط لکھتے ہیں، ٹی وی پر باتیں کرتے ہیں،اور جہاں کہیں کسی بھی صورت میں ظاہر کرتے ہیں۔90ء کی دہائی میں امریکی سیاست پر تصنیف کی جانیوالی چند اہم ترین کتابوں کے عنوانات پر ایک نظر ڈالیں *Why Americans Hate Politics; Slouching twoard Gomorrah; Arrogant Capital; The Betrayal of Democracy; Democracy on Trial; Running Scared; Dirty Politics; Demosclerosis.* انکے علاوہ درجنوں اور ہیں،سب امریکی جمہوریت کے بارے میں تاریک ہیں۔ ہارورڈ یونیورسٹی کے سابق صدر، ڈیرک بوک، نے امریکی جمہوریت پر اپنی حالیہ جامع کتاب کا عنوان رکھا ہے

The Trouble with Government۔ حتیٰ کہ 11 ستمبر کے بعد محبّ وطنی کی نئی لہر کا رجحان بھی ملک، اسکے آدرشوں اور عوام کی مدح سرائی کی طرف ہے، سیاست یا سیاسی نظام کا شاذ و نادر ہی ذکر ہے۔ جب آپ اس پر غور کرتے ہیں کہ حکومت کی طرف عوام کا رجحان مثبت سے منفی کیطرف چلا گیا ہے غیر معمولی اقتصادی ترقی اور سماجی استحکام کے تین دہائیوں میں تو معاملہ گھمبیر ہو جاتا ہے، یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل لگتا ہے کہ امریکی جمہوریت سنگین مسائل سے دوچار نہیں ہوئی۔

اس تبدیلی کی کیا وضاحتیں ہیں۔ بعض اسکا الزام ویتنام اور واٹر گیٹ کو دیتے ہیں ،دوسرے حکومت کی بڑھتی ہوئی ہوس کو، اور بعض سیاستدان کے معیار میں کمی کو۔ ہارورڈ یونیورسٹی کے کینڈی سکول آف گورنمنٹ کے دانشوروں کا محتاط مطالعہ نے نتیجہ نکالا مبینہ ملزمان میں سے کوئی بھی ذمہ دار نہیں(5)۔ مثال کے طور پر، ویتنام اور واٹر گیٹ نے حکومت کو داغدار کیا، عوامی رجحانات میں زوال ویتنام جنگ سنگین ہونے سے پہلے شروع ہوا اور ان میں اضافہ جاری رہا حتیٰ کہ ویتنام اور واٹر گیٹ یاداشتوں سے محو ہو گئے۔ اس طرح، لیکن کم درجے کی بداعتمادی صنعتی دنیا کے بیشتر ممالک مین واقع ہوا ہے اسلیے یہ مسئلہ خالصتاً امریکی ہونیکا امکان نہیں ہے۔ جہاں تک بڑی حکومتوں کے عروج کا تعلق ہے، اگرچہ واشنگٹن میں ملازمین اور ایجنسیوں کی تعداد 1960ء اور 70ء کے عشروں میں تیزی سے بڑھی، کل معیشت میں فیصد کے حساب سے وفاقی حکومت کم وبیش پچیس برس سے اسی حجم پر کھڑی ہے۔ حکومت میں بڑی ترین وسعت ان استحقاقات، جیسے کہ سوشل سیکورٹی اور میڈی کیئر، سے آئی ہے جو بہت ہی زیادہ معروف ہیں۔

یہ بات ذہن نشین کر کے بات بڑھاتے ہیں کہ دوسری عالمی جنگ اور اسکے بعد کا دور غیر معمولی محبّ الوطنی، تعاون اور شہری جذبے کا تھا۔ تمام ادارے--- خاندان، چرچ حتیٰ کارپوریشن—50ء کے عشرے کے عروج سے نیچے آ گئے ہیں۔ یہ رجحان اس وسیع تحریک کا حصہ ہے، مابعد دوسری عالمی جنگ کے مستحکم اور اجتماعی دور کا، تیز رفتار، مسابقتی اور انفرادیت پسند معاشرے کی طرف، جس میں درجہ بندی اور استحکام پر بداعتمادی تھی۔ حقیقی محبّ وطنی کے احیاء کے باوجود 11 ستمبر اس طویل المدت تبدیلی کو روک نہیں پائے گی۔

یہ خیال کہ سیاسی رہنماؤں کا کردار اور معیار اُس پرسکون دور سے بہت گر گیا ہے، عوام

کے ذہنوں میں پختہ جگہ بنا گیا ہے۔ ایک دانشور، جو اپنے اسی کے پیٹے میں تھا، نے یہی بات مجھے بہت مبلغانہ انداز میں کہی: ''اپنی جوانی میں، میں واشنگٹن پر نظر ڈالتا، تاریخ ساز شخصیات نظر آتیں--- روزویلٹ، مارشل، آئزن ہاور، میک آرتھر، ٹرومین، ایکیسن--- آج میں رچرڈ گیفرڈ، ڈینس ہیسٹرٹ اور جارج ڈبلیو بش دیکھتا ہوں۔'' (ہم نیویارک کے ایک بڑے کلب کے میز پر دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے، دھندلی یاد ایام میں کھونے کا مکمل ماحول۔) لیکن انکی جوانی، 30ء اور 40ء کے عشرے، کساد بازاری اور دوسری عالمی جنگ سے مغلوب تھی۔ مشکل دور عظیم رہنما لاتے ہیں۔ دراصل، یہ ہم سے بہترین کو نکالتے ہیں۔ غور کیجئے 11 ستمبر نے جارج بش اور سارے ملک کو کیسے بدل دیا ہے۔ امریکیوں کی جس ''عظیم نسل'' کی مدح سرائی کی جاتی ہے پر ایسے وقت بھی گزرے جب عوامی خدمت اور قربانیاں درکار تھیں۔ آج دہشت گردی کیخلاف جنگ قربانیوں کے انہی مطالبوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے، لیکن بیشتر امریکیوں کے خیال میں اس میں حقیقی طور پر کرنے کو کچھ نہیں ہے--- اب بھی۔ جنہیں کچھ کرنے کیلئے آواز دی گئی — میئر ریڈلف گیولانی، نیویارک کے پولیس افسران یا آگ بجھانے والا عملہ، افغانستان میں رینجرز--- انہوں نے غیر معمولی کارنامے کیئے۔

تاریخ کے وسیع تناظر میں، یہ تصور کہ آج کے سیاسی رہنما روایت سے پست ہیں احمقانہ لگتا ہے۔ کچھ لوگ اس سنہری دور کی آرزو کرتے ہیں جب ردرفورڈ بی ہینز یا ملرڈ فلمور صدر تھے۔ تاریخ کے بیشتر دور میں، امریکی سیاستدان معقول، محنتی مخلوق ثابت ہوتے رہے ہیں، اپنے نظام کے اندر رہ کر بقا اور آگے بڑھنے کی جدوجہد کرتے ہوئے۔ جب وہ ہارورڈ یونیورسٹی کے صدر تھے، بوک نے ایوان نمائندگان کے سپیکر تھامس پی اونیل سے پوچھا کہ گزشتہ 30 برسوں میں کانگرس کیلئے منتخب ہونیوالوں کا معیار بلند ہوا ہے یا پست۔ ''ٹِپ'' نے ایک لمحے کیلئے سوچا اور جواب دیا، ''معیار تو واضح طور پر بہتر ہے بلکہ بہت بہتر۔ لیکن نتائج یقیناً بدترین آئے ہیں۔'' اپنی غیر عملی حد تک آئیڈیل پرست صدارتی مہم کے دوران ارب پتی راس پیرٹ نے واشنگٹن کے ساتھ اپنے معاملات کو یاد کرتے ہوئے کچھ ایسا ہی کہا، ''اچھے لوگ، برا نظام۔''

کس چیز نے نظام زوال پذیر کیا؟ عوامی رائے میں تبدیلی کا وقت اس حوالے سے

اہم سراغ ہے۔لوگوں کا رجحان 60ء کے عشرے میں کیوں تبدیل ہونے لگے اور پھر ہوتے ہی چلے گئے؟ بڑی تبدیلی اس دور میں شروع ہوئی اور بلاروک ٹوک جاری ہے: سیاست کا جمہوریانہ۔ جمہوریت کے جمہوریانے کی بات شاید عجیب لگے،لیکن یہ تبدیلی انہی الفاظ میں بہترین بیان ہوسکتی ہے۔60 کی ہائی سے امریکی سیاست کے بیشتر پہلو۔۔۔ سیاسی جماعتیں، مقننہ،انتظامی ادارے، عدالتیں بھی۔۔۔ نے عوامی سے روابط بڑھاتے ہوئے خود کو کھولا اور اپنی ہیئت اور روح میں زیادہ جمہوریانے کی شعوری کوششیں کیں۔اتفاقاً یہ تبدیلی انہی اداروں اہلیت اور مرتبے میں کمی کیساتھ واقع ہوئی۔

امریکی شہریوں کی اکثریت معاملے کو اسطرح نہیں دیکھتی۔ انکی شکایت عموماً بالکل مختلف زبان میں بیان کی جاتی ہے: ''مجھ جیسے آدمی کی بات کوئی نہیں سنتا۔'' ان مثالوں میں حقیقت بھی ہے ،اس حوالے سے کہ منظّم گروہ۔۔۔مفاداتی۔۔۔ واشنگٹن چلاتے ہیں، لیکن امریکی یہ ادراک نہیں کرتے کہ یہ گزشتہ چند دہائیوں کی تبدیلی کا براہ راست نتیجہ ہے۔ نظام جس قدر بھی کھلتا ہے، اسی قدر آسانی سے پیسہ، لابنگ کرنیوالے اور انتہا پسندوں کے زیرِ اثر آ سکتا ہے۔ واشنگٹن میں جو تبدیل ہوا ہے یہ نہیں کہ سیاستدانوں نے خود کو امریکی عوام سے دور کرلیا اور انکی بات سننے سے انکاری ہیں۔ یہ ہے کہ وہ شاذ و نادر ہی انکی شکایتیں سننے کے علاوہ کوئی کام کرتے ہیں۔

آج واشنگٹن میں پالسیاں عوامی رائے کے حصول کے مطابق بنتی ہیں۔ یہ اہلکاروں کی فوج مقرر کرتا ہے جو ہر ممکنہ مسئلے پر امریکی عوام کی رائے جاننے میں لگی رہتی ہے۔ان مسائل پر انکے احساسات جاننے کیلئے یہ دوسرے لوگ بھی طلب کرتا ہے۔ اسکے بعد بھی یہ لوگوں کو معاوضہ دیتا ہے کہ اندازہ لگائیں کہ کل کلاں لوگ کیا سوچ سکتے ہیں۔ لابنگ کرنیوالے، سماجی کارکن، مشیر اور سیاستدان سب اپنے کاموں کی بنیاد انہی معلومات کو بناتے ہیں۔ اس سارے عمل کے ذریعے ہر کوئی امریکی عوام کی ذہانت، ہمت اور کلی عظمت کی تعریف کرتا رہتا ہے۔

اس افسوسناک منظر کا تسکین آمیز پہلو یہی ہے کہ، جیسے جیسے یہ بھڑ دے گیری بڑھی ہے، سیاستدانوں کیطرف لوگوں کے رویہ میں تنزلی آئی ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران برطانوی وزیراعظم، ونسٹ چرچل کو اسکے ساتھی نے پارلیمنٹ میں نصیحت کی کہ ''اپنے کان

زمین پر رکھو۔'' اس نے یہ نشاندہی کرتے ہوئے جواب دیا'' برطانوی عوام ان رہنماؤں کی طرف دیکھتے ہوئے مشکل محسوس کریگی جو اس حالت میں ہوں۔'' امریکی عوام نے گزشتہ تیس برس میں اپنے لیڈروں کو اپنے سامنے جھکتے اور ناک رگڑتے دیکھا ہے۔۔۔اور انہوں نے اسے مسترد کردیا ہے۔شاید انہیں احساس ہوگیا کہ جمہوریت صرف اس کا نام نہیں۔

بالواسطہ جمہوریت

امریکہ میں جمہوریت ---مغرب کی بیشتر ریاستوں کی طرح--- تاریخی تناظر میں پیچیدہ سیاسی نظام کا عنصر رہا ہے۔جمہوری ڈھانچے میں، امریکہ میں متنوع ادارے ہیں، جن میں بیشتر، جیسا کہ ہم نے پہلے باب میں دیکھا، جمہوریت سے پرانے اور غیر جمہوری ہیں۔ عدلیہ اسکی ٹھوس ترین مثال ہے، جہاں غیر منتخب مردوں اور عورتوں کو وسیع اختیارات اور تاحیات رکنیت حاصل ہے۔لیکن مختلف نوعیت کی غیر سرکاری تنظیمیں اور سیاسی جماعتیں بھی فرد اور ریاست کے مابین ثالثی کرتی ہیں۔ان میں بیشتر ادارے، کچھ عرصے پہلے تک، غیر جمہوری انداز سے چلتے تھے۔ سیاسی جماعتوں کو لیں، جن میں امیدوار اور پلیٹ فارمز کا انتہائی منظّم جماعتی عہدیدار کرتے ہیں(ایک نظام جواب صرف ''دھوئیں سے بھرے کمرے'' کی علامت سے یاد کیا جاتا ہے،صحت کیلئے حساس دور میں ممکنہ بدترین تزہیک)۔جماعتوں کو، یقیناً، عوام کیلئے پرکشش بنانے کی ضرورت ہوتی ہے، پس وہ اپنے امیدوار اور پلیٹ فارمز کی تیاری یہی ذہن میں رکھ کر کرتے ہیں۔لیکن امیدواروں کا انتخاب اندر کھاتے کیا جاتا ہے،قبولیت کیلئے عوام میں جانے سے قبل۔مقنّنہ کے رکن بھی درجاتی اور بند انداز سے کام کرتے ہیں۔نمائندگان اور سینٹر معاملات، سودے بازی یا سمجھوتے کیلئے کمیٹی میں ملتے۔حتمی بل پر انکی رائے عوام مشتہر کی جاتی تھی لیکن داخلی کمیٹی کے ووٹ خفیہ رہتے تھے۔خیال یہ تھا کہ ان اداروں کو کرنے دیا جائے--- اور پھر عوام نتائج پر حکم لگاتے تھے۔

مقنّنہ بالواسطہ جمہوریت کی بہترین مثال ہے۔امریکی یہ انتخاب کرتے کہ انکے لیے قانون سازی کون کرے گا؛ وہ خود بل تحریر یا منظور نہیں کرتے۔اسی وجہ سے جیمز میڈیسن، ''آئین''(*Constitution*) کا مصنف، امریکہ کو جمہوریت تسلیم کرنے سے متفق نہیں تھا۔

جمہوریتیں براہ راست چلائی جاتی تھیں،عوامی اسمبلیوں کے ذریعے ،قدیم یونان کی شہری ریاستوں کی طرح--- جنہیں میڈیسن اورامریکہ کے دوسرے بانی پریشان ،غیرآزادخیال اور غیر مستحکم سمجھتے تھے۔ میڈیسن کی رائے میں، امریکہ کوری پبلک کہنا زیادہ موزوں ہے، جسمیں شہری انتظام چلانے کا اختیار اپنے نمائندے کو دیتے ہیں۔ بانیوں کی رائے میں،نمائندہ اور ری پبلک جمہوریت عوامی اختیار اور فیصلہ سازی کے مابین توازن قائم کرتی ہے۔

جمہوریت کے بیشتر ماہرین اس سے اتفاق کریں گے۔میڈیسن کے نظریہ کا مشہور ترین اظہار ایک انگریز نے کیا ہے،وِگ (*Whig*) سیاستدان اور فلسفی ایڈمنڈ برک،جس نے برسٹل میں انتخابی مہم کے دوران اہلِ حلقہ سے کہا، ''تمہیں اپنے نمائندے پر حق ہے، اسکے کاروبار پر ہی نہیں،فیصلوں پر بھی؛وہ تم سے وفاداری کی بجائے دغا کریگا اگر وہ تمہاری رائے کو ان پر قربان کردے---دراصل رکن کا انتخاب آپ کرتے ہیں ؛لیکن جب کر چکتے ہیں تو وہ برسٹل کا نہیں رہتا، پارلیمنٹ کا رکن بن جاتا ہے(6)۔''

1956ء میں سینٹر جان کینڈی نے کتاب تصنیف کی، ''پروفائیل ان کریج(*Profile in Courage*)''، جسمیں اس نے آٹھ امریکی رہنماؤں کی تعریف کی جنہوں نے عوام میں غیر مقبول رائے کا مقابلہ کیا۔کنیڈی نے یہ تصور رد کر دیا کہ ایک سینٹر ہونے کے ناطے اسکا کام صرف اپنے حلقے کی رائے کی عکاسی ہے:

> ''(اس) تصور کے مطابق تو میسا چیوسٹس کے عوام نے مجھے واشنگٹن اسلیے بھیجا کہ زلزلہ شناس آلے کیطرح لوگوں کے بدلتے رجحانات کی خبر دوں--- ووٹرون نے ہمیں اسلیئے منتخب کیا کہ انہیں ہماری جانچ پرکھ اور اس پر عمل کرنے کی اہلیت پر اعتماد ہے،اس پوزیشن پر جہاں ہم یہ تعین کرسکتے ہیں کہ انکا اپنا بہترین مفاد کیا ،قومی مفاد کا حصہ ہوتے ہوئے۔اسکا یہ مطلب بھی لیا جاسکتا ہے کہ ہمیں بعض مواقع پرعوامی رائے کی رہنمائی، آگاہی، درستگی اور بعض اوقات اسے نظرانداز بھی کرنا پڑتا ہے، جسکے لئے ہمیں منتخب کیا گیا ہے۔

کنیڈی نے جس کی تبلیغ کی اس پر عمل کیا یا نہیں، اہم یہ ہے کہ کتاب فوراً ہی قارئین کی منظورِ نظر بن گئی۔ اس نے پولٹزر ایوارڈ(*Pultizer Prize*) جیتا اور سب سے زیادہ بکنے

والی کتاب بن گئی۔ آج ایسے خیالات کا ممکن ہے احترام تو کیا جائے لیکن خوشگوار حیرت سے بھی دیکھے جائیں گے، کسی پرانی دنیا کی اجنبی باتیں سمجھی جائیں گی۔ سینیٹ سے ریٹائر ہوتے ہوئے بل بریڈ نے یاد کرتے ہوئے کہا تھا کہ اسکے کیریئر کے اختتام تک یہ رجحان تھا کہ ایک سیاستدان اپنی مقبولیت کو نظر انداز کر کے رائے اپناتا تو اسے بہادر نہیں احمق کہا جاتا تھا: ''اسکا مطلب یہ لیا جاتا تھا کہ تمہیں سیاست کی سمجھ نہیں۔'' گزشتہ 30 برسوں میں سینٹ بہت سے نفیس اور محترم افراد سے آباد رہی ہے۔ لیکن وہ سیاستدان تھے ولی نہیں۔ انہیں نظام میں رہ کر باقی رہنا اور آگے بڑھنا تھا اور یہ نظام چند برسوں میں بالکل ہی بدل گیا ہے۔ اسی لیے سینٹ کے کئی بہترین اراکین گزشتہ عشرے میں رضا کارانہ طور پر دستبردار ہو گئے ہیں۔ ان میں سے کم وبیش سب ہی یہ کہتے ہوئے گئے کہ سیاسی نظام قابو سے باہر ہو گیا ہے۔ ستم ظریفی، اپنی تمام تر عقل کے باوجود ان مردوں اور خواتین نے اس تبدیلی کے حق میں ووٹ دیئے جس نے امریکی سیاست کو انتہائی اثر پذیر، انتخاب کے سہارے چلنے والا اور ویسا بنا دیا جیسا یہ ہے۔ یہ انہوں نے جمہوریت کے پرچم تلے کیا، نیک ارادوں کے غلط نتائج نکلنے کی ٹھیک ٹھیک مثال۔

لین دین کے لیے آزاد

60ء کے عشرے کا اختتام اور 70ء کی ابتداء پرانی سیاسی جماعتوں کے جواز پر حملوں کا دور تھا۔ کساد بازاری کے بعد سے امریکی نظام کا جواز ایسے حملوں کی زد میں نہیں آیا تھا۔ شہری حقوق کی تحریک سے لیکر ویتنام، واٹر گیٹ اور شہری جرائم کے ''طویل گرم موسم'' سے ہوتے ہوئے، امریکیوں نے اپنی حکومت کی اساس کو للکارا۔ جیسے ہی 70ء کے عشرے کی ابتدا میں یہ انقلابی جوش ٹھنڈا ہوا، دانشور اور سیاستدان ناقدین کے سوالات کے جواب دینے پر غور کرنے لگے۔ اگر نظام درست نہ کیا گیا، بہت سوں کو خطرہ تھا، یہ اپنا بنیادی جواز ہی کھو دیگا۔ اور درست کرنا، جیسا کہ امریکہ میں اکثر ہوتا ہے، کا مطلب تھا جمہوریانا۔

کانگریس، حکومت کی اثر پذیر ترین شاخ، بدلنے والوں میں پہلی تھی۔ بند اور درجہ وار سمجھا جانیوالا ادارہ، 70ء کے آغاز میں، یہ ایسے بدلا جیسے لین دین کیا، لیڈروں کے ہاتھ سے اختیار لیکر سارے ارکان میں تقسیم کر دیئے۔ اس نے خود زیادہ پکڑ اور مختلف حوالوں سے

احتسابی عمل کے تحت لایا۔اس نے قوانین بدلے جومہم میں حصہ داری کے بارے میں تھے۔ مختصراً،اس نے خودکواور،نتیجہ،امریکی سیاسی نظام کو جمہوریا دیا۔

تین عشروں بعد،تقریباً جوکوئی بھی ان اصلاحات سے منسلک تھا— سیاستدان،صحافی، کارکن اور دانشور— کا خیال ہے کہ انہوں نے حالات گھمبیر کر دیئے ہیں۔''ہم نظام میں اصلاحات لا رہے تھے۔لیکن ہم نے زیادہ مشکلات پیدا کرلی ہیں جسقدر سلجھائیں،'' سینٹر جوزف بیڈن نے کہا، جو 1973ء میں ایوان کے رکن بنے۔''مہم میں پیسہ لگانے کے قوانین،آزادکونسل کا قانون— کوئی بھی اس طرح نہیں چلا جیسا سوچا گیا تھا۔'' سابقہ نظام مکمل ہونے سے کوسوں دور تھا۔سینٹ،چندِسریت کی بدترین سطح پر تھا،کم وبیش سوسال تک شہری حقوق قانون سازی میں سب سے بڑی رکاوٹ رہی۔لیکن نئے نظام کی بھی اپنی لولی لنگڑی خرابیاں تھیں۔

1974ء میں ایوان نمائندگان کے اراکین کی جماعت— واٹر گیٹ کے مُنے --- نے کمیٹی کی صدارت کے انتخاب کا طریقہ جمہوریا دیا،جماعتوں کے داخلی انتخابات استعمال کرنا نہ کہ سنیارٹی۔کمیٹی کے صدر کے اختیارات بھی کم کر دیئے۔مثلاً، جہاں وہ ذیلی کمیٹیوں کے مجوزہ قانون کورد کرسکتے تھے،اب انہیں ایسا کرنا تھا۔ذیلی کمیٹیوں کی تعداد 50 فیصد تک بڑھا دی گئی،تاکہ تمام ارکان کو قانون سازی کا موقعہ دیا جا سکے۔لامتناہی نئے اور ترمیمی بل پیش کرنے کیلئے بھی قوانین بدلے گئے، جوایوان کا کوئی بھی رکن پیش کرسکتا تھا، چاہے وہ متعلقہ کمیٹی سے کوئی واسطہ رکھتا تھا یا نہیں۔اس نئے اور زیادہ جمہوری نظام کو چلانے کیلئے کانگریس کا سٹاف 70ء کی دہائی میں 50 فیصد زیادہ ہوگیا۔مزید براں،اب انہیں انفرادی رکن مقرر کرتے تھے(اورانہی کو جوابدہ تھے)نہ کہ کمیٹی کا صدر۔

اس ادارے سے جو 20 یا اسکے قریب با اختیار رہنماؤں پر مشتمل تھا،کانگرس 535 آزادسیاسی ناظمین کا مجموعہ تھی،جونظام کواپنے مفادات کے حساب سے پہلے چلاتے تھے--یعنی،دوبارہ منتخب ہونے کیلئے۔کسی بھی طرح—بل،ترمیم،سسپنشن بل---نظام انفرادی ارکان کے مفادات کے لئے زیادہ اثر پذیر ہوگیا۔یہ غیر اراکین کی طرف بھی کہیں زیادہ اثر انداز تھا۔70ء کی دہائی میں ہونے والی اصلاحات میں سے جس نے سب سے زیادہ اثرات مرتب کیے، کمیٹی کے اجلاس اور ووٹنگ کو کھلے ماحول میں کرنیکا قانون تھا۔

قانون سازی کیلئے کمیٹی کے اجلاس بند کمرے میں ہوتے تھے۔صرف ارکان اورسینئر سٹاف کے چندلوگ موجود ہوتے۔1973ءتک اجلاس نہ صرف کسی کیلئے بھی عام تھے، بلکہ ہر ووٹ باقاعدہ ریکارڈ کیا جاتا۔ اس سے پہلے، ترمیمی بل پر ووٹنگ کیلئے اراکین ہاں یا ناں کیلئے چبوترے سے نیچے اترتے تھے۔ ووٹ شمار کر لیے جاتے تھے لیکن ہر رکن کی ذاتی رائے خفیہ رکھی جاتی تھی۔ اب ہر رکن ترمیمات پر کھلے عام ووٹ دینے کا پابند ہے۔ ان تبدیلیوں کا مقصد کانگرس کو زیادہ کھلا اور اثر پذیر بنانا ہے۔ یہ تو ہو گیا ہے۔۔۔ لیکن پیسہ، لابنگ کرنیوالے اورذاتی مفادات پر کام کرنیوالوں کیلئے۔

بیشتر امریکیوں کے پاس نہ تو وقت ہے، نہ دلچسپی اور نہ یہ رجحان کہ کانگریس کی کاروائی پر روزانہ کی بنیاد پرنظر رکھیں۔لیکن لابئسٹ اورمخصوص اداروں کیلئے کام کرنیوالوں کو ہے،اور وہ معلومات اوررسائی کو یہ یقینی بنانے کیلئے استعمال کرسکتے ہیں کہ آیا وفاقی بجٹ یا قوانین کی تیاری میں انکے متعلقہ گروپ کا خیال رکھا گیا ہے۔ یہ صرف لابئسٹ کیلئے ہی درست نہیں جو پیسہ چاہتے ہیں۔کسی بھی مسئلے پر، کیوبا پرخراب امریکی پالیسی سے لیکر کوٹہ سسٹم تک، منظم مفاداتی گروہ۔۔۔ قطع نظر کہ انکے حلقے کتنے ہی چھوٹے تھے۔۔۔ یقینی بنا سکتے تھے کہ حکومت انکی مرضی کے سامنے جھک گئی ہے۔ اصلاحات جواکثریت کی حکومت کیلئے لائی گئی تھیں نے اقلیت کی حکومت قائم کردی ہے۔

رابرٹ پیک ووڈ،جنہوں نے سینٹ میں1969ء سے1995ء میں اپنی دستبرداری تک خدمات انجام دیں، کہتے ہیں کہ اصلاحات نے کسی بل پر میرٹ کے مطابق رائے دینا نمائندگان کیلئے کٹھن کردیا ہے۔

> بیشتر اراکین حقیقتاً وہی کرنا چاہتے ہیں جسے وہ قومی مفاد میں سمجھتے ہیں۔تاہم، ایسا ہمیشہ آسان نہیں۔ لیکن سن شائن قوانین کے دور (جسمیں سرکاری سرگرمیاں کھلے ماحول میں انجام دینے کا کہا گیا تھا) سے پہلے یہ قدرے سہل تھا۔ جب ایک مفاداتی گروہ آیا تو آپ کہیں گے،''میں نے آپکی حمایت کی کوشش کی ۔واقعی کی۔لیکن چیئرمین نے مجھے ملنے نہیں دیا۔'' پھر،خودکو بچانے کیلئے،آپ چیئرمین کو بتائیں گے کہ جب وہ لوگ اندرآئے ،انکو بتانے کیلئے کہ آپ نے واقعی انکے مسئلے کیلئے بہت کوشش کی۔

لیکن جب لابئسٹ آپ کے ووٹوں کے بارے میں جان لیں گے تو اسے بطور اسلحہ استعمال کریں گے۔ سابق سینیٹر ڈیل بمپر نے نشاندہی کی

> ان گروہوں اپنے خلاف جانیوالوں سے پٹنے کیلئے بہت سخت حربے بنا رکھے ہیں۔ اچانک ہر ووٹ نے سیاسی اثر حاصل کرنا شروع کر دیا۔ یہ نہیں کہ ان گروہوں کا مفاد ناجائز ہے بلکہ یہ چھوٹے چھوٹے مسائل پر جھگڑ کر پورے نظام بگاڑ دیتے ہیں، کانگرس کو مفلوج، عوام کو بے توقیر اور نتیجہ کو خطرناک بنا دیتے ہیں(7)۔

حالیہ یادداشتوں میں جو واقعات محفوظ ہیں، جنمیں کانگرس نے ان مفاداتی گروہوں کا دباؤ جھیلا۔۔۔اور بہت ہی زیادہ۔۔۔ جب اس نے1986ء میں، مضبوط جماعتی حمایت سے ٹیکس اصلاحات منظور کیں جنہوں نے سینکڑوں خرابیاں اور گمنام سبسڈیز ختم کیں۔ اسکے بنانے والوں میں سے ایک، ڈین روزنکوسکی، جو House Ways and Means Committee کے چیئرمین تھے، نے دلیل دی کہ ایسا صرف اسی صورت ممکن ہوا جب میں نے بل کے مارک اپ کے موقعہ پر بند کمرے میں سماعت پر اصرار کیا۔ ''یوں نہیں کہ آپ عوام کو نظر انداز کرتے ہیں۔ صرف یہ کہ لابئسٹ ، پریشر گروپ اور تجارتی تنظیمیں۔۔۔ان سب کے اپنے اپنے منصوبے ہیں۔ اگر آپ عوام کے روبرو کچھ کریں گے تو ارکان لابئسٹ کی طرف دیکھیں گے اور لابئسٹ ہی ''ہاں'' اور ''ناں'' کا اشارہ کرینگے۔''*

*یقیناً، مارک اپ سیشن کے اختتام پر، لابنگ زور و شور سے شروع ہو جاتی تھی، گو کہ حلقہ اثر محدود تھا۔ سیاسی سائنسدان جیمز تھربر یادداشتیں بیان کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ کیسے لابئسٹ 1986ء کے ٹیکس اصلاحات کیلئے ایک کانگرسی اجلاس میں اپنے اپنے سیل فونز پر باتیں کر رہے تھے: ''وہ فوراً اس کمرے میں جو بھی اسے کال کرنے لگے، حتیٰ کہ ٹیکس بریک تبدیل کرنے کا سوچنے لگے۔ انکی فون کالز نے دلچسپی رکھنے والی پارٹیوں کو ہشیار کر دیا اور احتجاج کا ایک سیلاب سا آ گیا، فون کالز، خطوط اور فیکسز کے ذریعے۔ نمائندوں کیلئے کوئی سکون کا لمحہ نہیں ہوتا کہ وہ رک کر سوچیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ گزرے دنوں میں آپ کے پاس کچھ ماہ یا ہفتے، یا کم از کم کچھ دن ہوتے تھے۔ مگر اب آپ کے پاس صرف چند سیکنڈ ہی ہوتے ہیں کہ ایک لہر آ ٹکراتی ہے۔''

ماضی میں اٹکا ہوا

جیسے جیسے امریکی حکومت زیادہ عوامی اور وسیع ہوئی لابئسٹ واشنگٹن کی سب سے زیادہ ترقی پذیر صنعت بن گئے ہیں۔ اس سے متعلقہ ہر تبدیلی کیطرح، لابنگ کا ارتقاء بھی 60ء کے عشرے میں شروع ہوااور اس وقت سے جاری ہے۔ 50ء دہائی کے نصف میں واشنگٹن میں 5 ہزار رجسٹرڈ لابئسٹ تھے: 1970ء تک انکی تعداد دوگنا ہوگئی، 1990ء تک پھر دوگنا۔ ایک نہ ختم ہونیوالے چکر کی طرح ہر نیا مجوزہ قانون نئی لابنگ کو جنتا ہے، جو وفاقی بجٹ کا کچھ حصہ اپنے لئے حصہ یا اسے محفوظ بنانے کیلئے بنائے جاتے ہیں۔ جوناتھن راخ، واشنگٹن کے بہترین صحافی، نے بتایا کہ 1979ء میں واشنگٹن میں 117 ہیلتھ گروپ تھے۔ 1993ء میں، جب بل کلنٹن نے اس شعبہ میں وسیع پیمانے پر اصلاحات کا اعلان کیا، یہ تعداد سات گنا بڑھ گئی۔ کلنٹن کا ''حفظانِ صحت کا بل'' ناکام ہوگیا، کم وبیش تمام نئے گروپ قائم رہے، اپنے اپنے کاموں کے لیے کانگریس پر دباؤ ڈالتے رہے۔

اپنی اہم کتاب *Demosclerosis* میں راخ ایک معیشت دان مینکر اولسن کے خیالات کی تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مفاداتی گروہوں نے امریکی حکومت کو مفلوج کر دیا ہے۔ واشنگٹن کاٹ کر پہلے جگہ پر نہیں آسکتا--- سرے سے ختم کرنا تو دور کی بات ہے— حکومت کے کسی پروگرام کو بھی چاہے وہ کتنا ہی پرانا اور بیکار کیوں نہ ہو۔ اس حوالے سے راخ موہیر (اون کی ایک قسم) سبسڈی کی مثال دیتا ہے۔ 1954ء میں اون ''اہم سٹریٹجیک اکائی'' سمجھتی جاتی کیونکہ فوجی یونیفارم میں استعمال ہوتی تھی۔ حکومت نے اون کے پیداکاروں کو سبسڈی دینے کا فیصلہ کیا اور ایک کروڑ ڈالر گلہ بانوں کے حوالے کی، ایک فیصد سبسڈی کی نصف رقم لے اڑے۔ جیسا کہ ایسی سبسڈیز کیساتھ ہوتا ہے، یہ بھی کارآمد نہ ہوئی اور اسنے صنعت کو مزید غیر فعال کردیا۔ لیکن یہ صرف کہانی کا آغاز تھا۔ 6 برس بعد ڈیکرون جیسے مصنوعی کپڑے نے اون کو پینٹا گون کی سٹریٹجیک فہرست سے نکال باہر کیا۔ لیکن اون کی صنعت کے ترغیب کاروں نے کام جاری رکھا اور کانگریس کو راضی کرلیا کہ وہ رقم کی فراہمی جاری رکھے۔ تین عشروں کے بعد، وہ سبسڈی جو اپنے ہونے کیلئے 1960ء کے تمام جواز کھو چکی ہے، آج بھی پوری طرح قابو میں ہے۔ بالآخر، 1993ء میں کانگرس، اس ضیاع کی

بڑے پیمانے پر شہرت کے دباؤ میں آ کر، نے پروگرام ختم کر دیا۔ لیکن لابی کو ختم نہیں کر سکی۔ چند برس میں انکی محنت رنگ لائی اور موہیر سبسڈی انہیں واپس مل گئی ۔ یہ کم ہے اور ہر برس اسکی تجدید کرانا پڑتی ہے لیکن یہ اون کے لابسٹ کیلئے پریشان نہیں لگتی۔ آخر کار، یہ انہیں کرنے کیلئے تو کچھ دیتی ہے۔

اس مثال کو ایک لاکھ سے ضرب دیں، آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ امریکی حکومت کیوں، راخ کے بقول، ''ہڈیوں کی طرح سخت بن جانیوالے پروگراموں کا ایک ڈھیر بن گیا ہے، ابدی کیش کرنچ میں پھنسا ہوا'' بن گئی ہے۔ موہیر سبسڈی ایک طرح سے مثالی کیس ہے کیونکہ بالاخر پہلے اسے ختم کیا گیا اور پھر کاٹ چھانٹ ہوئی۔ کپاس کے پیداکار زیادہ فائدے میں رہے ہیں۔ امریکہ کپاس کے 25 ہزار پیدا کار ہیں، اوسطاً 8 لاکھ ڈالر مالیت۔ یہ 2 ارب ڈالر حکومت سے سبسڈی لیتے ہیں۔ بیشتر حکومتی پروگرام اب ابدی ہیں۔ میری ٹائم سبسڈیز 200 برس سے قائم رہے ہیں، اگرچہ پینٹا گون کے پاس اب اپنا بحری بیڑہ اور وہی اسے چلاتا ہے۔ زرعی سبسڈیز، کساد بازاری میں کسانوں کو عارضی ریلیف دینے کیلئے جاری کی گئی، لیکن اس قدر گہری اور بکواس ہے کہ کسانوں کو فصل اگانے کے پیسے دیئے جاتے ہیں جو بعد میں ضائع کر دی جاتی ہیں۔ دوہرے مفاد کی تازہ کارروائی، بش کی آزاد منڈی کی انتظامیہ اور مالیت کے ذمہ دار کانگرس نے ان سبسڈیز میں خاطر خواہ اضافے کے حق میں ووٹ دیا، انہیں کم کرنے کے بجٹ اور تجارتی دباؤ کے باوجود۔

امریکی تاریخ کے بیشتر دور میں لابسٹ کسی نہ کسی شکل میں موجود رہے ہیں، اور صدور گروور کلیولینڈ سے لیکر کیلون تک، نے انکے خلاف مہم چلائی۔ انکی تعداد اور دائرہ اثر میں دھماکہ خیز اضافہ 1960ء کی دہائی سے، کچھ تو اس وجہ سے ہے کہ گزشتہ تین سے چار عشروں میں حکومت بہت پھیل گئی؛ مؤثر لابنگ سے حاصل ہونیوالی رقم بھی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اسی قدر اہم، کانگریس کو اس قدر مانیٹر اور متاثر کیا جا سکتا ہے کہ پہلے کبھی ممکن نہ تھا۔ نتیجے میں، لابیز، جو مانیٹرنگ اور متاثر کرتے ہیں، نے اپنے ہدف---یعنی حکومت---کے مقابلے میں قوت حاصل کر لی ہے۔

آپ لبرل میں یا کنزرویٹو، صورتحال آپ کو مایوس کر سکتی ہے۔ قدامت پرستوں کیلئے اسکا مطلب ہے کہ وفاقی حکومت کے اخراجات میں کمی کا خواب ادھورا رہے گا۔ 80ء کے

عشرے کے آغاز سے، تین ریپبلک صدور (رونالڈ ریگن، جارج بش اور جارج ڈبلیو بش) ایک ریپبلکن سپیکر (نیوٹ گنگرک) اور ایک ڈیموکریٹ صدر (بل کلنٹن) نے سرکاری اخراجات گھٹانے کی کوشش کی ہے۔لیکن یہ مفاداتی گروپ طاقت کی حقیقت سے پیچ کر رہ گئے۔نتیجے میں، آٹھ برس میں ریگن 4 سرکاری پروگرام معطل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ڈیوڈ سٹاک مین، ریگن کے بجٹ ڈائریکٹر جو بجٹ کو عقلی بنیادوں پر استوار کرنے کیلئے مسیحائی کوششیں کرتے رہے، نے مایوسی سے نتیجہ نکالا کہ 1984ء تک ''ریگن کا وائٹ ہاؤس کم وبیش بنجر تھا کہ اخراجات کش پالیسی پر مسلسل عمل کرسکے۔'' 1989ء میں ریگن کی جگہ لینے پر بش سینئر نے مختلف حکمت عملی اپنائی حکومت کے 240 چھوٹے پروگرام منسوخ کرنیکی تجویز دی۔ اگرچہ بچت تھوڑی ہی تھی: تقریباً ساڑھے تین ارب ڈالر یا وفاقی حکومت کے کل اخراجات کے اعشاریہ 25 فیصد۔پھر بھی وہ کہیں زیادہ پرجوش ثابت ہوا۔ایک بار کانگرس تجاویز لیکر آگے بڑھی، صرف 8 منصوبے ختم کیے جاسکے، 58 ملین ڈالر کے برابر۔اسی طرح 1994ء میں کلنٹن کی تاریخ ساز بجٹ ڈیل سے 41 منصوبے ختم ہوئے، وفاقی بجٹ کی اعشاریہ صفر ایک فیصد رقم کے برابر۔

1994ء کا ریپبلک انقلاب راخ کے نظریہ کی کڑی آزمائش تھا۔ نیوٹ گینگرک اور اسکے تازہ دم ساتھی اس پلیٹ فارم سے اقتدار میں آئے جو واشنگٹن کے طریقہ کار میں تبدیلی، اور، خصوصاً بیکار سبسڈیز کو ختم کرنے پر تلا تھا۔ چار برس بعد، ریپبلکن انقلاب لڑکھڑانے لگا۔گنگرک نے سپیکر اور ایوان نمائندے کے عہدے سے استعفیٰ دیدیا۔ جو شخص کسی دور میں امریکہ کا با اثر ترین سیاستدان تھا، آج فاکس نیوز کا محض ایک تجزیہ نگار ہے۔ اگرچہ اس نے بہت سی سیاسی غلطیاں کیں، گنگرک اور ری پبلکنز کو معلوم ہوا کہ واشنگٹن کو بدلنا اس قدر آسان نہیں جس قدر بظاہر تھا۔

ری پبلکن نے آغاز 1995ء میں اس بجٹ تجاویز سے کیا جو 3 سو منصوبے ختم کرسکتا تھا، بیشتر کارپوریٹ ویلفیئر کے تھے، 15 ارب ڈالر بچائے جانے تھے۔ لابنگ شروع ہوئی۔ وفاقی بجٹ سے ''رائیگاں اخراجات'' کھانے والے تمام حلقوں کو اپنی جان بلکہ روٹی کے لالے پڑ گئے۔ دوسری طرف، کچھ لوگ کانگرس کے دفاتر میں فیکسوں کا سیلاب لے آئے اور اخراجات میں کمی کا مطالبہ کرنے لگے۔اس سے انکشاف ہوا کہ بیشتر امریکی چھوٹی حکومتیں

چاہتے تھے ،لیکن یہ وہ نہیں تھے جو کانگرسی ارکان کو بلاتے تھے۔تاہم ،حکومتی سبسڈیز سے مستفید ہونیوالوں نے ایسا کیا۔۔اور جوق در جوق۔ چند ماہ بعد ریپبلکن بجٹ منظور کرانے میں کامیاب ہو گئے جس میں کل صرف 1.5 ارب ڈالرز کی کٹوتی تھی، تخمینے کا محض 10 فیصد اور کل بجٹ کا اعشاریہ001 فیصد ۔اسکے بعد سے، کانگرس کی کارکردگی قدرے بہتر ہے، حکومت کے چند ارب ڈالر بچائے ہیں(1.8 ٹریلین ڈالرز کے وفاقی بجٹ میں سے)۔غیر متوقع اقتصادی ترقی نے ریکارڈ فاضل رقم پیدا کی تو لوگ یقین کرنے لگے کہ اخراجات پر قابو پانا غیر ضروری ہے۔ نئے اقتصادیات میں، رقم حکومت کے صندوق میں پانی کی طرح آئے گی۔ جارج ڈبلیو بش2000ء میں دو مالیاتی وعدے کر کے اقتدار میں آئے: ٹیکس کم کرنا اور اخراجات میں کٹوتی۔ ہمیشہ کی طرح موخرالذکر پر عمل کی نسبت اول الذکر سہل ثابت ہوا۔ انکے حکومت سنبھالنے سے لیکر اخراجات کل قومی پیداوار کی شرح سے بڑھے، 11 ستمبر کے بعد دفاعی اخراجات میں اضافے کو نکال بھی دیا جائے۔ وفاقی حکومت نے پہلے دو برسوں میں اس قدر رقم خرچ کی جسقدر کلنٹن نے پانچ برس میں کی تھی۔'' کہتے ہیں یہ دیو بھوکا مر جائے گا،'' انٹرپرائز انسٹی ٹیوٹ کے کیون ہیسے بش کی ٹیکس کٹوتی پالیسی کے حوالے سے کہتے ہیں،'' لیکن ہمارے پاس ایسا دیو ہے جو ہر قیمت پر روٹی ڈھونڈ رہا ہے(8)۔''

آزاد خیالوں کے لئے اس ناکامی کا مطلب ہے نئے مسائل اور موقعوں پر رئیل منی خرچ کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ٹیکس میں اضافہ منتخب کیا جا سکتا، اگر آپ ریاستی ، علاقائی اور پے رول محصولات بڑھائیں گے تو امریکی سمجھتے ہیں (حق بجانب ہیں) کہ ان پر ضرورت سے زیادہ بوجھ ڈالا جا رہا ہے۔پس موہیر کی پیداکاری یا مارجوف کی تخلیق کیلئے دی جانیوالی سبسڈی کا مطلب ہے تعلیم، خوراک یا انتظامی ڈھانچے کیلئے ایک کم ڈالر ۔مزید براں، کیونکہ ہر کوئی سمجھتا ہے کہ نئے پروگرام نہیں مرتے ،انہیں بنانے کے امکانات بڑھتے ہی جاتے ہیں۔فرینکلن روز ویلٹ کا خیال تھا کہ حکومت کو'' بے باک اور مسلسل تجربات کرتے رہنا چاہیے۔'' لیکن جیسا کہ راخ نے نکتہ اٹھایا، اسکے دنوں میں--- جب مٹھی بھر مفاداتی گروہ اسکے دروازے پر آتے تھے--- روز ویلٹ بہت سے نئے پروگرام شروع کر سکتا تھا کیونکہ وہ انہیں بند کر سکتا تھا جو بیکار تھے۔آج کی حکومت میں، غلطیوں سے سیکھنا ممکن نہیں رہا کیونکہ غلطیاں پتھر پر لکیر ہو جاتی ہیں۔ وفاقی حکومت کا کردار محض سٹیٹس کو حفاظت کرنے

تک محدود ہوکر رہ گیا ہے۔ صنعتیں، مسائل اور مستقبل کے مواقعوں کے پاس لابیز نہیں ہیں ،جو ماضی والوں کے پاس تھیں۔

جب حکومت اپنے اخراجات اور ترجیحات کی معقول وجہ اور منطق کرتی نظر نہیں آتی،لوگ نئے مسائل حل کرنے کی اسکی اہلیت پر یقین کھونے لگتے ہیں۔گزشتہ چند دہائیوں میں اہم ترین تبدیلیوں میں سے ایک نوجوان نسل میں وسیع پیمانے پر موجود یہ یقین ہے کہ موثر سماجی تبدیلی غیر حکومتی عنصر کی طرف سے آسکتی ہے،غیر سرکاری تنظیمیں، تھنک ٹینکس ، پریس یا ذاتی کاروبار۔آج امریکی حکومت کو ایک ڈائنوسار سمجھا جاتا ہے، اپنے ماضی میں جکڑا ہوا اور جو مستقبل کے مسائل پر ردِعمل ظاہر کرنے کے قابل نہیں رہا۔ کیا یہ حیران کن ہے کہ روشن دماغوں کے نوجوان سے اس سے شرمانے لگیں؟

راخ بھی اس تصور کا قائل ہوگیا تھا کہ ''امریکی حکومت ایسی بن گئی ہے جیسی یہ رہے گی: پیر پسارے ہوئے، عمومی طور پر خود منظّم جو 10 سے 20 فیصد سیاستدانوں اور ووٹرز کے اختیار میں جبکہ 80 سے 90 فیصد ہزاروں کلائینٹ گروپس کے قابو میں ہے۔ یہ صرف باہر باہر سے بدلے گی ،اس طرح کہ کلائینٹ گروپس کی خواہشات سے مطابقت رکھتا ہو،لیکن منظّم تبدیلی کا کوئی امکان نہیں یا اسطرح کہ ایک یا زیادہ کلائینٹ گروپس کا وجود خطرے میں ڈال دے۔'' آج کی امریکی حکومت کی یہ ستم ظریفی ہے۔امریکی عوام سمجھتے ہیں کہ انہیں حکومت پر کوئی حقیقی اختیار نہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ سیاستدانوں کو بھی اس پر اختیار نہیں ہے۔ بیشتر نمائندے اور سینٹرز یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایسے نظام کا حصہ ہیں جس میں تبدیلی کی سنجیدہ کوشش منظّم اور فوری مخالفت پیدا کر دیتی ہے،ان مٹھی بھر لوگوں کی طرف سے جنہیں اس تبدیلی سے زد پہنچتی ہے۔اور یہی اقلیتیں دراصل واشنگٹن چلاتی ہیں۔

فرقوں کا بگاڑ

امریکہ کے بانیوں کو شروع دن سے خوف تھا کہ چھوٹے چھوٹے گروہ اس کی سیاست کو یرغمال بنالیں گے۔ٹھیک اسی مسئلہ کی نشاندہی کرتے ہوئے، جسے اس نے ''فرقوں کا بگاڑ'' کہا،میڈیسن نے اسکا ذمہ ''عدم استحکام، ناانصافی اور الجھن پر ڈالا۔۔۔جو، دراصل، جان لیوا امراض ہیں جن سے عوامی حکومتیں ہر جگہ موت کا شکار ہوئی ہیں۔'' اپنے مشہور مضمون

میں،فیڈرلسٹ پیپرز 51، اس نے استدلال کیا کہ مسئلے کا موثر حل یہ ہوگا کہ تعلق داری اوراظہارِرائے کی آزادی محدود کی جائے، جوایسے گروپوں کوقائم ہونے دیتی ہے(''آزادی فرقہ بندی کیلئے ایسے ہے جیسے ہوا آگ کیلئے'')۔لیکن علاج بیماری سے زیادہ خطرناک تھا اسلئے میڈیسن جلد ہی اسے رد کردیا۔

اس کے بجائے میڈیسن نے امریکہ کے حجم اور پیچیدہ ڈھانچے پر اعتماد کر لیا۔ اولاً،اُس نے استدلال کیا،اقلیتوں کے جتھے آگے نہیں آسکتے کیونکہ دوسرے گروہ---اقلیت کوعددی شکست دیکر--- اٹھیں گے اورانہیں پچھاڑ دیں گے۔اگر یہ مضبوط ہوتے تب بھی، امریکہ جیسے وسیع اور متنوع ملک میں، ایک دوسرے سے نبردآزما فرقے اٹھیں گے اور ایک دوسرے کی نفی کریں گے۔صدافسوس! اس اہم نکتے پرمیڈیسن غلط تھا۔شاید اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ حکومت کے پاس اس قدر خزانہ ہوگا کہ خودغرضوں کے گلوں کواپنی طرف کھینچے گی۔لیکن میڈیسن کی دلیل میں ایک نظریاتی سقم بھی ہے۔اوسلان نے نکتہ اٹھایا ہے کہ محدود مفاداتی جتھوں کا بن جانا سہل ہے، کیونکہ انکے اراکین زیادہ حاصل کر لیتے ہیں جب کہ باقی ملک کا نقصان بہت تھوڑا ہوتا ہے۔یہ اسکا جز ہے جسے وہ ''اجتماعی عمل کی منطق'' کہتا ہے۔ اگر100 کسان مل کرحکومت پرمقدمہ کریں کہ انہیں ایک کروڑ ڈالر دیئے جائیں تو ہر کسان کے حصے میں ایک ایک لاکھ ڈالر آئیں گے۔ جبکہ باقی ملک کو چارسینٹ فی کس دینے ہونگے۔کون لابی بنائے گا--- وہ یا ہم؟ یہ مثال ہزاروں سے ضربیں تو آپ آج کی امریکی جمہوریت کا مسئلہ سمجھ لیں گے۔

یہ بھی ہے کہ فرقے ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتے۔اکثر مفاداتی گروہ دوسروں کو بڑھتا پھولتا دیکھ کرخوش ہوتے ہیں۔یہ پوچھنے پر کہ آیا وہ حریف گروپوں کی سبسڈی کی کٹوتی کی حمایت کرینگے، نیشنل الیکٹرک رورل کوآپریٹو کے بوگ برگ لینڈ کہنے لگے،''میرے خیال میں تمام اطراف سے حمایت کے حق میں زیادہ بہتر استدلال کیا جا سکتا ہے(9)۔'' یہ کسی ایک گروپ کی اس دلیل کی مدد کرتا ہے کہ دوسرے دھڑوں کونوازا جا رہا ہے-- ان کیساتھ امتیاز کیوں؟ جتنے زیادہ اسی قدر خوش۔آخرکار، ٹیکس میں خاص لُوپ حاصل کرنا سہل ہوگا اگر آپ دوسروں کیلئے بھی اسکی حمایت کریں۔نتیجہ میں حکومتی پالیسی مفاداتی گروپوں کا مجموعہ نہیں جوایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں اور عقلی نتیجہ پر پہنچتے ہیں، جیسا کہ میڈیسن نے

فرض کیا، بلکہ لین دین کا مجموعہ ہے، ایک کے بعد ایک چیز اور تنزل کی جانب۔ سیاست میں یہ کم ترین مزاحمت کا راستہ ہے، اور بیشتر اوقات یہی منتخب کیا جاتا ہے۔

یہ ان پالیسیوں کیلئے بھی درست ہے جن میں پیسے کا عمل دخل نہیں۔ کیوبا کیلئے امریکی پالیسی پر غور کریں۔ سرد جنگ کے دس برس بعد، دو باتیں یقینی ہونی چاہیے تھیں۔ اولاً، کیوبائی اشتراکیت امریکہ کیلئے دور دور تک بالکل سیاسی اور جغرافیائی خطرہ نہیں رہا، تاہم چاہے ہم فیدل کاسترو کی طرف سے انسانی حقوق کی پامالی کو کتنا ہی ناپسند کریں، پابندیوں کے ذریعے اسے اقتصادی تنہائی میں مبتلا کر دیں، لیکن یہ چیز صرف ملک پر اسکی گرفت مضبوط کرتی ہے کہ اسکے اپنے عوام کو متحرک کرنے کیلئے ایشو مل جاتا ہے۔ جیسا کہ تاریخی تجربہ بتاتا ہے، کیوبا کو آزاد خیال جمہوریت کی راہ پر ساتھ چلانے کیلئے جو کچھ ہم کر سکتے ہیں یہی ہے کہ باہر کی دنیا کیلئے اسکے کھولا جائے۔ امریکیوں کی اکثریت اس سے متفق تھی۔ یہی طریقہ ہے جو امریکہ نے دوسری دو جمہوریتوں کیساتھ معاملے میں استعمال کیا، چین اور ویتنام۔ کیوبا کیوں نہیں؟ جواب ہے دھڑے بندیاں۔ کاسترو مخالف کیوبن معاملے کو کنٹرول کئے ہوئے ہیں کیونکہ وہ اس پر سب سے زیادہ تلے ہیں اور انتخابی حوالے سے دو اہم ریاستوں میں رہتے ہیں: فلوریڈا اور نیو جرسی۔ گو کہ امریکیوں کی اکثریت مختلف رائے رکھتی ہو، صرف کیوبا نژاد امریکی ہی اسے چلاتے، پیسہ لگاتے اور ووٹ دیتے ہیں۔ پس دو ریاستوں کے مٹھی بھر لوگ امریکی خارجہ پالیسی کو چلانے میں کامیاب ہیں۔ ایسے ہی دوسرے معاملات، جن میں سرگرم اقلیت خاموش اکثریت پر غالب آتی ہے، عوام کو اسکی بہت کم قیمت چکانا پڑتی ہے۔

اہم ادارہ جو حالیہ عرصے تک ایسے دھڑوں اور سیاستدانوں کے درمیان بفرزون بنا وہ سیاسی جماعت ہے۔ مضبوط سیاسی جماعتیں متعدد مفاداتی دھڑوں کے درمیان ثالثی کر سکی ہیں اور، ایک چھتری کے نیچے لا کر، انہیں ایسا موقف پر مجبور کر سکتی ہیں جو کلیتًا جماعت میں ایکتا کو ظاہر کرتا ہو۔ یہ موقف بدل سکتے ہیں، لیکن کسی بھی تبدیلی پر جماعت کے اندر مذاکراتہ ہونے چاہئیں، جہاں سودے بازیوں پر بات ہوتی تھی اور جہاں جماعت کے عمومی ترین مفادات زیر بحث آتے تھے۔ اسی لیے کلنٹن روزیٹر، امریکی سیاست کے سرکردہ ماہر، نے کہا، جیسا کہ پہلے بھی حوالہ دیا گیا، ”کوئی امریکہ نہیں جمہوریت کے بغیر، کوئی سیاست نہیں جمہوریت کے بغیر، کوئی سیاست نہیں جماعتوں کے بغیر۔“ یقینًا، ہمیشہ سے تو ایسا نہیں ہوا

لیکن گزشتہ دوصدیوں سے زائد عرصے کے دوران سیاسی جماعتوں نے عوامی جذبات کی نمائندگی اور انکے مفادات کو جمہوری سیاست کے کارآمد ماحول میں لانے میں کافی بہتر کارکردگی دکھائی ہے۔اور ایسا یہ مستقبل میں کرسکتی ہیں کیونکہ امریکہ بڑے تکنیکی ،اقتصادی اور آبادیاتی تبدیلیوں سے گزر رہا ہے---سوائے اس حقیقت کے کہ سیاسی جماعتیں اب امریکہ میں اسطرح مزید وجودنہیں رکھتیں۔

جماعتوں کا زوال

دسمبر2000ء میں،جب دوبارہ گنتی کی فلوریڈا کی جنگ ختم ہوئی تھی،میں نے جارج سٹیفنو پولس،الیکٹرانک میڈیا صحافی اورسابق سیاسی پالیسی ساز،سے پوچھا،آیا انکا خیال ہے ڈیموکریٹک جماعت سابق نائب صدر الگور کو2004ء میں صدارتی امیدوار نامزد کرے گی۔ اس ہفتے کے تمام اخبارات ان رپورٹوں سے بھرے پڑے تھے کہ جماعت کے سرکردہ رہنما الگور سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔سٹیفنو پولس کے جواب آنکھیں کھولنے والا تھا،''کوئی ڈیموکریٹک جماعت نہیں ہے'' انہوں نے کہا۔''اگر گور الیکشن لڑنا چاہتے ہیں ،انہیں پیسے اکٹھے کرنے ہونگے ،اچھی مشہوری چاہیے ہوگی اور ووٹوں میں آگے بڑھنا ہوگا،جوانہیں زیادہ پیسہ اور پریس میں بہتر جگہ دلوائے گا۔ پارٹی لیڈر کیا سوچتے ہیں، اس سے فرق نہیں پڑتا کیونکہ پارٹی کا مزیدکوئی وجودنہیں۔ جوخود کو''بڑا'' بتاتے ہیں صرف پرانے سیاستدان ہیں اور کرنے کیلیئے کچھ چاہتے ہیں۔''

سیاسی جماعتوں کی آج امریکہ میں خاص اہمیت نہیں ہے۔گزشتہ ایک نسل کے دوران جماعتیں اسقدر کھلی اور غیر مرکزی ہوگئی ہیں کہ کوئی انہیں کنٹرول نہیں کرتا۔مشینیں اور انکے مالک،جماعتی تنظیم،رضا کاروں کی فوج،اور جماعتوں کے بڑے،اپنی اہمیت کھوچکے ہیں۔جماعت،بہت حد تک ،ٹیلی وژنی امید وار کیلیئے پیسہ جمع کرنیکی مشین ہیں۔اگر ایک امید وار مقبول ہے اور جماعت نامزدگی جیت جاتا ہے تو جماعت حمایتی بن جاتی ہے۔یہ ~~امیدوار پھر تھوڑا اور فائدہ اٹھاتا ہے،مزید وسائل حاصل کر کے،تنظیمی حمایت سے،اور ممکنہ~~ ڈونرز کی نئی فہرست دیکر۔دراصل،پرائمری امیدوار پارٹی کیخلاف لڑنا مفید جانتے ہیں۔یہ مخالفت مہم کو ایک نیا پن اورعوام پر انکے متعلق اس طرح کا تاثر دیتی ہے کہ یہ نظام کیخلاف

جدو جہد کر رہا ہے---ایک طریقہ جو جارج میگوورن، رونالڈریگن اور جمی کارٹر کے کام آئی۔آج یہ حکمت زیادہ مشکل ہے کیونکہ اسٹیبلشمنٹ ہی نہیں جسکے خلاف لڑا جائے۔1992ء میں ڈیموکریٹ اسٹیبلشمنٹ کا امیدوار کون تھا؟ بل کلنٹن، باب کیری یا پال سانیگا؟ ان میں سے کوئی نہیں۔* جارج ڈبلیو بش کی کامیابی انکے اسٹیبلشمنٹ کا امیدوار ہونے کی نہیں بلکہ خاندان کا امیدوار ہونیکی مرہون منت ہے؛ انکے پاس دو چیزیں تھیں جو غیر جماعتی نظام میں آپ کے پاس ہونی چاہییں: جانا پہچانا نام اور فنڈز ریزنگ مشین۔ جسکے پاس دونوں ہیں، چاہے اسے سیاست میں تجربہ ہے یا نہیں، بہت فائدہ میں ہے۔پس اس نئے اور ''جمہوری'' نظام میں، ہم نے پہلے سے کہیں زیادہ سیاسی سلطنتیں، ہر دلعزیز افسر، اور ارب پتی سیاستدان دیکھے ہیں۔اور یہ صرف آغاز ہے۔جیسے جیسے سیاسی جماعت زوال پذیر ہوتی ہے، امیر اور یا مشہور ہونا منتخب ادارے تک رسائی کیلئے معمول کا راستہ بن جائیگا۔

امریکہ کی بیشتر تاریخ میں، صدارتی امید وار اپنی جماعتوں کے عکس تھے۔آج، جماعتیں اپنے امیدوارں کی عکاس ہیں۔اگر امیدوار مرکز کی طرف جاتا ہے تو جماعت بھی مرکز کی مڑ جاتی ہے۔ امیدوار بائیں بازو کو لتاڑے تو جماعت بھی لتاڑتی ہے۔کلنٹن نیوڈیموکریٹ کی حیثیت سے منتخب ہوئے تو واشنگٹن میں ڈیموکریٹ ڈھونڈے سے نہیں ملتا تھا۔جارج ڈبلیو بش نے اعلان کیا کہ وہ سچے قدامت پرست ہیں، ڈیموکریٹ پارٹی پر انکشاف ہوا کہ وہ بھی شروع دن سے ایسے ہی تو تھے۔ سیاسی جماعتیں خالی برتن ہیں، اس انتظار میں کہ کوئی عوامی رہنما انہیں بھر دے۔

جس گولی نے امریکی سیاسی جماعت کی جان لی وہ پرائمری الیکشن ہے۔ جماعتوں کا مقصد عام انتخابات میں مقابلہ ہوتا ہے۔ اسلئے امید وار کی نامزدگی وہ مشکل ترین فیصلہ ہے جو کوئی جماعت کرتی ہے۔ایک بار جب یہ کام جماعت کی تنظیم سے نکال کر ووٹر کے ہاتھ میں دیدیا گیا، جماعت کھوکھلی ہوگئی۔ اسلئے دوسری جمہوریتوں کی سیاسی جماعتوں نے امیدواروں کے انتخاب میں اپنا عمل دخل ترک نہیں کیا ہے۔ پرائمری الیکشن خالصتاً امریکی

*اس اصول کو سینٹر رابرٹ ڈول کی غیر معمولی مثال ثابت کرتی ہے، جنہوں نے 1996ء میں ڈیموکریٹ نامزدگی تقریباً جماعت کی برس ہا برس خدمت کے صلے میں حاصل کی۔

اور جدید دور کا مظہر ہے۔ یہ کیوں اور کیسے ظاہر ہوا ایک دلچسپ کہانی ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ امریکہ میں سیاسی جماعت کی جان لے لی گئی ہے، غلط ہو گا؛ دراصل اس نے خودکشی کر لی ہے(10)۔

براہ راست پرائمری الیکشن نے 20 ویں صدی کی پہلی چوتھائی میں اگنا شروع کیا، ترقی پسند عہد کے کرپٹ جماعتوں پر چڑھائی کے حصے کے طور پر (''ووٹر نہ کہ پارٹی کے باس کو فیصلہ کرنے دو!'')۔ انہوں نے امریکیوں کی ''مزید'' جمہورت کی خواہش کو پرکشش نظر آئے۔ لیکن پرائمری کی طرف پہلے دھکے نے جماعتی نظام کی ہیئت میں زیادہ تبدیلی نہ لائی۔ 1912ء سے 1968ء کے دوران براہ راست پرائمریز کے فاتح 23 میں سے 10 مرتبہ جماعتی نامزدگی حاصل کر پائے (اسمیں موجودہ صدور کی تعداد شامل نہیں، جو جماعت کی طرف سے ہمیشہ نامزد کئے جاتے تھے)۔ 1960ء میں صرف 16 ریاستوں نے ڈیموکریٹک پرائمریز جبکہ 15 ریاستوں میں ریپبلک پرائمریز کا انعقاد کیا۔ پرائمری انتخابات نے قومی سیاسی کنونشن کیلئے 38 فیصد وفود کا انتخاب کیا۔ جماعت کے موجودہ لیڈر شپ--- منتخب نمائندے، مقامی و علاقائی رہنما اور منتظمین--- ووٹوں اور اختیارات کی اکثریت اپنے پاس رکھتے تھے۔ پرائمریز ایک طریقہ تھے جسکے تحت عام ووٹروں کی نظر میں کسی امیدوار کی قدر و قیمت جانچی جاتی تھی۔ جان کنیڈی نے مغربی ورجینا کامیاب ہوئے، تو انہوں نے ثابت کر دیا کہ ایک کیتھولک جنوب میں مقبول ہوسکتا ہے۔ تاہم، سٹیس کیفاور نے متعدد پرائمری الیکشن جیتے لیکن 1952ء میں جماعتی نامزدگی سے محروم رہے، کیونکہ ادلائی سٹیونسن کو جماعتی انتظامیہ کی حمایت تھی۔ ونیڈل وکی پرائمری الیکشن میں شامل بھی نہیں ہوئے تھے مگر 1940ء میں ریپبلکن سے نامزدگی حاصل کر لی۔

1960ء کے احتجاجوں کا ایک مرکزی خیال--- شہری حقوق کی تحریک، ویتنام کے جلوس، 1968ء میں ڈیموکریٹک کنونشن کے باہر تصادم، حتیٰ کہ ووڈ سٹاک پر ---زیادہ شراکتی سیاست کی ضرورت پر زور تھا۔ ان مطالبوں کا جواب دینے کی کوشش میں، ڈیموکریٹ جماعت نے زیادہ جمہوری ہونے کا فیصلہ کیا: اس نے امیدوار منتخب کرنیکا طریقہ یکسر تبدیل کر دیا۔ پرائمری نے قومی کنونشن میں وفود کے انتخابات کے لیے فوراً ہی دوسرے طریقوں کی جگہ لے لی اور 1980ء تک 70 فیصد وفود کا انتخاب براہِ راست پرائمریز میں ہوا تھا۔ ری

پبلکن نے ڈیموکریٹ کے نقش قدم کی پیروی کی:1980ء تک 75 فیصد ری پبلکن وفود پرایمریز سے منتخب کئے جاتے تھے۔آج دونوں جماعتوں کیلئے یہ شرح 80 فیصد سے زائد ہے،اور باقی شرح عام طور پراسکو ووٹ دیتی ہے جو پرائمری جیتتا ہے(درحقیقت، یہ سکینڈل سمجھا جاتا تھا اگر یہ وفود امیدواروں کے بارے میں اپنے فیصلے کو میرٹ پر کرتے تھے)۔

پرائمری ووٹرز جماعت میں اکثریتی رائے تشکیل نہیں دے سکتے، پورے امریکہ میں تو دور کی بات ہے۔(آخری صدارتی انتخابات میں 25 فیصد رجسٹرڈ ووٹروں نے پرائمری میں ووٹ دیا، ووٹ دینے کے قابل آبادی کا محض 18 فیصد ہے)۔ نتیجے میں دونوں جماعتی کنونشنوں کے وفود اپنے اوسط ارکان کی نسبت انتہا پسندی کیطرف زیادہ رجحان رکھتے ہیں۔یہ بات سمجھ آتی ہے ،کیونکہ وفود جماعت کے اوسط ارکان کی نہیں بلکہ اوسط فعال، پرائمری اراکین کی نمائندگی کرتے ہیں۔(یہ سوچیں کہ آپ کتنے ایسے لوگوں کو جانتے ہیں جو پارٹی کے فعال رضا کار ہیں اور تمام پرایمریز میں ووٹ دیتے ہیں۔)مثلاً2000ء میں 10 فیصد ری پبلکن وفود کا خیال تھا کہ بجٹ کی فاضل رقم میڈی کیئر اور سوشل سکیورٹی پر خرچ ہونی چاہئے ،نسبتاً46 فیصد ری پبلکن ووٹروں کے۔صرف 24فیصد ری پبلکن وفود نے حمایت کی کہ سافٹ منی (*Soft Money*) پر پابندی عائد کی جانے چاہیے ،گوکہ 64فیصد ووٹروں کی یہ رائے تھی۔اسی طرح ،صرف 10 فیصد ڈیموکریٹ وفود نے سکول واچرز کی حمایت کی جبکہ 41 فیصد ووٹروں نے اسے درست کہا۔ڈیموکریٹ کے 20 فیصد وفود نے 46 فیصد ووٹرز نے سزائے موت کی حمایت کی(11)۔جماعتی اور تقریباً ہر مسئلے پر وفود اور ووٹرز میں خلیج بار بار خود کو دہراتی ہے۔ستم ظریفی یہ، پرانے کرتا دھرتا جماعت کے رینک اور شہرت کی کہیں زیادہ نمائندگی کرتے تھے---اور ملک کی بھی---نہ نسبت آج کے پیشہ ور کارکنوں کے۔نیا سیاسی ''میدان'' بہت تنگ ہوتا جارہا ہے۔

صدارتی انتخابات عوامی ترین عمل ہے اور جن امیدوارں کا ان کیلئے انتخاب کیا جاتا ہے،سیاست کے مرکز سے اٹھ کر آتے ہیں۔لیکن دوسرے سیاستدان اپنے پرائمری حلقہ انتخاب سے منتخب ہوتے اوراس سے متاثر ہوتے ہیں۔پس سیاسی جماعتیں مین سٹریم پالیسی سازوں کی کم اور اپنے مضبوط ترین فعال گروپ اور آرگنائزر کی زیادہ نمائندگی کرتی ہیں---وہ جو پرائمری کے دوران ووٹرز کو متحرک کرتی ہیں۔اسطرح ''جمہوریائی'' اصلاحات

نے اشرافیہ کونہیں مٹایا،صرف انکا متبادل لایا ہے، اور کسی بہتری کیلئے بھی نہیں۔ پرانی جماعت کی جڑیں گردونواح، بلدیاتی حکومت اور بڑے پیمانے کی تنظیموں میں تھی، جیسا کہ یونین اور تاجر تنظیمیں۔ نئی جماعت واشنگٹن پروفیشنلز کے دباؤ میں ہیں— کارکن، نظریاتیوں، فنڈ لانیوالوں اور رائے شماری کنندہ۔ یہی وجہ ہے کہ اب بھی واشنگٹن عوام سے زیادہ یک مرکزی ہو گیا ہے اور جماعتوں کی حدود پار کرکے لین دین اور سمجھوتے اسقدر مشکل ہو گئے ہیں۔ آج کا سیاسی نظام ڈیل سے زیادہ ڈیڈ لاک کو ترجیح دیتا ہے؛ یہ فنڈ ریزنگ کیلئے بہتر ہے۔

پیسہ بنانے کی مشین

پرائمری نظام نے جمہوری تضاد پیدا کیا جو اصلاحات کی حالیہ تاریخ میں باربار نظر آیا، جس میں اکثریتی رائے اقلیت میں بدل جاتی ہے۔ یہ دوبارہ مہم کی فنانسنگ کی اصلاحات میں نظر آئی۔ 1970ء کے عشرے کی فنانس اصلاحات کے بارے میں سمجھا گیا کہ نظام زیادہ لوگوں کی رسائی میں آئے گا۔ چند بڑی پارٹیوں پر سیاستدان کا انحصار ختم کرنے کی کوشش میں، نئے اقدامات میں ایک امیدوار کیلئے ایک ہزار ڈالر فی کس فنڈ کی حد لگا دی گئی۔ سیاسی جماعتیں فی امیدوار 5,000 ڈالر فراہم کرسکتی تھیں۔ انہیں کارپوریٹ پولیٹیکل ایکشن کمیٹیاں (پی اے سی) بھی تشکیل دینے کو کہا گیا، جو چھوٹے حصہ داروں کو اپنے وسائل جمع کرنے کا موقع دیتی تھیں تا کہ ایک مشترکہ پالیسی کا ہدف مقرر کیا جاسکے۔ پی اے سی میں انفرادی حصہ داری 5000 ڈالر نے زیادہ نہیں ہوسکتی تھی۔ ان اصلاحات کے باوجود، پی اے سی کو ان تمام مسائل کی علامت سمجھا جاتا ہے جو امریکہ کے موجودہ مہم فنانسنگ نظام کو درپیش ہیں۔

انتخابی مہم کی فنانسنگ کے جمہوریانے نے امریکی سیاست کی ماہیت بدل دی ہے، اور بہتری کی جانب نہیں۔ نقد رقم کیلئے چند بڑے ڈونرز پر انحصار کرنیکی بجائے--- جنکے ناموں کی ہمیشہ اچھی خاصی تشہیر کی جاتی تھی--- امیدوار مجبور تھے کہ چھوٹے چھوٹے حصوں میں ہزاروں لوگوں اور پی اے سی سے رقم اکٹھی کریں، جنکے ایجنڈے نہ تو اس قدر منظر عام پر آتے ہیں اور نہ ہی کوئی پوچھ گچھ ہوتی ہے۔ اس نے دلالوں کا ایک نیا گروہ پیدا کیا ہے: فنڈ ریزر۔ صحافی اور وائٹ ہاؤس میں تقاریر کے سابق مصنف ڈیوڈ فرم نے واضح کیا:

''ایک ہزار ڈالر کی انفرادی حد اور 36 ملین ڈالر کے اخراجات کی حد کیساتھ یہ ممکن نہیں رہا چند ایک نرالے لاکھ پتی تلاش کر لیں۔ اب امیدوار کو پرائمیریز سے پہلے کا سارا اہم سال ہزاروں حصہ داروں کی حمایت حاصل کرنے میں گزرتا ہے۔ یہ ایسے ہے جیسے چمچے سے ایک ٹب بھرنا۔ کیونکہ وحشتناک حد تک مصمم ارادے والا امیدوار بھی اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کو ورغلا نہیں سکتا، اسے پہلے تو رولوڈیکس (Rolodex) چند سو استادوں کی حمایت حاصل کرنا پڑتی ہے جنہوں نے فنڈ ریزنگ دعوتوں، کوک ٹیل پارٹیوں، ناشتہ پر ملاقاتوں اور پر تکلف عشائیے، جو ہر اہم علاقے میں مالدار ڈیموکریٹ اور ری پبلکن سے مطلوبہ کوٹہ کے فنڈ نکلوانے کیلئے ضروری ہیں، دینے میں اپنا لوہا منوایا ہوا اور اس کیلئے بھی ایسا کرنے پر راضی ہوں (12)۔''

نتیجہ میں، سرمایہ سازی سیاسی مہم کی بنیادی سرگرمی بن گئی ہے اور فنڈ ریزنگ دعوتوں پر اچھی کارکردگی دکھانا جدید امریکی سیاستدان کیلئے بنیادی اور ناگزیر فن قرار پایا ہے۔ اگر جماعتوں کے بڑے ہیں تو وہ ''رولوڈیکس کے آقا'' بن گئے ہیں، جن کے بغیر کوئی مہم زمین سے پیر نہیں اٹھا سکتی۔ ان سب تبدیلیوں نے سیاسی جماعتوں کو کمزور کرنے میں حصہ ڈالا ہے۔ انتخابی مہم میں تازہ ترین اصلاحات صرف اس رجحان میں اضافہ کریں گی، کیونکہ یہ سیاسی جماعتوں کو مزید کمزور کرتی ہیں۔ جماعتوں کے پاس جو واحد کرنسی تھی وہ سافٹ منی (Soft Money) تھی جو وہ اپنے امیدواروں کے حق میں استعمال کر سکتے تھے۔ اب یہ رقم خرچ کی جائے گی— کیونکہ یہ خرچ ''ہوگی''— جماعتوں کے ہاتھ سے نہیں بلکہ ان مشکوک گروپوں اور تنظیموں کے ہاتھوں سے جو کم عوامی اور کسی کو جوابدہ ہیں۔ رولوڈیکس کے آقا ملک کی سیاسی زندگی کیلئے اور بھی اہم ہو گئے ہیں۔

مہم فنانسنگ پر ان تبدیلیوں کا سنگین ترین اثر یہ ہوا ہے کہ انہوں نے سیاستدانوں کو مزید کمزور کر دیا ہے۔ سیاستدانوں پر ہمیشہ یہ صحت مند خوف مسلط رہنا چاہیے کہ اسے اکثریت رائے سے باہر بھی نکالا جا سکتا ہے۔ اسکا نام جمہوریت ہے---ایک حد تک۔ لیکن آج سیاستدانوں کو یہ جنونی، سب کچھ نگلنے والا، مستقل وہم ہے کہ وہ شکست سے ہمیشہ ایک قدم دور رہنا چاہتے ہیں۔ جماعتوں کی چھتری اور حمایت کھو دینے کے بعد، امریکی

سیاستدان ''انتخابی دنیا میں تنہا ہی چلتے ہیں''، برطانوی سیاسی سائنسدان انتھونی کنگ کے الفاظ میں۔ امیدوار اپنی قوت جماعت میں اپنے مقام ،کامیابیوں اور پارٹی کے بڑوں کیساتھ اپنی مہارتوں سے حاصل کرنے کے عادی ہیں۔اب یہ اسے پولنگ، حلقے میں خدمات ، خاص مفادات کے تحفظ اور سرمایہ سازی میں اپنی کاروباری صلاحیتیں استعمال کر کے حاصل کرتے ہیں۔لیکن اسکا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ تنہا ہیں اور ہمیشہ اتفاق سے ہی دیوالیہ اور نتیجہ،عہدہ کھونے سے ایک ہی قدم پیچھے رہتے ہیں۔اگر وہ کوئی غیر معروف کام کریں ، جماعت انکا ساتھ نہیں دیتی ، کانگرس ساتھ نہیں دیتا، میڈیا انکونہیں بچاتا۔جیسا کہ کنگ نے لکھا،''ان کو ایک ایک کر کے لیا جا سکتا ہے؛وہ یہ جانتے ہیں؛وہ اپنا رویہ اسکے مطابق رکھتے ہیں(**13**)۔''

انتخابات کا امکان ایک سیاستدان کے ذہن پر چھایا رہتا ہے۔اور امریکی سیاستدان تمام فکریں ختم کر کے اب یکسوئی سے آئندہ الیکشن جیتنے پر توجہ لگائے ہوئے ہیں،اسلئے نہیں کہ وہ اپنے پیشرووں سے بدترین مخلوق ہیں بلکہ اسلئے کہ نظام انہیں اس سمت میں دھکیلتا ہے۔پس جدید امریکی سیاست کا افسوسناک منظر نامہ،جسمیں سیاستدان مسلسل لابیز کو راضی کرنے میں رہتے ہیں، ووٹر خریدتے ہیں، مفادات کے آگے جھکتے ہیں اور پیسہ جمع کرتے ہیں۔ یقیناً یہ بہتر حکومت کو جنم نہیں دے سکتا— اس سے بالکل برعکس---اسلئے بہتر حکومت کی تلاش جاری رہتی ہے۔امریکہ میں اسکا مطلب ہے''مزید'' جمہوریت ، اس مرتبہ ریفرنڈم کے ذریعے۔

بلاواسطہ جمہوریت

براہ راست عوام سے حکومت لینے کا تصور اس قدر قدیم ہے جس قدر ریاستہائے متحدہ امریکہ۔ بلکہ اس سے بھی قدیم: پہلا ریفرنڈم 1640ء میں میسا چیوسٹس بے کالونی(*Massachusets Bay Colony*) میں ہوا۔اور 18ویں اور 19ویں صدی کے دوران، وفاقی اور ریاستی آئین منظوری کیلئے براہ راست عوام کے سامنے پیش کیے جاتے رہے ہیں ۔لیکن جب یہ آئین اپنا لئے جاتے ،حکومت کا ایک نظام تشکیل دے دیتے ، ریفرنڈم دم توڑ دیتے۔19ویں صدی کے دوران عدالتیں مسلسل فیصلے دیتی رہیں کہ ریفرنڈم

غیرآئینی ہے، یہ قدیم تصور سامنے رکھتے ہوئے کہ عوام کو قانون سازی کے اختیارات ایک بار دیئے جائیں تو واپس نہیں لیے جا سکتے--*delgeta postesta non potest-delgari*۔ نمائندہ جمہوریت،19ویں صدی کے خیال میں،کام نہیں کرسکتی اگر خاتمہ اسکے اردگرد چکر لگاتا رہا۔

یہ سب کچھ بدل گیا1898ء میں جنوبی ڈکوٹا سے شروع ہوکر۔ 19 ویں صدی کا اختتامی سنہری دور نے متعدد خوش قسمت اور بڑے بڑے کارخانے پیدا کیئے۔ بڑے کاروبار--- خصوصاً ریل کی پٹڑیاں بچھانا--- اکثر ریاستی قانون ساز اداروں کیساتھ تعلقات رکھتے تھے، پیسے اور سیاست میں ایک انسیت قائم کرتے تھے۔ (عشروں بعد،امریکہ یہی منظر ایشیا کی ابھرتی معیشتوں میں دیکھ کر ششدر رہ گیا اور انہیں لنگوٹیا سرمایہ داری کا نام دیا)۔ ترقی پسند اصلاح کار اس پختہ روایتی کرپشن سے بہت مایوس اور پریشان تھے،اورقانون سازوں اداروں کو پس پشت ڈالنے کا فیصلہ کیا،عوامی اقدامات کو براہ راست عوام تک لے گئے۔ ریاستی آئین میں ترامیم کیلئے دباؤ ڈالا،جس نے ریفرنڈم ،تحریک گزاری اور تنسیخ کی گنجائش رکھے---سب کچھ اسطرح ترتیب دیا گیا کہ عوام کو زیادہ قوت دی جائے تا کہ وہ مخصوص مفادات کی طاقت پر قابو پائیں جو قانون ساز اداروں کو چلاتے ہیں۔(دوسری اہم ترقی پسند اصلاح آئینی ترمیم تھی جسمیں سینیٹرز کا براہ راست انتخاب کا قیام تھا، جو1910ء کی ابتداء تک قانون ساز منتخب کرتے تھے۔) اصلاح پسندوں کو یقین تھا کہ وہ سیاست کو خالص ،غیر بدعنوان حالت میں واپس لائیں گے،جسمیں عام آدمی نہ کہ چند دولتمند حکومت کریں گے۔ ان اصلاحات کے مرکز میں،مورخ رچرڈ نے لکھا،''ایک نیک نیت انسان'' کا تصور تھا--- وہ عوام آدمی کی طرح سوچے اور عمل کریگا،نہ کہ مفاداتی گروہوں کی طرح جو ہر لمحہ اسکے شکار پر تیار رہتے ہیں---ان جماعتوں کا رکن بننے سے کہیں دور جو اسکے مفادات آگے بڑھائیں،وہ--- خود ہی حکومت کے مسائل کی طرف اعلیٰ سوچ کے ساتھ رجوع کریگا۔''

1920ء کے عشرے تک بیشتر ریاستوں نے مختلف قوانین بنا لئے تھے جو کسی حد تک بلاواسطہ جمہوریت کی گنجائش نکالتے تھے۔لیکن جیسے ہی سیاست کو پاک کیا گیا اور ترقی پسند دور ختم ہوا، ریفرنڈم کا جوش بھی ٹھنڈا پڑ گیا۔30ء سے لیکر60ء کے عشروں میں یہ بتدریج گھٹتا

گیا۔لیکن 60ء کی دہائی کے آخر میں، جب ''اسٹیبلشمنٹ'' کیخلاف حملوں میں اضافہ ہوااور شراکتی جمہوریت کے حق میں تقریریں زور پکڑنے لگیں، براہ راست عوام سے رجوع کرنے کا تصور دوبارہ زندہ ہوا،خصوصاً ڈیموکریٹ کے بائیں بازو نے۔ اگرچہ اسکے بیشتر حمایتی بائیں بازو سے تھے،تاہم، اس تحریک گزاری کی اس مہم کوسب سے زیادہ اٹھان دس برس بعد دائیں بازو سے ہی ملی۔1978ء میں ہارورڈ جاروس نے کیلیفورنیا شق نمبر 13 تیار کی اور ایسا کرتے ہوئے، کہتے ہیں، اس نے امریکی تاریخ کا دھارا بدل ڈالا۔

شق 13 نے دو بظاہر مختلف پہلوؤں کو یکجا کیا: ٹیکس اور ریفرنڈم۔60ء اور 70ء کے عشروں میں ہر قسم کے ٹیکس بڑھ چکے تھے، جیسا کہ لائینڈن جانز گریٹ سوسائٹی، استحاقی اخراجات ،اور نئے شہری منصوبے بڑھ رہے تھے۔(60ء کی دہائی میں، یقین کریں یا نہ کریں، آپ منتخب ہوجاتے ،اگرلوگوں پرٹیکس میں اضافہ کرکے وہ رقم بڑی بڑی پبلک سکیموں پر لگانے کا وعدہ کرلیں۔) کیلیفورنیا میں، 70ء کے عشرے میں ہاؤسنگ سوسائٹیز میں عروج کے باعث پراپرٹی ٹیکس آسمانوں سے باتیں کرنے لگا، اور مقنّنہ قومی خزانے میں اربوں ڈالر فاضل رقوم کی موجودگی کے باوجود ان میں کمی پر راضی نہیں تھا۔شق نمبر 13 نے بڑے پیمانے پر رول بیک تجویز کیا، انہیں 1975ء کی شرح پر لانا اور یہ حدود قائم کرنا کہ آئندہ ان میں کس حد تک اضافہ کیا جائے گا۔

ٹیکسوں کے خلاف عوام میں پائے جانیوالے شدید غصے کے باوجود شق نمبر 13 کے پاس ہونے کی امید نہیں تھی۔ جاروس کو زبانی دعوے کرنیوالا سمجھا جاتا تھا۔ سان فرانسسکو کرانیکل نے اسے ''ستر سالہ ملیریا زدہ بوڑھا بڑھکی قرار دیا جو ٹیکسوں کو حکومت سے منظور شدہ ڈکیتی کہتا ہے (14)۔'' کیلیفورنیا کے تمام بڑی سیاسی شخصیات نے اسکی مخالفت کی، جن میں ریاست کا سب سے بڑا اقدامت پرست سابق گورنر ریگن بھی شامل تھا، جو اسے انتہا پسندی شمار کرتا تھا۔انتخابات سے ایک ماہ پہلے رائے شماری نے بتایا کہ تحریک گزاری کے حمایتی اور مخالف شماریاتی خلاف میں ہیں اور 20 فیصد ووٹر تاحال فیصلہ نہیں کر پائے۔ پھر، جون انتخابات سے تین ہفتے قبل لاس اینجلس کاؤنٹی کے جائزہ کار نے اپنی سالانہ رپورٹ میں پراپرٹی ٹیکس میں حیران کن اضافہ کی نشاندہی کی۔سٹوری بالکل صحیح وقت پر آئی اور، غم وغصہ کی ایک نئی لہر میں شق نمبر تیرہ 65 فیصد ووٹوں سے پاس ہوگئی۔

انتخابات کے نتائج کے بعد اسٹیبلشمنٹ کینگرو کی طرح بھیڑ چال میں شریک ہوگئی۔
یُوفن جاروس سیاسی نابغہ روزگار جاروس بن گیا،ٹائم (Time)اور نیوز ویک (Newsweek) کے سرِ ورق پر چھپنے اور عالمی لیڈروں، جیسا کہ مارگریٹ تھیچر اور یاک شیراک سے ملاقاتیں کرنے لگا۔ رائے شماری کے چند ہفتوں بعد ریگن نے ری پبلکن پارٹی پر زور دیا''شق نمبر 13 پر کیلیفورنیا کی ووٹنگ کو استعمال کرے جنگل میں حزبِ اختلاف کی آگ بھڑکائے ،مہنگی اور بے انتہا بااختیار حکومت کیخلاف۔''انہوں نے ایسا ہی کیا۔ شق نمبر 13 نے ٹیکس میں کمی کو ری پبلکن پارٹی کے ایجنڈا میں سرفہرست رکھ دیا۔ بہت سے ڈیموکریٹس نے بھی یہ سبق پڑھ لیا۔ کیلیفورنیا کے آزاد خیال گورنر، جیری براؤن، نے ایشو پر اپنی رائے کو''دوسرا جنم'' کہا۔ ملک کے تمام سیاستدان ٹیکس میں کمی کے منصوبے لانے لگے۔ نیو جرسی کے سینٹ کے ڈیموکریٹ امیدوار، بل بریڈلے، نے اس وعدے پر اپنی مہم چلائی کہ وہ وفاقی ٹیکسوں میں 25 ارب ڈالر تک کمی لائیگا۔ شق نمبر 13 کے پانچ ماہ بعد، نومبر 1978ء میں،16 ریاستوں نے ٹیکس پالیسی پر ریفرنڈم کروایا۔

لیکن شق نمبر 13 کی اس بھی پرزور یادگار تھی، جو کیلیفورنیا میں گزشتہ 4 برسوں میں پہلا ریفرنڈم تھا۔ اس نے پبلک پالیسی بدلنے کا آسان ترین،اور جادوئی راستہ مہیا کر دیا۔ بجائے اسکے کہ ڈھیروں قانون سازوں سے دفتر کے باہر ووٹ ڈلوائے جائیں یا بل کے حق میں لینے کیلئے لابنگ کیجائے ، کیوں نہ قوانین براہ راست ہی پاس کرا لیں؟ 1970ء تک ریفرنڈم کی تعداد پہلے ہی بڑھ چکی تھی،1978ء کے بعد یہ ریگن کی جنگل میں آگ کی طرح پھیلے۔60ء کی دہائی میں ملک میں عوام کو 88 معاملات پر رائے دینے کو کہا گیا۔70ء میں یہ تعداد 181 اور 80ء کے عشرے میں 257 تک جا پہنچی۔90ء کے عشرے تک تحریک گزاری کی تعداد تین گنا بڑھ کر 378 ہو چکی تھی۔ صرف 2000ء میں ووٹرز نے 204 معاملات میں ووٹ دیئے، جن میں صحت عامہ سے لیکر تعلیمی اصلاحات، ہم جنس پرستوں کے حقوق اور سہل مرگی وغیرہ شامل ہیں۔

کیا اس نے کام دکھایا ہے؟ گزشتہ دو دہائیوں میں ریفرنڈم، تحریک منظوری اور تنسیخ کیساتھ مسلسل تجربات دیکھے ہیں(15)۔ یقیناً، بہت آسان ہے، کسی مسئلہ کو دیکھیں جس پر عوام نے مثبت جواب دیا۔۔ کسی کے خیال میں کہ وہ صحیح ہے۔۔۔میں اور کہیں،''یہ نظام کافی

بہتر ہے کیونکہ اس نے اچھے نتائج دیئے ہیں۔ مقننہ کبھی بھی یہ قانون منظور نہ کرتی۔'' اسی لیے دائیں بازو نے تحریک گزاری پر گذشتہ چند دہائیوں سے نکتہ چینی کرتے آئے ہیں۔ لیکن قانون سازی کی ایک مثال سلسلہ وار تبدیلی کو جانچنے کا تنگ نظر انداز ہے۔ آخرکار، ووٹر ایسی بہت سی چیزوں پر مثبت رائے دے سکتے ہیں جو کسی کیلئے نا قابل قبول ہیں۔ جیسا کہ بائیں بازو نے اپنی جڑیں مضبوط کیں ہیں اور اپنے مسائل پر ریفرنڈم میں کامیابی حاصل کی ہے، قدامت پرستوں نے کیلیفورنیا کیلئے اپنی پالیسی میں مضحکہ خیز تبدیلی لائی ہے۔ جب سے رچرڈ نکسن اور ریگن کے سالوں نے اس ریاست میں قدامت پرستی کو کامیاب کیا ہے، دائیں بازو نے نہ فرض کر لیا ہے کہ کیلیفورنیا ہواؤں کا رخ بتانے والی ریاست تھی۔ اسکے ریفرنڈم مستقبل کیطرف اشارہ کرتے تھے۔ لیکن اب، جبکہ کیلیفورنیا کی لبرل اکثریت اپنے من پسند قوانین منظور کرنے لگی ہے، قدامت پرستوں نے فیصلہ کیا ہے کہ ملک کی سب سے زیادہ آبادی والی ریاست مافوق الفطرت، خوابوں میں رہنے والی غیر سیاسی جماعت ہے جو باقی ملک سے قطعاً الگ تھلک ہے۔ اب، قدامت پرستوں کیلئے اسکے ریفرنڈم ماضی کا حصہ ہیں(16)۔ جیسا کہ آزاد خیالوں کی کامیابیاں دوسری ریاستوں میں بڑھیں، قدامت پرست سوچ سکتے ہیں کہ انہوں نے تحریک گزاری کی حمایت ہی کیوں کی تھی۔ لبرل، دوسری طرف، جو جمہوری قانون سازی پر شکوہ کرتے، ریفرنڈم کیلئے محبت دوبارہ جگانے لگے تھے۔ حتیٰ کہ وقت کا دھارا پھر بدل گیا۔

بعض یہ کہہ سکتے ہیں، ریفرنڈم نے نئے مسائل بھی سامنے لائے ہیں جن پر سیاسی اشرافیہ بات کرنے سے انکاری رہے۔ اصل میں ایسا نہیں۔ مثال کے طور پر ٹیکس کو لیں۔ شق نمبر 13 نے غالباً قومی ایجنڈے پر ٹیکس کی کمی کو لانے پر تیزی دکھائی ہے۔ لیکن یہ رجحان پہلے ہی ظاہر ہونے لگا تھا اور سیاستدان بھی اس پر لپکنے لگے تھے۔ 1970ء کے عشرے کے اختتام تک، امریکی وسیع حکومت سے غیر مطمئن ہو گئے اور ہر سطح پر قدامت پرستوں کو ووٹ دینے لگے تھے۔ گیس کے کنکشن، افراط زر، 60ء کی ثقافتی بغاوت سے زیادہ، روسی توسیع پسندی سے زیادہ، 70ء کے اختتام پر ٹیکس امریکی سیاست کا گرما گرم موضوع تھا۔ پولسٹر رچرڈ ورلین نے کہا، ''اگر آپ کسی مسئلے پر اس قدر توجہ چاہتے ہیں تو ویتنام جنگ کے زمانے میں لوٹنا ہو گا(17)۔'' اگرچہ شق نمبر 13 نے ٹیکس کمی کی تحریک کو ایک طاقت ور دھکا دیا، ریپبلکن

پارٹی پہلکے ہی اسے قبول چکی تھی، ڈیموکریٹ خوفزدہ تھے اور مسئلے پر عوامی رائے انتہائی واضح تھی۔ اگر شق نمبر 13 نہ ہوتی، ٹیکس کٹوتی بھی اسی تیزی کے ساتھ آگے نکل جاتی۔

تحریک گزاری کو جانچنے کے بہتر معیار قانون سازی بذریعہ رائے شماری کو مقننہ کے ذریعے قانون سازی پر فوقیت ہے۔ بلاواسطہ جمہوریت کے اس نئے نظام کے کیا اثرات ہیں؟ بہترین جواب کی جگہ ہے کیلیفورنیا۔ بہت حوالوں سے کیلیفورنیا بلاواسطہ جمہوریت کا مثالی نمونہ ہے، چھوٹے بڑے مختلف مسائل پر ریفرنڈم کے تجربے کرر کھے ہیں۔ کیلیفورنیا آنیوالے حالات کا پیش خیمہ ہوسکتی ہے۔ یہ امریکہ کی سب سے زیادہ آبادی والی ریاست ہے، معیشت فارمنگ، نئ معیشت اور پرانی دفاعی صنعتوں کا مجموعہ ہے۔ اسکی آبادی کثیر النسلی، کثیر الفرقہ، کثیر المذہبی اور حتیٰ کہ کثیر الزبان ہے۔ اہم ترین یہ ہے کہ کیلیفورنیا نے ٹیکنالوجی، اشیاء کی کھپت، نئے رجحانات متعارف کرانے، طرز زندگی اور تفریح میں امریکہ، بلکہ ساری دنیا، کی سرداری کی ہے۔ یہیں کار نے پہلی مرتبہ اپنا بھرپور چہرہ دکھایا، جہاں گردونواح پھیلے، جہاں جم جانے نے چرچ کی جگہ لی، جہاں بکری۔ پنیر کا پزا ایجاد ہوا۔ اور وہ تکنیکی اور نظریاتی قوتیں جنہوں نے بہتیروں کو یقین دلایا کہ بلاواسطہ جمہوریت مستقبل لہر ہے--- روبہ زوال سیاسی جماعتیں، ٹیلی کمیوٹنگ، نئ ٹیکنالوجی، انٹرنیٹ کی پیداوار نسل--- اس وسیع وعریض سرزمین میں بہت اچھی حالت میں ہیں۔ سوئٹزرلینڈ سے باہر--- جو دنیا سے غیر معمولی ہے، رجحان دینے والا نہیں--- کیلیفورنیا معاصر دنیا میں بلاواسطہ جمہوریت کا مکمل مظہر ہے۔ اور کیلیفورنیا اگر واقعی مستقبل کی آواز ہے، ہم نے مستقبل دیکھ لیا ہے، اور یہ کامیاب نہیں۔

کیلیفورنیا کا خواب

حقائق کوئی نہیں جھٹلاتا۔ 50ء اور 60ء کے آغاز میں کیلیفورنیا کو امریکہ کی بہترین ریاست ہونے کا اعزاز بلاشرکتِ غیر حاصل تھا۔ ''نمبر ایک ریاست'' 1962ء میں نیوزویک (Newsweek) کے ایک شمارے کا سرورق تھا، ''ترقی کرتا کیلیفورنیا'' ٹائم (Time) کو اتفاق تھا؛ اسکا ٹائٹل تھا ''کیلیفورنیا: جوش وخروش کی ریاست''۔ یہاں پرجوش ہونے کیلئے کافی سامان تھا۔ ریاست کی معیشت روز افزوں ترقی کر رہی تھی، اور ٹیکس کی معقول شرح سے

اس نے غیر معمولی اور بڑھتے ہوئے وسائل بنا لئے تھے،ترقی یافتہ سڑکوں اورنہری نظام سے لیکر فعال پولیس اور پارکوں، چڑیا گھروں تک۔عالمی معیار کا تعلیمی نظام کا حصول ریاست کا تاج تھا،جو کنڈرگارٹن سے شروع ہوتا اور یونیورسٹی آف کیلیفورنیا کے پرشکوہ عمارت پرختم ہوتا۔کیلیفورنیئن نہال ہوکر مطمئن تھے،سرد اورنم آلود شمال مغرب کے دانشوروں کو پل پل پریشان کرتے تھے(''تمام کند ذہن اور خوش لوگ''، ووڈی ایلن نے کہا تھا)۔لیکن باقی دنیا کیلئے روشن، مستحکم اورخوش انتظام کیلیفورنیا امریکہ کے تابناک مستقبل کی علامت تھی۔کیلیفورنیا امریکہ کا خواب تھی۔

آج کا کیلیفورنیا ایک مختلف کہانی ہے۔2001ء کی بہار میں کیلیفورنیا تاریکی میں ڈوب گیا،اوربجلی کی کمی نے مجھے بھارت کی یاد دلا دی۔(دراصل وہ بدترین چیز تھے جسکا میں نے بڑے ہوتے تجربہ کیا تھا۔)یقیناً،کیلیفورنیا سیلیکون ویلی اور ہالی ووڈ کا مسکن ہے،امریکی صنعت اور تخلیقیت کے دو بڑے مرکز۔لیکن یہ اسکا پرائیویٹ سیکٹر ہے۔ اسکا پبلک سیکٹر---حقیقتاً یہ پبلک لائف ہے--- کم نہ ہونے والا گند ہے ۔ریاستی اور مقامی حکومتیں ہرسال مالیاتی خسارے سے بچنے کیلئے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔سڑکیں جو کسی دور میں دنیا کیلئے مثال تھیں،آج واقعی گر رہی ہیں،اورٹریفک ایک ڈراؤنا خواب بن گیا ہے اور پیداویت پر بوجھ۔50ء میں کیلیفورنیا نے بجٹ کا22 فیصد بنیادی ڈھانچہ پر خرچ کیا؛ آج بمشکل 5 فیصد ہے۔عوامی سیرگاہیں اب صرف بھاری داخلہ فیسوں پر ہی گزارا کرتی ہیں۔ ریاست کا تعلیمی نظام زمین بوس ہوگیا ہے؛اسکے سکول ملک کے باقی سکولوں کے مقابلے میں نیچے درجوں پر آتے ہیں،جب اخراجات امتحانوں میں حاصل کردہ نمبروں یا طلباء کی مہارتوں کے حوالے سے انکا موازنہ کیا جائے۔

یونیورسٹی آف کیلیفورنیا نے تیس برس سے اپنی عمارت میں توسیع نہیں کی،اس حقیقت کے باوجود کہ ریاست کی آبادی دوگنا ہوچکی ہے۔دوسری طرف، جید صحافی پیٹر شرگ اپنی مایہ ناز کتاب ''پیراڈائز لاسٹ(*Paradise Los*) میں اشارہ کرتے ہیں کہ 20 برس میں ریاست کو 20 نئ جیلیں تعمیر کرنا پڑیں۔1993ء میں دی اکنامسٹ نے نتیجہ اخذ کیا کہ ریاست کا ''پورا نظام حکومت لڑکھڑانے لگا ہے۔'' تین برس بعد بزنس ہائیر ایجوکیشن فورم، جس میں تجربہ کار بزنس مین، ماہرین تعلیم شامل ہیں، نے خبردی کہ بنا کسی بڑی تبدیلی کے

''کیلیفورنیا میں معیار زندگی روبہ زوال رہیگا،نقل وحمل کے مسائل، بڑھتے ہوئے جرائم، سماجی بے چینی اور کاروبار کی نقل مکانی کی وجہ سے۔'' یہ اس وقت لکھا گیا تھا جب امریکی معیشت 30 برسوں میں بہترین حالت میں تھی۔ کیلیفورنیا کی اس حالت زار کا سب سے ٹھوس ثبوت یہ ہے کہ دائیں اور بائیں، دونوں بازوؤں کی جماعتیں اس پر متفق ہیں۔ شرگ، جولبرل قدامت پسند شارح ہے، کی بات دہراتے ہوئے بارنس نے ہفتہ روزہ ویکلی سٹینڈرڈ(*Weekly Standard*) کی سرورق کی کہانی میں بتایا کہ ریاستی حکومت نے کام چھوڑ دیا؛ ''کیلیفورنیا اپنا مقام کھوبیٹھی ہے، کہ ریاست اپنی موثر حکومت، اعلیٰ ترین سکولوں اور گاڑیوں کیلئے مفید ٹریفک نظام کیلئے قابلِ رشک تھی **(18)**۔''

کیلیفورنیا کے تمام مسائل کے اسباب ریفرنڈم اور تحریک گزاری کیساتھ تجربات میں تلاش نہیں کئے جا سکتے۔ ریاست کے بیشتر مسائل غیر ضروری کھلے پن، غیر درجہ وار، غیر جماعتی، تحریک گزاری کیلئے دوستانہ جمہوریت کا نتیجہ ہیں۔ کیلیفورنیا نے ایسا سیاسی نظام جنا ہے جو انارکی سے اسی قدر قریب ہے جس قدر ایک مہذب معاشرہ ہوسکتا ہے۔ تحریک گزاری کے حالیہ لہر کا جائزہ لیں۔ شق نمبر 13 کے بعد، ریاست نے درجنوں دوسرے قوانین منظور کئے ہیں، ان میں شق نمبر 4 (جو ریاستی اخراجات مخصوص فیصد تک محدود کردیتا ہے)، شق نمبر 62 (جسکے تحت ٹیکسوں میں اضافے کیلئے غیر معمولی اکثریت لازم ہے)، شق نمبر 98 (اسکے تحت بجٹ کا 90 فیصد تعلیم پر خرچ کرنا ضروری ہے) اور شق نمبر 218 (جو مقامی لوکل فیس اور محصولات پر شق نمبر 13 کی پابندیاں لگاتا ہے) بھی شامل ہیں۔ اسکے باوجود، ریاستی مقنّنہ کو مالیات پر کوئی اختیار نہیں کیونکہ یہ ویسے ہی خرچ ہونگے جیسے قوانین یا ریفرنڈم میں منظور کیا گیا۔ آج کیلیفورنیا کا 85 فیصد ریاستی بجٹ مقنّنہ یا گورنر کے اختیار سے باہر ہے— ایسا منظر جو امریکہ اور غالباً ساری دنیا میں بے مثال ہے۔ ریاستی بجٹ کا بڑا حصہ ''طے شدہ'' ہوتا ہے۔ مقنّنہ باقی 15 فیصد میں کھنچا تانی کرتی ہے۔ کیلیفورنیا میں اختیارات کسی کے ہاتھ میں نہیں۔ یہ منتشر ہیں، کیونکہ حکومت مجرد قوانین اور فارمولوں کے تحت بنتی ہے۔ امید یہی نظر آتی ہے کہ حکومت چلائی جاسکتی ہے، بقول شرگ (*Schrag*) کے، ایک ''نیوٹنی مشین کی طرح جو منتخب نمائندوں کی طرف سے کسی بھی اہم اختیار یا فیصلے کو مامون کرتی ہے۔ یہ نہ صرف جمہوریت کو آدرش کا پر مزاح بگاڑ بنادے گی بلکہ چلانے کیلئے بھی تقریباً ناممکن بنادے

گا(19)۔''

ریفرنڈمز کی طرف یہ بتا دینے پر بھی وہ کیا کرتے ہیں، سیاستدان کی طرف سے اس مینڈیٹ کو حقیقت میں بدلنا درکار ہے۔تحریک گزاریوں نے اس عمل غیر فعال کر دیا ہے کہ سیاستدانوں پر ذمہ داری تو ہے لیکن اختیارات نہیں۔ کیلیفورنیا سے دور علاقوں میں ریفرنڈم کے تجربات نے ثابت کیا ہے کہ یہ صرف سنہری ریاست کا مسئلہ نہیں۔ کنکٹیکٹ کانفرنس آف میونسپلٹیز (Connecticut Conference of Munciplaties) نے کہا کہ 169 میں سے 72 ریاستیں بجٹ منظور کرانے کیلئے ریفرنڈم کراتی ہیں، جوان کے بلدیاتی افسران پیش کرتے ہیں۔ ان 72 میں سے 52 کو اضافی ریفرنڈم کرنا پڑتے ہیں، اکثر ایک سے زائد مرتبہ، کیونکہ مجوزہ بجٹ رد ہو جاتا ہے۔ بیشتر ریفرنڈم میں مطالبہ ہوتا ہے کہ حکومتی افسران ٹیکس کم کریں اور خدمات میں بھی اضافہ کر دیں۔'' آپ کو ان دوہرے مطالبوں کو پورا کرنے کیلئے جادوگر بننا پڑتا ہے''، سی سی ایم کے قانون ساز سروسز ڈائریکٹر جیمز جے فنلے شکایت کرتے ہیں(20)۔

عوام کی طرف سے پریشان کن تجاویز نے گڈمڈ، اکثر متضاد قوانین بنائے ہیں، کسی بحث، سوچ بچار اور سمجھوتوں کے بغیر جو قانون سازی کا خاصا ہیں۔تحریک گزاری کی ''اوپر یا نیچے'' کی بے لچک ماہیت حقیقت کیساتھ بہت زیادہ تاؤ بھاؤ یا سمجھوتے کیلئے جگہ نہیں چھوڑتی۔ کسی برس کیلیفورنیا میں تعلیم پر 36 فیصد بجٹ خرچ کرنا مناسب ہو، منشور شدہ 40 فیصد کے، تو بہت برا ہے۔

ایک اور غیر شعوری نتیجہ، تحریک گزاری نے احتساب کا تصور ختم کر دیا ہے جو کبھی سیاستدانوں اور عوامی حکمت عملی میں تھا۔ٹیکس اور اخراجات کے عمل پر رومی طرز کی تقسیم عائد کر کے کیلیفورنیا کے ووٹروں نے اپنے سیاستدانوں کی کارکردگی جانچنے کے راستے خود ہی بند کر دیئے ہیں۔ کسی پروگرام کیلئے رقم کم پڑے، مقننہ نے ناکافی رقم مختص کی، یا مقامی اداروں نے بہت زیادہ خرچ کیا، یا ریاستی تحریک گزاری نے انکے ہاتھ باندھ دیے؟ آپ اسکے بعد سامنے آنے والی الزام ایک دوسرے کے سر تھوپنے کی کاروائیوں کا سوچ سکتے ہیں، کیلیفورنیا کی 58 کاؤنٹیز، 447 شہروں اور 5000 سے زائد خاص ڈسٹرکٹوں کو ذہن میں رکھ کر۔ طاقت اور ذمہ داری کا فقدان احترام کی کمی پیدا کرتا ہے۔ کیلیفورنیا کی ریاستی حکومت اور اسکی مقننہ

عوامی منظوری کے حوالے سے امریکی ریاستوں کی درجہ بندی میں سب سے نیچے ہے۔ اپنے منتخب رہنماؤں کو کمزور کرنے کے بعد کیلیفورنیئن ششدر ہیں کہ انہوں نے ریاست کے مسائل حل کیلئے کچھ نہیں کیا۔

مثلاً، غیر قانونی تارکین وطن اور ایجابی عمل (*affirmative action*) کے مسائل حل کرنے کے طریقے میں کیلیفورنیا کے فرق پر غور کریں، دونوں کو استصواب رائے سے حل کیا گیا، اور وفاقی حکومت کیطرف سے ویلفیئر اصلاحات کو دیکھیں، جو قانون سازی سے حل کیا گیا۔ یقیناً، ویلفیئر ریفارم کیلئے اختیار کیا گیا راستہ زیادہ طویل اور تھکا دینے والا ہے۔ اسکے حمایتیوں کو پہلے قومی بحث کا آغاز کرنا تھا، کانگرس کے دونوں ایوانوں میں مطلوبہ ووٹ لینے تھے اور صدر کلنٹن کو اس پر دستخط کیلئے راضی کرنا تھا، جو انہوں نے تیسری بار کوئی بھی بل وصول کرنے پر کرنے ہی ہوتے ہیں۔ لیکن بحث، آگے پیچھے، اور سمجھوتوں میں دوحزبی حل دستیاب ہوا جس میں دونوں فریقوں کے تحفظات ختم ہوگئے۔ یہ حل بھی درجہ بدرجہ ہوا، جیسا کہ کسی بھی بڑے ملک میں اہم قانونی تبدیلی کو سجتا ہے۔ نتیجہ، ویلفیئر ریفارم کو وسیع سیاسی حمایت تھی، قانون کے مطابق سمجھا جاتا تھا، عمل درآمد کیلئے وقت اور وسائل دیئے گئے، اور اس طرح نافذ کیا گیا جس سے ردعمل سامنے نہیں آیا۔ آج اسے کامیابی تصور کیا جاتا ہے اور کانگریس میں موجودگی ری پبلکن اور کلنٹن اس پر فخر کرتے ہیں۔

اسکا موازنہ شق نمبر 187 (غیر قانونی تارکین وطن) اور 209 سے کریں۔ منظّم گروہ، چند سیاستدانوں کی معاونت سے، مسئلہ کو سیاسی جماعتوں اور مقنّنہ، باقاعدہ سیاسی عمل سے باہر لے گئے، اور مہنگی ٹی وی مہم جاری کر دی۔ وہ جیت گئے، اور دونوں شقیں قانون بن گئیں۔ لیکن کیونکہ کوئی قانون سازی کا عمل نہ تھا، سیاسی لین دین نہ تھا، کسی قسم کا غور وخوض غیر موجود تھا، دونوں شقوں نے بے اطمینانی اور مخاصمت کو ہوا دی۔ شق 187 کے معاملے میں، ری پبلکن کی کامیابی نے شدید ردِعمل ظاہر کیا، کیونکہ وہ انہیں مطلب پرست، تارکین وطن مخالف، اور اقلیت کش قرار دیتے تھے--- مؤخرالذکر کا ٹھپہ لگوانا کیلیفورنیا میں خطرناک ہے--- اور بڑھ کر باقی ملک میں بھی۔ شقوں کا اندازہ تحریر بھی غیر مناسب تھا اسلیے 187 کے بیشتر نکات عدالتوں نے ختم کر دیے ہیں۔ 209 کا کلیدی خالق، وارڈ کونرلی، یہ اعتراف کرتا ہے کہ ایجابی عمل (*affirmative action*) کے خاتمے کو باقاعدہ عمل سے گزارنا چاہیے تھا

کہ تا کہ نظام کو ہر ممکن حد تک کم دھچکا لگتا۔ چاہے کوئی دونوں شقوں کے حق میں ہی ہو لیکن انہیں جسطرح قانون بنایا گیا وہ عمل نامکمل اور برعکس نتائج کا پیدا کار تھا۔ قانون سازی کا صدیوں پرانا طریقہ بحث و مباحثہ، سوچ بچار، حزبِ اختلاف کو موقف سننے، سمجھوتہ کرنے اور اسطرح ایسے قوانین بنانے کا مطالبہ کرتا ہے جنہیں وہ لوگ بھی جائز کہیں جو اسکے مخالف ہیں۔ سیاست نے اس وقت اچھی کارکردگی نہیں دکھائی جب بادشاہ مطلق العنان تھے اور آج بھی نہیں دکھائے گی اگر عوام ایسا کریں گے۔

غالباً تحریک گزاری اور ریفرنڈم کا سب سے بڑا اندرونی تضاد اسکا پیسے اور سیاست سے براہِ راست تعلق رہا ہے۔ شروع میں یہ پبلک پالیسی کو بڑے کاروباری گروپوں کے نامناسب اثر سے بچانے کے لیے ایجاد کیا گیا، بلاواسطہ جمہوریت ایسا میدان بن گئی ہے جس میں دولتمند اور مفاداتی گروپ ہی مقابلہ کر سکتے ہیں۔ سیاستدانوں کی طرح رائے دہی کے کامیاب طریقے بھی انتخاب لڑتے ہیں۔ اولاً، انہیں مجموعہ کی صورت میں ہونا چاہیے، جسکے لئے عموماً سیاسی مشیروں، فوکس گروپوں اور وکلاء کی ایک ٹیم درکار ہوتی ہے۔ پھر انہیں بیلٹ پر جانا ہوتا ہے۔ یہ کرنے کیلئے انہیں بڑی تعداد میں دستخطوں کی ضرورت ہوتی ہے جو قدرے کم عرصے میں اکٹھے کئے جاتے ہیں، جسکے لئے تقریباً ہمیشہ ہی پیشہ ور دستخط اکٹھے کرنیوالی فرموں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگلے مرحلے میں انہیں لوگوں میں فروخت کرنا ہوتا ہے، اسکے لئے اشتہاری مہم پر بھی اچھا خاصا خرچ اٹھتا ہے۔ نتیجے میں، انتخابی طریقوں کے فروغ اور حملوں پر خرچ کی جانیوالی رقم مقننہ کے امیدواروں کی مزید بد عنوان مہموں کا مقابلہ کرتی ہے۔ اپنی کتاب *Democracy Derailed: Initiative Campaigns and the Power of Money* میں ڈیوڈ بروڈر نے بتایا کہ 98-1997ء میں قانونی سال میں، 257 ملین ڈالر کی رقم ملکی سطح پر تحریک گزاری پر خرچ کی گئی، جو اس 740 ملین ڈالر کا تیسرا حصہ ہے جو ایوان اور سینٹ کے تمام ارکان نے مل کر خرچ کی۔ کیلیفورنیا میں، صرف 1996ء کے دوران، تحریک گزاری پر 141 ملین ڈالر خرچ کیے گئے، جو ملک کے قانون ساز اداروں کے بدنام ترین امیدواروں سے بھی 33 فیصد زائد تھے۔

تحریک گزاری کے عمل میں بڑے پیمانے پر دولت کی مداخلت کا اثر پریشان کن حد تک اسی طرح ہے جو آج کل قانون سازی ہوتا ہے: منظّم اور دولت مند مفاداتی گروہ اپنے

دائرہ اختیار کے تحفظ کیلئے آسان ترین رسائی اختیار کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، جب کاروباری گروپوں نے ''پے چیک پروٹیکشن(Paycheck Protection)''کو منظوری کیلئے لایا تو کیلیفورنیئن یونینز نے اسے ناکام کر دیا۔اب تک، اساتذہ کی یونینز بھی سکول واؤچر(School Vouche) کیلئے تحریک گزاری کو ناکام کرنے میں کامیاب رہی ہیں،جن میں2000ء کی تین مہنگی ترین کوششیں بھی شامل ہیں۔میسوری اور اوریگن میں نقد رقم اور خود کو''سیاستدانوں کیلئے ٹیکس کا کوئی ڈالرنہیں''اور''سیاستدانوں کیلئے ٹیکس دینے والوں کا کوئی ہینڈ آؤٹ نہیں'' کہلانے والے کاروباری اتحاد انتخابی مہم کی فنانسنگ پر تحریک گزاری کو واضح فرق سے شکست دے چکے ہیں۔لیکن اس کہانی میں ایک سلوٹ ہے۔ اگرچہ یہ نظر آتا ہے کہ بلاواسطہ جمہوریت کے اس دور میں دولتمند مفاداتی گروہ غالب رہیں گے،تحریک گزاری کے عمل نے سیاسی منظر پر غیر متوقع عامل لا کھڑا کیا ہے:ارب پتی پالیسی ناظم۔فنانسر جارج سوس،ایم وے(Amway) کا شریک بانی رچرڈ ڈیوس،سرمایہ دار ٹیموتھی ڈریپر، مائیکروسافٹ(Microsoft) کا شریک بانی پال ایلن اور ان جیسی شخصیات ساری دنیا میں اپنے مفادات کیلئے تحریک گزاری کو استعمال کرتے ہیں۔ایک طرح سے انہیں بھی قصوروار ٹھہرانا بھی مشکل ہے: ہر انسان کیطرح انکے اپنے سیاسی نظریات ہیں اور یہ وہی کرتے ہیں جسے درست تصور کریں۔لیکن ایک صدی پیشتر جب ترقی پسند رہنما بدعنوان بلاواسطہ جمہوریت کو جاگیردار ڈاکوؤں سے حکومت چھیننے کے طریقے کے طور پر فروغ دے رہے تھے، کیا وہ ایسے نظام کے بارے میں سوچ سکتے تھے جس پر مفاداتی گروپ اور سیاسی ذہن رکھنے والے ارب پتی غالب ہوں؟

ریفرنڈم اور تحریک گزاری نے اختیارات سیاستدانوں سے لیکر عوام کے ہاتھوں میں تھمانے کا عمل تیز کیا ہے، لیکن ہمیشہ پیشہ ور مشیروں، ترغیب کاروں، انتخابی ماہرین اور کارکنوں کی بڑھتی تعداد کے ذریعے۔ جمہوریت کے نام پر ہم نے انتہائی بااختیار اعلیٰ طبقہ پیدا کر لیا ہے۔ کیونکہ حکومت مستقل عامل ہے اسلیے انکا کام کبھی نہیں رکتا۔اس انقلاب کی پیش قدمی سے جنہوں نے کھویا ہے وہ نمائندہ جمہوریت کے ادارے ہیں: کانگریس، سیاستدان، سیاسی جماعتیں، انتظامی ایجنسیاں اور بذات خود حکومت۔نئی اشرافیہ پر پیشتروں سے کم قدغنیں ہیں۔ماضی کی سیاسی جماعتوں کی ایک بنیاد تھی،فلسفیانہ روایت تھی،اور نظر آتی

تھیں اور جوابدہ تھیں ـــ یہ نیم عوامی ادارہ تھیں۔ اسکے ارکان عوامی شخصیات تھے جو سب کے سامنے کرتے اور اپنی عزت کیلئے فکرمند رہتے تھے۔ لیکن مشیروں، فنڈز حاصل کرنیوالوں، رائے شماری کرانے والوں اور ترغیب کاروں، جو امریکی سیاست چلا رہے ہیں، کی نگرانی کون کرتا ہے؟ اشرافیہ پر جنگ مسلط کر کے ہم نے چھپی اشرافیہ کی سیاست پیدا کی ہے، ناقابل احتساب، غیر اثر پذیر اور اکثر عوامی مفاد سے عاری۔ امریکہ کی روایتی اشرافیہ اور اداروں کا زوال --- صرف سیاسی نہیں بلکہ ثقافتی، معاشی اور مذہبی --- سماج کے زوال کی روح رواں ہے۔ یہی کہانی ہے جس کیطرف بڑھیں گے۔

....

چھٹا باب

مقتدر کی موت

2000ء کے موسمِ خزاں میں چیز مین ہیٹن بینک (Chase Manhattan Bank) جے پی مورگن (J. P. Morgan) میں ضم ہو گیا۔ جیسا کہ تمام انضماموں میں ہوتا ہے یہ بھی دراصل قبضہ تھا: چیز نے مورگن خرید لیا تھا۔ سرسری نظر میں یہ ایک اور کارپوریٹ ڈیل تھی ـــ اگرچہ بڑی۔۔۔ پسِ پردہ آنے والی ان آوازوں کا حصہ جو اس دور کا خاصہ تھیں۔ دراصل یہ امریکی سرمایہ داری میں ایک سنگ میل تھا، جو روایتی وال سٹریٹ کی موت اور نئے نظام کی فتح کا پتہ دیتا تھا۔

مورگن بینک، جیسا کہ اسکے کہا جاتا تھا، 20 ویں صدی کا بڑا امریکی بینک تھا۔ 19 ویں صدی کے آخر اور 20 صدی کے پہلے عشرے کے اقتصادی بحرانوں اور افراتفریوں میں یہ امریکی معیشت کیلئے آخری پناہ گاہ ثابت ہوا تھا، حتیٰ کہ 1913ء میں فیڈرل ریزرو سسٹم (Federal Reserve System) نے اسکی جگہ لے لی۔ مورگن بینک نے اپنے کاروبار کی بنیاد انتہائی چنیدہ طبیعت ہونے پر رکھی تھی جو وہ اپنے گاہکوں کے انتخاب میں استعمال کرتا تھا، خصوصاً حکومتوں، بڑی کثیر الملکی کارپوریشنز اور انتہائی امیروں سے لین دین کرتا تھا۔ ''مورگن کے پرائیویٹ اکاؤنٹ کسی دور میں امریکی اشرافیہ میں رکنیت کے برابر سمجھے جاتے تھے'' رون چرنو (Row Chernow) کا کہنا ہے جنہوں نے بینک کی تاریخ مرتب کی ۔ دراصل بینک ایک کلب کی طرح کام کرتا تھا۔ یہ بناوٹی نہیں تھا بلکہ معقول منافعوں کی کنجی تھی۔ مورگن کے بینکرز کے بڑی بڑی نیک نام فرموں اور خودمختار حکومتوں سے قریبی تعلقات تھے، ہر سطح پر مضبوط ذاتی تعلق رکھتے تھے۔ 1912ء میں کانگریسی کمیٹی

کے پوچھنے پر کہ اس کا طریقہ کاروبار کیا تھا، جے پیر پونٹ مورگن(*J. Pierpont Morgan*) نے بتایا کہ وہ سمجھتا ہے کہ ادھار کی بنیاد، ''کردار ہے--- پیسے، جائیداد یا کسی بھی دوسری چیز سے بڑھ کر---وہ شخص جس پر میں اعتماد نہیں کرتا دنیائے مسیحیت کے تمام معاہدوں پر بھی مجھ سے رقم نہیں لے سکتا(**1**)۔''

چیز مین ہیٹن، دوسری طرف، کارپوریٹ کلچر کا مالک تھا، نیویارک ٹائمز کے الفاظ میں، ''نیویارک کی گلیوں سے بنا تھا اس ارفع ماحول کے جس میں مورگن نے سانس لیا تھا۔'' اپنی محترم تاریخ کیساتھ جو اسکے پاس تھی، 1990ء تک یہ مشکلات میں گھرے بینکوں کا مجموعہ بن گیا تھا۔ چیز کی توجہ کا مرکز نچلی سطح کی مارکیٹ تھی: گھر گروی، کار کیلئے قرضہ، چھوٹے کھاتے۔ لیکن عام لوگوں کی بڑی تعداد سے معاملہ کرنا وہ جگہ تھی جہاں پیسہ تھا۔ 1980ء کی دہائی تک بڑے قرضوں کو چھوٹے قرضوں میں اوسط سرمایہ کار میں تقسیم کرنا دولت کا ذریعہ بن گیا تھا۔ اس نئے کھیل میں کلب جیسی سوچ زیادہ کامیاب نہ تھی۔ جے پی مورگن نے اس دنیا کے مطابق ڈھلنے کی کوشش کی جو آنے والی تھی، لیکن بالاخر ناکام رہا۔ ٹائمز کے الفاظ میں، یہ ''مالیت کی دنیا میں ایک خطائے زمانہ بن گیا، جس پر عوام غالب تھے نہ کہ کوئی طبقہ(2)۔'' امریکی مالیت میں انقلاب کے حجم کا اندازہ لگانے کیلئے اس پر غور کریں، 1990ء میں جے پی مورگن کو وال سٹریٹ میں سب سے زیادہ قدر حاصل تھی، سٹی بینک سے دس گنا زیادہ۔ صرف 10 برس بعد، مورگن کی مارکیٹ ویلیو سٹی کارپوریشن سے 10 گنا پیچھے چلا گیا۔ سٹی کارپویشن غالب آگئی تھی کیونکہ اسکے چیف ایگزیکٹیو افسر(CEO)، سین فوڈ ویل، نے کمیٹی کو سرمائے کے بہت بڑا پہاڑ میں تبدیل کر دیا تھا، جو بڑے فنانس کو ہی نہیں بلکہ عوامی فنانس کو بھی چلانے لگا تھی۔

یہ بتانے کیلئے کہ جمہوریانے نے امریکی معاشرہ کو کس طرح صرف سیاست کی حدوں سے کہیں آگے تک متاثر کیا ہے— جو اس باب کی بحث ہے--- میں مالیتی امور کی بحث اسکے لیے بہترین جگہ ہیں۔ یہ صنعت اسطرح تبدیل کی گئی ہے کہ اسکے اثرات نے بیشتر امریکیوں کو اپنی لپیٹ میں لیا ہے--- اور لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں امریکہ سے باہر بھی متاثر ہوئے ہیں۔ ہر پنشن یافتہ بخوبی جانتا ہے کہ مالیت کا سارا کاروبار اب اسے جیسے لوگوں کو مختلف چیزیں فروخت کرنے کے گرد گھومتا ہے۔ جو کوئی بھی سی این بی سی(*CNBC*) دیکھتا

ہے،کیبل نیٹ ورک جو فنانشنل خبروں کو تفریحی انداز میں پیش کرتا ہے، جانتا ہے کہ سٹاک مارکیٹ اب روزمرہ کے سرمایہ کار کے پیچھے پڑ گئی ہے۔آج سٹاک اور بانڈ کی دنیا میں سعودی شاہی خاندان اور سوئس بینکوں کی بجائے ٹی آئی اے اے سی آر ای ایف(*TIAA-CREF*)،کالجوں کے ریٹائر پروفیسروں اور غیر نفع بخش تنظیموں کے ملازمین کا سرمایہ چھایا ہوا ہے۔''ہر انسان بادشاہ ہے!'' جنوبی عوامیت پرست ہیوے لانگ نے اعلان کیا۔لیکن جو کچھ ہوا ہے وہ ایسا نہیں ہے، معاشیات کی دنیا میں ہر کوئی،شاہ اور گدا، سرمایہ دار بن گئے ہیں۔

جمہوریت کی لہر امریکی معاشرے میں بہت آگے جا چکی ہے— کاروبار،قانون، ادویات، کلچر سے ہوتے ہوئے جیسا کہ ہم دیکھیں گے، مذہب تک پہنچی ہے۔سیاست کی طرح، یہ معاملہ 60ء اور 70ء کی دہائیوں میں بہت تیز ہوا ،اور سیاست کی طرح یہ جاری انقلاب ابھی اپنے شیر خوارگی کی عمر میں ہے۔اس نے دو وسیع معاشرتی تبدیلیوں کو ہوا دی ہے۔ پہلا، صنعت اور روزگار کے معاملہ میں غیر امریکیوں کیلئے دروازے کھل گئے ہیں اور طاقت اور اختیار کے سابقہ ڈھانچے ٹوٹ گئے ہیں۔ دوسرا، پہلے سے جڑا ہے، شرفا کے مخصوص گروہ کا گہنا جانا ہے جو ان اداروں کو چلاتے ہیں۔اشرافیہ کے تصور میں بھی اس سے بھی زیادہ زوال آیا ہے—اگرچے حقیقت میں کچھ فرق نہیں پڑا۔یہ دو بڑی تبدیلیاں امریکی سماج میں عمومی انقلاب کا حصہ رہی ہیں جنہیں ہم اختیارات کا خاتمہ کہہ سکتے ہیں۔حقیقت میں یہ تبدیلی ایک قسم کا دھاوا ہے۔اگرچہ امریکہ میں اختیارات ہر دور مشکوک رہے ہیں،60 کے عشرے سے یہ مختلف انداز سے بائیں اور دائیں بازو کی طرف سے حملوں کی زد میں رہے ہیں۔

اس باب کا آغاز دولت سے کرنے کی ایک اور اہم وجہ کہ یہ جمہوری لہر کو سمجھنے کیلئے انتہائی اہم عامل پر روشنی ڈالتی ہے۔ بہت حوالوں سے جمہوریانہ خیر کیلئے غیر معمولی اور مضبوط قوت رہی ہے، مخصوص گروہی طاقت کا خاتمہ، کاروبار میں انقلابی تبدیلیاں، ذہانت و قابلیت کی قدر، نئے صنعتی اداروں کے قیام اور اہم ترین افراد کے ہاتھ مضبوط کر رہی ہے۔ ہم پرانے بند نظاموں کی طرف واپس نہیں جانا چاہتے۔ دیرینہ مسائل —رسائی اور اخراج— کا حل بتا کر جمہوریا نے نئے مسائل پیدا کئے ہیں۔ نئے کھلے نظام کی مسابقت،قوت، اور

حرکیت نے بہت سے راہنما اصول، رکاوٹیں اور اختیارات کے توازن ختم کر دئے ہیں۔ ستم ظریفی یہ کہ اسی افراتفری نے عام سرمایہ کار — عام شہری — کو متاثر کیا ہے جو پر آشوب حالات پر قابو پانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے ایک جمہوری سیاسی، اقتصادی اور سماجی نظام کا جواب بھی اپنے اندر روایتی اور غیر روایتی پابندیاں لگائے ہوئے ہے، چند اچھائیوں کے حق میں اپنی توانائی اور فعالیت قربان کرتے ہوئے، مثلاً شفافیت، ایمانداری، غیر جانبداری، اور استحکام۔ لیکن ایسا کرنے کیلئے ہمیں اداروں اور شرفا کو کسی نہ کسی صورت میں دوبارہ زندہ کرنا ہوگا جنہیں تین دہائیوں سے ختم کرتے آئے ہیں۔

مجھے سرمایہ دکھاؤ

''امریکہ وسط ستمبر 1958ء کو بدلنے لگا،'' جوزف نو کیرا اپنی دلآویز کتاب ''*A Piece of Action: How the Middle Class joined the Money Class*'' میں لکھتے ہیں۔ وہ اس دن کی طرف کر رہا ہے جس روز بینک آف امریکہ نے فرسینو، کیلیفورنیا میں 60 ہزار کریڈٹ کارڈ ''پھینکے''، پس کل المقصدی کریڈٹ کارڈ بنا دیا۔ یہ نیا خیال تھا، جو دراصل اسکے ہر طالب کو جو روایت کے مطابق قرض چاہتا تھا، پیشکش کرتا تھا، ضمانت کے بغیر۔ 1950ء کے عشرے میں امریکی اپنی روزمرہ ضروریات پوری کرنے کیلئے قرض لینے کے عادی ہو رہے تھے — کار، فریج، ٹی وی۔ لیکن قرض ابھی تک بدنام تھا۔ اگر آپ کوئی چیز خریدنے کی سکت نہیں رکھتے، آپ کو پیسے پس انداز کرنے ہوں گے حتیٰ کہ اسے خریدنے کے قابل ہو جائیں۔ ساتھ، قرضے کا حصول آسان نہ تھا۔ بیشتر بینک متوسط خاندان کو چھوٹے قرض دینے کو وقت اور محنت کا ضیاع سمجھتے تھے۔ بینک آف امریکہ کے علاوہ۔ اسکا بانی اے پی گینانی (*A. P. Giannini*) ایک تارک وطن کا بیٹا، پیسے کو ''اپنے لوگوں'' کی رسائی میں لانا چاہتا تھا۔ اسکا بینک، جسکی بنیاد 1904ء میں ڈالی گئی، پہلے اسکا نام بینک آف اٹلی اور 1928ء میں بینک آف امریکہ ہو گیا۔ جہاں بینک کمپنیوں کو سرمایہ دینے کیلئے صارف قرضے نظرانداز کرتے تھے، بینک آف امریکہ نے عام آدمی کو گلے لگانے کا کردار اپنایا۔ نتیجے میں 1970ء تک یہ امریکہ کا سب سے بڑا بینک بن گیا۔

کریڈٹ کارڈ کے اجراء نے عوام پر قرضہ کے دروازے کھول دیے، لوگوں کو اس قابل

بنایا کہ مستقبل کی آمدن پر پیشگی رقم لے سکیں، جیسا امراء ہمیشہ سے کرتے آئے تھے۔ آج کریڈٹ کارڈ کے بغیر زندگی کا تصور مشکل ہے۔ جبکہ چالیس سال پہلے انکی خبر تک نہ تھی۔ ان 40 سال میں کیا کچھ ہوا، خصوصاً بعد کے 25 سال، بہت سے پہلوؤں سے جدید مالیت کی تاریخ میں نسبتاً انقلابی ترین تھے۔

کریڈٹ کارڈ صرف شروعات تھے۔ 1970ء کے عشرہ میں معاشیات، ٹیکنالوجی اور اور سرکاری پالیسی کو ایک ہی سمت میں دھکیلا گیا— دی ریگیولیٹنگ ، دی سنٹرلائزنگ اور معیشت کو جمہوریانہ۔ 1970ء میں مالی منڈی کا جو فنڈ متعارف کرایا گیا، اس نے سٹاک کو عمومی ملکیت میں بدل دیا۔ 1951ء میں 9 فیصد امریکی تمسکات کے مالک تھے۔ سٹاک مارکیٹ صرف امراء کے لئے تھی۔ زیادہ تر امریکی اپنا پیسہ بچت اکاؤنٹ میں رکھتے تھے، جس میں شرح منافع قانون میں طے تھی۔ 1929ء میں سٹاک مارکیٹ بحران کی یاداشتوں کا اس سے کافی لینا دینا تھا، اسکے ساتھ یہ پختہ یقین کہ وال سٹریٹ — بروکرز اور بینکوں کا پورا نظام — غریب آدمی کی پروا نہیں کرتا (جو بنیادی طور پر درست تھا)۔ لیکن غالباً کسی بھی چیز سے بڑھ کر، عام آدمی کو امید نہیں تھی کہ اسکی بچتیں اس قدر منافع دیں گی۔ اسکا مقصد اپنی رقوم محفوظ کرنا تھا نہ کہ اسے بڑھانا۔ لیکن جیسے ہی 1970ء میں افراط زر بڑھی، متوسط طبقہ کو اندازہ ہوا کہ بنک کی اسکی بچتیں— مقررہ منافع کیساتھ — دراصل اپنی قدر کھو رہی ہیں۔ لوگوں سے زیادہ منافع کے ذرائع تلاش کرنے شروع کر دیے۔ انہیں یہ چیز منی مارکیٹ فنڈ کی صورت میں مل گئی ، نئی تخلیق کردہ شے ، جو وفاقی قانون میں موجود اسقام استعمال کرتے ہوئے ، لوگوں کو میوچل فنڈز خریدنے کا موقع دیتا تھا۔ فنڈوں نے سب سے پہلے حکومتی محاصلات کے بل خریدے ، جن میں شرح منافع بچت اکاؤنٹ سے زیادہ تھی۔ پھر *Fidelity* نے سٹاک پورٹ فولیو کیساتھ فنڈز متعارف کرا دیئے۔ انہوں نے لوگوں کو اپنے معمول کے بنک کھاتے ، چیک لکھنے اور جمع کرانے کا موقعہ بھی دیا۔ یک دم ہی لوہے کی مل میں کام کرنے والا ایک مزدور جس کے پاس ساری زندگی کی جمع پونجی ایک بچت کا کھاتہ ہو، جنرل الیکٹرک ، فورڈ اور آئی بی ایم جیسی بلیو چپ کمپنیوں کے حصص خرید سکتا تھا۔

اس طوفان میں مزید اضافہ، کانگریس نے دو قوانین کا اجراء کیا؛ ریٹائرمنٹ اکاؤنٹ (*IRA*) اور 401(*k*) پلان۔ دونوں نے لوگوں کو موقعہ دیا کہ وہ ٹیکس سے پہلے کی اپنی آمدنی

بچت میں ڈال دیں۔اس لوگوں کوترغیب دی کہ وہ اپنی بچتوں کو مالی آلے کے طور پراستعامل کریں جو وسیع منافع دے سکتے ہیں۔اگر آپ ایک ہزار ڈالراضافی کمائیں، آپ کواس پر ٹیکس دینا ہوگا۔اگر آپ کا آئی آر اے پورٹ فولیو ماہانہ 1000 ڈالر کے حساب سے بڑھتا ہے تواس پر کوئی ٹیکس نہ ہوگا (رقم نکلوانے تک)۔یہ معمولی ساحساب تھا۔۔ماقبل ٹیکس جمع تفریق۔۔ لیکن اس نے لاکھوں بچت کرنیوالوں کوسرمایہ دار بنادیا۔25 سال پہلے جاری ہونیوالے آئی آر اے اور 401(k) منصوبہ آج وہ طریقہ ہیں جن کی ذریعہ امریکی سٹاک اور بانڈز مارکیٹ میں حصہ دار ہیں۔

پھر ڈسکاؤنٹ کی دلالی کا دور آیا۔1975ء میں حکومت نے نیویارک سٹاک ایکسچینج جو مجبور کیا کہ وہ سٹاک خریدنے اور بیچنے پر کمشن کا فیصلہ آزاد منڈی کو کرنے کا موقعہ دیا،اس سے 1831ء سالہ پرانا نظام ختم کر دیا۔جلد ہی ہر ایک لئے تھوڑی مقدار میں سٹاک کی خرید و فروخت ممکن ہوگئی۔1975ء ایک سٹاک پر کمیشن ، اوسطاً،500 ڈالر تھا (موجودہ ڈالر کے مطابق)۔آج ڈسکاؤنٹ دلالی میں یہ 20 ڈالر یہ کم ہوتا۔آن لائن اس پر 4 ڈالر خرچ اٹھتا ہے۔ان سب تبدیلیوں کے باعث 2000ء تک نصف سے زائد امریکیوں کے تمسکات تھے۔ساتھ ہی ساتھ سٹاک مارکیٹ اشرافیہ سے نکل کر وسیع البنیاد کاروباری ماحول میں بدل گئی۔اگر پرانے نظام کا نمائندہ وال سٹریٹ کلب تھا، جہاں مٹھی بھر بروکروں نے آغاز لیا تھا، نئے کی نشانی سی این بی سی (*CNBC*) ہے، جہاں چیف ایگزیکٹو عام ناظرین سے مخاطب ہونے کیلئے وقت کے حصول پر مقابلہ بازی کرتے نظر آتے ہیں (3)۔

جمہوریانے کے اس عمل کا ایک غیر متوقع عنصر مائیکل ملکن (*Micheal Milken*) تھا، 1980ء کا تاریخ سازسرمایہ کار بنکر جو بالاخر فراڈ کے مقدمہ میں جیل چلا گیا۔اس نے ''جنک (*Junk*)'' بانڈ جاری ایجاد کیا اور ایسا کرنے سے ان کمپنیوں پر سرمایہ کے دروازے کھول دیئے جن کو اس تک رسائی نہ تھی۔نئی کمپنیوں اور دوسری چھوٹی فرموں کیلئے کاروبار پھیلانا ہمیشہ مشکل تھا کیونکہ انکے سرمایہ کم تھا اور ادھار کا ماضی بھی نہیں تھا جو انہیں معقول شرح پر قرض دلا سکے۔انہیں کیچ 22 کا سامنا تھا: آپ کوئی بانڈ نہیں لے سکتے تاوقتیکہ پہلے ایسا نہ کیا ہو۔ملکن نے کمپنیوں کے لیے وہی کیا جو گیانی نی (*Giannini*) نے عوام کیلئے کیا: ملکن کے خیال میں بہت سے اسی قدر قرض کے قابل ہوں گے جسقدر بڑے ہیں۔(دراصل ملکن

نے کچھ تحقیق کی تھی جس سے اس نے یہ مفروضہ قائم کیا۔) دونوں نے جان لیا تھا کہ ان افراد اور کمپنیوں کی مدد کر کے جن کا قرض کے لین دین میں ماضی نہیں ہے، اور جو سیدھے قرض کی مارکیٹ میں جاتے ہیں — یقیناً قدرے زیادہ شرح پر — آپ اچھی خاصی رقم بنا سکتے ہیں۔ نئی کمپنیوں کے لیے ملکن کے جنک بانڈ خدا کی نعمت تھے۔ وہ سرمایہ فراہم کر رہے تھے جو ان میں سے بہترین کو آگے بڑھنے سے روکتا ہے۔ بانڈ نے کاروبار کے میدان کو بھی نشیب و فراز سے ہموار کیا، بڑی بڑی کمپنیوں کو مسابقت میں سب سے بری رکاوٹ سے آزاد کر کے — سرمائے تک رسائی۔ 1980ء کے عشرے نے درجنوں کمپنیاں مثلاً ایم سی آئی (MCI) اور سی این این (CNN) کا جنم دیکھا جو جنک بانڈ کے ایندھن سے عالمی دیو بن گئیں۔ ملکن کی دریافت مالیت کے کم و بیش ہر کونے، حتیٰ کہ بیرونی قرض تک، پھیل گئی۔ کیونکہ تمام بڑے بڑے اقتصادی منصوبے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹے جا رہے تھے، تا کہ ہر کوئی انہیں خرید سکے — میوچل یا پنشن فنڈ سے — اسکا نتیجہ طاقت کے مرکز کی تبدیلی میں بڑے پیمانے پر تبدیلی تھا۔ صرف بڑی کمپنیوں کو ہی مقروض طبقے کا سامنا نہیں تھا؛ ہر اس کا جسے پیسے کی ضرورت تھی، ملکوں سمیت۔ پرانے طریقہ کار کی مثال برطانوی وزیرِ اعظم بینجمن ڈسریلی کے لارڈ رتھچائلڈ کے پاس ملاقات کیلئے جانے کا واقعہ ہے تا کہ ایک قرض کو یقینی بنایا جائے جس سے برطانیہ کو نہر سویز خریدنا تھی۔ نئی صورتحال وزرا خزانہ کی ان لاتعداد داستانوں میں نظر آتی ہے کہ وہ میوچل فنڈ کے درجنوں مینجروں کو ٹیلی فون کرتے تھے کہ اپنے ملکوں کی قسمت چمکا سکیں۔ نیو یارک ٹائمز (*New York Times*) کے تھامس فرائیڈ مین بتاتا ہے کہ 1990ء تک جب کوئی ملک قرض لیتا، "بجائے اسکے کہ وہ صرف بیس بڑے بنکوں کے ساتھ معاملات طے کرے ۔۔۔ اچانک اس نے خود کو ہزاروں انفرادی سرمایہ کاروں اور میوچل فنڈز میں گھرے ہوئے پایا۔" یہ کچھ وہ نہیں تھا جو 1960ء کی دہائی میں احتجاج کرنے والے طلبہ چاہتے تھے، لیکن اختیارات لوگوں کے پاس چلے گئے تھے۔

سرمایہ سے بھی زیادہ

آپ نے ایک مرتبہ اس منشور سے دیکھنا شروع کر دیا تو امریکی معاشرے کا ہر پہلو جمہوریت کی لہر سے متاثر نظر آئیگا، اس چیز کو لیجئے جسے پیسے اور سیاست سے ہر ممکن حد تک

دور رکھا جاسکتا ہے —مذہب۔ پچھلے 30 برس میں امریکی مذہب میں جو سب سے بڑی تبدیلی آئی ہے ، طاقت کا بڑے دھارے کے چرچوں - - - اسقفیت پسند(*Episcoplians*)، میتھوڈسٹ(*Methodist*)، پریسبٹیرین(*Presbyterians*) کے ہاتھ سے نکل کر زیادہ وسیع انجیلی گروہوں کے پاس چلے جانا ہے۔زیادہ اہم اورنظرانداز کی گئی یہ حقیقت تھی کہ جیسے جیسے یہ گروہ تعداد میں بڑھتے گئے انہوں نے خودکو اپنے وسیع پیروکاروں کے مطابق ڈھالا اور بدلا۔دوسرے لفظوں میں ، انہوں نے امریکی پروٹسٹنٹ ازم کو جمہوریادیا۔

اعلیٰ چرچ—اسقفیت پسند،اور پریسبٹرین وغیرہ— جوعوامیت کے اس دور میں ڈھل نہیں سکے معتبر پس پردگی میں چلے گئے ہیں۔ پادری حضرات پرانے دور میں اپنا مقام کھو چکے ہیں اور نئے میں بھی انکے لئے جگہ نہیں ۔اسقفیت پسند بشپ ، مثال کے طور پر، معاشرے میں وہ مقام رکھتے جسے آج بیان کرنا مشکل ہے۔ ریورنڈ اینڈی کورٹ،گروٹن سکول(*Groton School*) کا بانی ، قومی سطح کا لیڈر مانا جاتا ہے اور صدر کا ہم پلہ تھا۔خدمت گاروں کیلئے یہ اعلیٰ مقام کچھ عرصہ پہلے تک موجود تھا۔ مثال کے طور پر ییل یونیورسٹی(*Yale University*) کے بورڈ آف ٹرسٹیز کی صدارت 1970ء اور 1980ء کی دہائیوں تک ایک اسقفی بشپ کے ہاتھ میں تھی۔آج یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ ایسا اہم عہدہ ایک بشپ کوسونپا جاسکتا ہے۔جمہوری جواز اوردولت (سرمایہ داری کا جواز) کے فقدان کے باعث بیشتر امریکی روایتی خدام دین کومتروک خیال کرتے ہیں ،جنکی خدمات کا اعتراف تو کیا جاتا ہے لیکن قد کاٹھ اور طاقت سے محروم ہیں۔جن کے پاس طاقت ہے —اورصدر، گورنر اور ٹی وی ٹاک شوز کے میزبان جنکی تعریف کرتے ہیں— بلی گراہم جیسے عوامیت پرست پادری ہیں، جو مذہب کے لئے کم اورلوگوں کے حق میں زیادہ بولنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔لوگوں کی آواز خدا کی آواز ہے۔

کچھ کے لئے یہ نئی تبدیلی نہیں بھی ہوسکتی۔امریکہ میں مذہب ہمیشہ سے آمریت مخالف رہا ہے۔ بہت سے یورپی تارکین وطن امریکہ میں مذہبی حاکمیت کو جھٹلا کر مخالفِ دین کی حیثیت سے آئے ۔ اہم تر یہ کہ،دوسری عظیم بیداری ، 1780ء سے 1830ء، امریکی انقلاب میں کارفرما مساوات کی روح مذہب میں لے آئی۔اسقف پسندوں کی نئی نسل پیدا

غلبہ پا لیا، جو جیفر یسونیئن طرز پر عام انسانوں میں ظاہر تھا۔مساوات پسند فرقے جیسے کہ بپتسمائی اور متیھوڈسٹ چرچ ایک دھماکے کی طرح حجم میں بڑھ گئے جبکہ پرانے ،جنکی بنیاد مراتبی نظام پر تھی ، جیسے کہ کانگریگیشنل پسند منتشر ہونے لگے تھے۔1775ء میں ملک میں کانگریگیشنل پرستوں کی تعداد باقی فرقوں کی نسبت دوگنا تھی ۔1845ء تک ان کی تعداد میتھوڈسٹ کے مقابلہ میں دسویں حصہ سے بھی کم ہوگئی۔آج امریکی مسیحیوں کی بیشتر تعداد بپتسمائی اور میتھوڈسٹ پر مشتمل ہے۔اور آج بپتسمہ ماننے والے اور کیتھوڈسٹ خیالات کے حامل چرچوں کی بہتات ہے۔1820ء کے آخر اور 1830ء کے آغاز میں امریکہ کی سیاحت کے دوران ایلکس ڈی ٹیوک ویل نے اس مظہر کی نشاندہی کی ،جو مسیحیت اس نے دیکھی اسے ’’جمہوری اور عوامی مذہب‘‘ کہا۔

مگر ٹیوکویل کا مشاہدہ مذہب کی سیاسی تنظیمی کے حوالے سے تھا۔ بہت سے موقعوں پر خدام دین کا انتخاب قصبے کے لوگ کرتے تھے اور اپنے کاموں کیلئے انہی کو جوابدہ تھے۔ چرچ کا ڈھانچہ عمومی طور پر مساوات پر مبنی تھا،جس میں بیوروکریسی اور اتھارٹی کے سلسلے نہیں تھے۔لیکن نظریاتی حوالے سے بیشتر امریکی فرقے انتہائی آمریت پسند تھے۔مذہبی کتب کی تشریح میں اکثر لغوی طریقہ استعمال کرتے ،اور مخالف فرقوں اور اختلافی حلقوں کے بارے میں بہت عدم رواداری تھے۔* بیشتر چرچ جانیوالوں کیلئے آزادخیالی کی قیمت بھاری تھی— عموماً جلاوطنی ،قید یا موت ہوتی تھی۔ این ہچنسن ،ایک کٹر انگریز خاتون جو1634ء میں بوسٹن منتقل ہوگئیں، کے مشہور واقعہ میں، جو باتیں کرنے لگی اور خدا تک پہنچنے کیلئے فرد کے کردار پر زور دیتی تھی۔اسے گورنر جان ون تھروپ کی جانب سے میساچیوسٹس سے نکال دیا گیا۔

تھروپ کے بعد کی تین صدیوں میں امریکی عیسائیت بہت بدل چکی ہے۔لیکن انداز فکر کے حوالے سے یہ آج بھی طلب گار ہے۔ 20 ویں صدی کے شروع میں پروٹسٹنٹ کی کتاب *Fundamentals*--- جس سے ’’بنیاد پرستی‘‘ کی اصطلاح بنی— کتبِ مقدس کو ان لوگوں کی ملاوٹ سے پاک رکھنا تھا جو لوگوں کو اس بات کی گنجائش دیتے تھے کہ وہ مذہبی متون کی زیادہ آزادخیالی سے تشریح کریں۔چند عشروں بعد 1925ء کا سکوپ ٹرائل (*Scopes Trail*)— جس کا مرکز ایسا گروہ تھا جس نے کمرہ جماعتوں میں نظریہ ارتقاء کی تعلیم پر

پابندی لگا دی تھی — نے بتا دیا کہ بیشتر بنیاد پرست مسیحی عقائد کی حاکمیت قبول کرنے پر تیار تھے چاہے وہ قومی دھارے کے امریکہ سے مطابقت نہ بھی رکھے۔ان کے نزدیک عیسائیت بارے تشریح ہر کسی کا کام نہیں۔

آج بھی ہم کبھی کبھار نظریہ ارتقا پر شاذ و نازر جنگیں دیکھتے ہیں لیکن یہ ایک بدلے ہوئے مذہب کی حقیقت کی آئینہ دار ہیں۔گذشتہ 30 سالوں نے امریکی مذہب میں 17ویں صدی میں اپنے آغاز کے وقت سے لیکر اب تک سب زیادہ اہم تبدیلیاں دیکھی ہیں۔موجودہ دہائیاں امریکہ میں مذہبی عروج کے دور سے منسوب کی جاتی ہیں، جو شاید صحیح ہو کیونکہ کچھ قدامت پرست چرچوں میں رکنیت بڑھی ہے۔* لیکن جو بات سب سے زیادہ کھٹکتی ہے کہ اس دور میں امریکی مسیحیت — خصوصاً پروٹسٹنٹ ازم — نظریاتی حوالے سے کثرت پسند اور اپنے لوگوں کے نظریات، خواہشات اور آرزوؤں کے معاملے میں حساس ہو گیا ہے ۔بنیاد پرستی، مذہب میں اپنی بنیادیں کھونے پر، کافی حد تک سیاسی ہتھکنڈہ بن گئی ہے۔ عام پیروکار مختارِ کل اور مذہب کی تنظیم، نظریات اور عقائد کا تعین کرنے لگا ہے۔ستم ظریفی یہ کہ یہ جمہوری تبدیلیاں اس فرقے میں نمایاں ہیں جو سب سے زیادہ رجعت پسند سمجھا جاتا ہے: انگکیکن تحریک۔انگلیکن مسیحیت نے خود کو عوامیت پسند اور جمہوری بنالیا ہے ، جو اسکے بنیادی نظریات سے واضح انحراف ہے، کیونکہ باقی کلیسیاؤں جیسے انجام سے بچنے کا یہی راستہ تھا۔اسکی تبدیلی کا جائزہ ملک میں مذہبی مقتدر کے زوال پر زیادہ روشنی ڈالے گا۔

میرا کلیسیا ہی تمہارا کلیسیا ہے

1976ء میں گیلپ نے اس انکشاف سے قوم — یا، بلکہ، اسکی ساحلی اشرافیہ کو — کو حیران کر دیا کہ 31 فیصد امریکی خود کو دوسرا جنم لیا ہوا یا انگلیکن خیال کرتے ہیں۔اسی

* دراصل گیلپ سروے، جنکی بنیاد پر ایسے دعوٰی کئے جاتے ہیں، بتاتے ہیں کہ چرچ جانے والے امریکیوں کی تعداد عمومی طور پر مستقل رہی ہے ---چالیس کے نچلی طرف — سوائے 50ء کی دہائی کے، جب یہ 49 فیصد ہوئی۔تمام معیارات کے مطابق، ان سوالوں سمیت جو گیلپ عشروں سے کرتی آئی ہے، مذہب امریکیوں کی زندگی میں قدرے چھوٹا کردار ہی ادا کر رہا ہے۔

برس جمی کارٹر نے اپنی صدارتی مہم میں جنوب کے انگلیکن بپتسمائی عقیدہ پر کھل کی بحث کی۔2000ءتک امریکہ میں نیا جنم لینے والوں، یاانگلیکن کی تعداد46 فیصد تک پہنچ گئی، جن میں دونوں صدارتی امیدوار بھی تھے(دونوں جنوب کے بپتسمائی تھے)۔ایک خاص طور پر، جارج ڈبلیوبش، انکی شمولیت امریکی مسیحیت میں گزشتہ چندعشروں سے جاری تبدیلی کی مظہر ہے۔بش ایک نومذہب ہیں۔انکے والد، جارج ایچ ڈبلیوبش — اپنے آباؤ اجداد کی طرح — نجیب الطرفین اسقفی تھے۔لیکن جیسا بش خاندان نے کیا، سارے ملک نے تقلید کی۔مذہبی مقتدر کے پرانے نظام نے نئے کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔

انگلیکن مسیحیت کے عروج میں پریشان کن پہلو یہ ہے کہ فرد پرستی اور رواداری کے اس دور میں کٹر اور روایتی مذہب کیونکہ پھیلنے لگا۔بیشتر حلقوں، جن میں چرچ کے اپنے بھی کچھ لوگ شامل ہیں، کی جانب دیا جانے والا جواب یہی ہے کہ اسکی سختی اور انتہا پسندی ہی انگلیکن مسیحیت کے پھیلاؤ کا سبب ہے کیونکہ یہ جدید کلچر کا کلی متبادل پیش کرتی ہے۔ یقیناً آج کی اس پرشور دنیا میں اخلاقی معیارات اور کٹرپن ایک نفسیاتی راستہ ہے۔لیکن یہ دلیل تسلیم کرنا اس ہمہ پہلو انداز کو نظرانداز کر دینا ہے جس سے پروٹسٹنٹ ازم نے خود کو بدلا ہے۔

اس تبدیلی کا بانی بلی گراہم تھا۔گراہم نے کیریئر کا آغاز1940ء کے عشرے میں بنیاد پرست بوب جانز یونیورسٹی (Bob Jones University) کے فارغ التحصیل کی حیثیت سے کیا، عموماً گناہ اور سزا کے متعلق تعلیم دیتا۔اولین بنیاد پرستوں میں سے ایک، بوب جانز سینئر(1883ء1968ء) کو اعتقاد تھا کہ صرف قدامت پرست پروٹسٹنٹ ہی بخشش پا سکیں گے۔جبکہ باقی — یہودی، کیتھولک اور مورمنز — ملعون ہوں گے۔بوب جانز یونیورسٹی 2000ء، جب سینٹر جان میککین نے جنوبی کیلیفورنیا کی پرائمریز میں اسے منظر پر لایا، تک علی الاعلان اس تصور پر کاربند تھی کہ کیتھولک، بالخصوص، شیطان کی جماعت ہے اور اس کا رہنما، پوپ، لغوی معنوں میں دجال ہے۔جانز کا خیال تھا کہ امریکہ کا عوامی کلچر سراسر ابلیس اور دھتکارا ہوا ہے اور ان پر عذاب نازل ہوگا— یہ 1920ء کی بات ہے۔اس نے ''سچے'' مسیحیوں کو جدید امریکہ کی جہنم سے محفوظ کرنے کے لیے 1927ء میں اپنی یونیورسٹی کی بنیاد رکھی۔وہ نہ تو ملک کو تبدیل کرنے کی کوششوں میں تھا اور نہ اپنے پیغام پیروکار حاصل کرنے

کیلئے جاری کرتا تھا،اس پر پختہ یقین رکھتا تھا جسے وہ''

بلی گراہم نے اسی انداز میں ، پرجوش تقاریروں میں جدید زندگی کو گناہ کا نام دیتے ہوئے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ لیکن جیسے جیسے اسکے سامعین بڑھنے لگے اور یہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے گھروں میں پہنچا، اسکی ترشی کم ہوتی چلی گئی ،اس نے خود کو نجات کے شعلہ بیاں مقرر سے امریکیوں کا شفیق باپ بنالیا،ایسا تاثر جسے رچرڈ نکسن کے بعد آنے والے ہر امریکی صدر کے ساتھ دوسی ،مشاورتی تعلقات نے تقویت بخشی ۔یہاں قابل ذکر ہے کہ گراہم کس قدر بخشندہ ہوگیا: اس نے نہ تو واٹر گیٹ کے بعد نکسن کو لتاڑا اور نہ ہی مونیکا کے بعد کلنٹن کو۔ ماہر الٰہیات رچرڈ نیوہاس(Richard Neuhaus) نے 1999ء میں نشاندہی کی کہ ''جب اس نے 40 کے عشرے میں آغاز کیا، بلی گراہم نے ان کیلئے نہ جہنم کی آگ کی تبلیغ کی اور نہ ہی دوزخ کی وعید سنائی جو مسیح کے انکاری تھے۔ وہ اس حکمت عملی پر زیادہ عرصہ کاربند نہیں رہا۔ اس پہلو پر نرم روی سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ گراہم جانتا تھا کہ کیا بکتا اور کیا نہیں۔''

گراہم کی شہرت مذہبی پیغام وسیع پیمانے پر پھیلانے کیلئے ٹیکنالوجی کے استعمال کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے مقامی مذہبی گروہوں میں ہونیوالے ذاتی رابطے کی جگہ لے لی — اسے جگہ سے ہٹا دیا۔ میڈیا میں آنیوالے خدمتگار، جنہوں نے گراہم کے بعد رواج پایا، کے ذریعے مذہب کی ساری خدمت کا خمیازہ مقامی کلیساؤں کو بھگتنا پڑا، جو اپنے اجتماعات میں کہیں زیادہ محتاط اور کہیں زیادہ طالب تھے۔ یہ مذہب، روایتی اسقفیت سے جدید انگلیکن انداز کی طرف نمایاں تبدیلی تھی، جسمیں مقامی پادری ،نئے ،اسقفی نظام میں اخلاق کا رہنما ہے، جس میں اخلاقیات کی تعلیم ٹی وی شو کے ذریعے دی جاتی ہے۔ اس صورت میں اخلاقی ضابطوں کا مذاق نہیں اڑا سکتے جب آپ ایک کلیسیا کے باقاعدہ رکن ہیں، یا دوستوں اور محفلوں میں ایسا نہیں کر سکتے۔ اگر ایک مبلغ کو محض ٹی وی پر ہی دیکھنا ہے تو آپ کو کوئی دیکھنے والا نہیں۔

اگر گراہم بانی تھا تو جیری فیل ویل(*Jerry Falwell*) انگلیکن روایت کو جمہوریانے کا اہم عنصر تھا۔ یہ دعویٰ غیر موزوں لگ سکتا ہے، لیکن اسکی رجعت پسند ہونے کی شہرت گزشتہ 20 برسوں میں قدامت پرست سیاسی جماعت مورل میجورٹی (Moral

Majority) کا بانی ہونے کے ناطے سیاسی حمایت کی مرہون منت ہے۔ اسکے کیریئر کا جائزہ اسے ایک موقع پرست رہنما ثابت کرتا ہے جسکا اولین مقصد کلیسیا کو عوام کیلئے قابلِ قبول بنانا تھا۔ ایک کاروباری، جو مذہبی مقتدر کی کم ہی پروا کرتا تھا، ہونے کے باعث اس نے بپتسمائی رہنمائی ترک کر کے 1956ء میں 35 لوگوں کیساتھ سینٹ تھامس روڈ بپتسمائی چرچ کی بنیاد رکھنے کی کوششیں شروع کیں۔ وہ تاجروں کا معترف تھا— اسکا باپ بھی تاجر تھا— اور 1971ء میں اس نے وضاحت کی کہ ''کلیسیا کو پرحکمت سمجھا جائے گا اگر وہ کاروبار کو مستقبل کی پیشن گوئی کرنے کی حیثیت سے دیکھے۔'' اس نے بطور خاص اسکا ذکر کیا خیال تھا کہ خریداری کے بڑے بڑے مراکز گزشتہ بیس برس کی سب سے بڑی پیش قدمی ہے اور ان کی کامیابی کا راز دو بڑے اداروں کا چھوٹے چھوٹے اداروں کی معاونت سے مختلف خدمات مہیا کرنا ہے۔ سینٹ تھامس روڈ چرچ کا یقین ہے کہ مختلف اداروں میں ایک چرچ کے پرچم تلے جمع ہو جانا عوام کو انجیل کے پیغام کی طرف لا سکتا ہے۔ فیل ویل کی یہ حکمت عملی کام کر گئی اور نتیجتاً عظیم کلیسیا وجود میں آ گیا۔ اپنے ایک حالیہ خطبہ میں اس نے 1400 ایکڑ پر محیط'' جیری فیل ویل منسٹریز (JFM) ورلڈ ہیڈکوارٹر'' قائم کرنیکا اعلان کیا۔ دوسری سہولیات کیساتھ ساتھ اس میں یونیورسٹی، چھوٹے ادارے، 12 ہزار افراد کی گنجائش والا ہال، 24 گھنٹے جاری رہنے والا دعائیہ گھر، بچوں کا عظیم الشان مرکز ایتھلیٹکس کی ان اور آؤٹ ڈور سہولیات، جدید آلات سے آراستہ ٹی وی پروڈکشن سنٹر، تفریحی پارک — جس میں گھومنے کے لیے گاڑیاں ہوں گی — اور مستقبل کے حوالے سے تحقیق کرنے والا یوتھ کیمپ بھی ہوگا (5)۔''

منصوبے کو وسیع کرتے ہوئے فیلو ویل اور ہم خیالوں پر یہ راز کھلا کہ بڑی تعداد میں لوگوں کو متوجہ کرنے کیلئے انہیں عوام میں مروجہ ثقافت واقدار کی بات ہی کرنا ہوگی، انہیں وہی کچھ دیں جو وہ چاہتے ہیں، جو مذہبی لحاظ سے کم طلبگار اور زیادہ پرخلوص اور خدمت مرکزی مسیحیت ہے۔ یقیناً یہ باب جونز سینئر اور اورل رابرٹسن جیسے بنیاد پرستوں کے عقائد کا کھلم کھلا انکار تھا۔ اب انگلیکن کلیسیا اس طرز پر بنتے ہیں کہ جدید صارف پرست امریکہ کے ماحول میں مل جائیں۔ ''کرسچین راک'' پر غور کریں، موسیقی عموماً مذہب کے عروج کے ساتھ محمول کی جاتی ہے لیکن دراصل یہ اس عروج کے کھوکھلے پن کی علامت ہے۔ موسیقی کے مسیحی

ادارے پاپ ہرقسم ــ راک، ہیوی میٹل، جیز، ایزی لِسنگ، گرنج، فنک اور ہپ ہاپ، موجودہ مشہور ترین --- کے گیت بناتے ہیں۔ صحافی نکولوس ڈایڈوف (*Nicholos Dawidoff*) کہتے ہیں کہ ''ہر پہلو سے مسیحی آواز اپنے سیکولر ہم منصب سے مشابہت رکھتی ہے، اور اسی طرح کے بہت سے سامان، مسیحی موش پٹس سے لیکر ذی (Z) میوزک، 24 گھنٹے کیبل پر چلنے والا چینل جو صرف مسیحی میوزک ویڈیو چلاتا ہے، تک (6)۔'' یا آرکو کنزوریٹیو (*archoconservative*) انگلیکن پیٹ رابرٹسن (*Pat Robertson*) پر غور کریں، جس کا ٹی وی شو، دی 700 کلب، اور اسکا 24 گھنٹے کے ''نیشنل کونسلنگ سنٹر (national counseling center)'' نے انسانی مسائل کی طرف امریکہ میں پایا جانے والا عمومی معالجی رویہ اپنایا ہے۔ لوگوں کی تعریف کی جاتی ہے، حوصلہ اور تسلی دی جاتی ہے لیکن کبھی مذمت نہیں کی گئی۔ آپ رابرٹسن کے منہ سے کسی کو گناہگار ٹھہراتے ہوئے اتنا ہی شاذ و نادر ہی سنیں گے جس قدر اوپرا ونفرے (*Oprah Winfrey*) کی زبان سے۔ اسی لئے، رابرٹسن کا پروگرام فیملی چینل (*Family Channel*) پر بچوں کے شو اور مزاحیہ پروگراموں میں سینڈوچ بن کر نشر کیا جاتا ہے۔

اگر ایمان بحیثیت علاج رابرٹسن کا نصب العین ہے تو ایمان بحیثیت لذت پرستی خمیسی انگلیکنوں جم (Jim) اور ٹیمی فے بیکر (Tammy Faye Bakker) کا مرکز نگاہ تھا۔ ''مسیحیت ایک تفریح ہونی چاہیے، اسے لطف انگیز ہونا چاہیے۔ ۔ ۔ یہ انسان کو رکاوٹ محسوس نہ ہو جس سے بچ نکلنا چاہے!'' بیکر نے اک مرتبہ کہا تھا۔ اپنی تبلیغ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بیکر نے 23 ہزار ایکڑ پر محیط ایک غنائی پارک، ہیریٹیج یو ایس اے (Heritahge USA) ــ جسے فخر سے ''کرسچین ڈزنی لینڈ'' کہا جاتا ــ جس میں 504 کمروں کا ہوٹل، ایک آبی پارک، شاپنگ مال، مشاورت کا ادارہ، ''ہیریٹیج کے جدید ترین بیضوی تھیٹر میں اذیتِ مسیح کے ڈرامے'' اور بلی گراہم کے لڑکپن کے گھر* کا ماڈل رکھا گیا۔ 1986ء میں 60 لاکھ افراد نے ہیریٹیج یو ایس اے کی سیر کی اور اس طرح وہ ڈزنی لینڈ کے بعد امریکہ کا تیسرا بڑا غنائی پارک بنا دیا۔ ''لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں ایک مسیحی عمارت آبی پارک کی کیا ضرورت

* گراہم خود خمیسی نہیں تھا مگر اسے بہت سے انگلیکی اس تحریک کا بانی سمجھتے ہیں۔

ہے،'' بیکر نے نیویارک ٹائمز کو اپنے 8 ملین کے بیمہ کا بتاتے ہوئے کہا۔ ''اچھا، اگر بائبل کہتی ہے کہ ہمیں انسانوں کو مچھیرا بننا ہے تو یہ آبی پارک محض ایک چارہ ہے۔۔۔۔ اور میں چند خوبصورت طعمہ استعمال کرنے میں کوئی قباحت نہیں دیکھتا(7)۔''

ورجینیا یونیورسٹی کے ماہر سماجیات جیمز ڈیوی سن ہنٹر، جس نے اس تحریک باریک بینی سے مطالعہ کیا، اپنی کتاب امریکن انگلیکنیت (*American Evangelicalism*) میں کہتے ہیں کہ انگلیکنوں نے جانا کہ عوام کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ''نہ صرف دوسروں کی رائے، عقائد اور طرز زندگی کو برداشت کرنا ہے بلکہ دوسروں کیلئے خود کو قابل برداشت بنانا اہم تر ہے۔ بنیادی عقیدہ کی مخالفت نہ کریں۔۔۔۔ اس سے انگلیکن کے بعض جارحانہ پہلوؤں پر نرم رویہ ثابت ہوتا ہے مثلاً کفر کا الزام لگانا، گناہ، حیات بعد الموت، جاہلیت اور روزِ قیامت، خدا کا غضب، ملعونیت اور جہنم۔ ہر وہ چیز جو مذہبی یا اخلاقی مقتدر اعلیٰ بننے کی کوشش کرے اور عدم رواداری کی طرف اشارہ کرے اسے پس پشت ڈالا جائے گا۔'' امریکی مسیحیت کی ایک اور دانشور، کیلیفورنیا یونیورسٹی کی سوزن فرینڈ ہارڈنگ (*Susan Friend Harding*) ہیرٹیج یو ایس اے کے متعلق لکھتی ہیں ـــ ان لفظوں میں جو بیشتر انگلیکن کلیساؤں پر صادق آتی ہے ـــ کہ یہ ''بنیاد پرستوں پر اعمال پر قدغن، قربانی کے فلسفے، مقتدر ہستی کا جنون، درجہ واریت کے حوالے سے بلا تعطل تنقید تھی۔۔۔۔ بیکرز نے اپنے ساتھیوں کو مادی فراوانی اور فلاح کی تو ضمانت دی لیکن وہ توبہ کے لامحدود امکان کے پیغام کی نوعیت بدل رہے تھے، ایسی الٰہیات جو خدا سے پیشگی توبہ کر کے گناہ در گناہ کی اجازت دیتی نظر آتی تھی(8)۔'' اختیار کا روایتی انداز میں استعمال ممکن نہ تھا، اپنا وجود اور شناخت قائم رکھنے کا واحد طریقہ مطابقت پذیری تھا۔

بنیاد پرستوں کی سیاست میں شمولیت کو مذہبی مقتدر کے کمزور ہو جانے کے ردِعمل کی صورت میں دیکھتے ہوئے بہترین انداز سے سمجھا جا سکتا ہے۔ فیل ویل جو اس شعبہ کا بانی تھا، 50ء، 60ء اور 70ء کے عشروں میں غیر سیاسی رہا۔ 1965ء میں اس نے ایک خطبہ شائع کیا جس کا موضوع خاص طور یہ تھا: ''جہاں تک کلیسیا کی دنیا سے نسبت کا تعلق ہے اسے ان لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے جو پولوس نے اپنے ساتھی تیموتاؤس کو دیے ـــ ''کلام کی تبلیغ کرو'' ـــ ہمیں کہیں بھی دنیا کو تبدیل کرنے کا اختیار نہیں۔ ہمیں چوروں، شراب خانوں،

جواریوں، قاتلوں، فاحشاؤں، متعصبوں اور اداروں یا برائی کی کسی بھی شکل کے خلاف اعلان جنگ کی تعلیم نہیں دی گئی۔'' اس نے باقاعدگی سے پادریوں کی سیاسی جھگڑوں میں شمولیت کو تنقید کا نشانہ بنایا **(9)**۔

1950ء اور 60ء میں سیاسی فعالیت کا مطلب تھا انسانی اور شہری حقوق کی طرف سے تحریک چلانا تھا، جسمیں نہ تو فیل ویل کو خاص دلچسپی تھی اور اسکے حواریوں کو۔ درحقیقت، انسانی حقوق کی جدوجہد میں پروٹسٹنٹ کلیساؤں کا کردار روایتی مذہبی مقتدر کی نمائندہ مثال ہے جو عوام کو تعلیم دینے کیلئے استعمال کرتا ہے۔ اور فیل ویل کو یہ انداز پسند نہ تھا۔ لیکن 70ء کے عشرے تک فیل ویل کے پیروکار۔۔ خصوصاً جنوب سے — سیاست زدہ ہوکر بعض سماجی معاملات پر دائیں بازو میں چلے گئے۔ انہوں نے رچرڈ نکسن کے حق میں ووٹ دیے، ڈیموکریٹک پارٹی سے روایتی تعلق توڑلیا۔ پھر بھی 1978ء میں، *Row v. Wade* میں سپریم کورٹ کے فیصلے جسمیں اسقاط حمل کو آئینی تحفظ دیا گیا کے بعد، فیل ویل نے اپنی سیاسی جماعت اور لابنگ گروپ، مورل میجورٹی (*Moral Majority*)، کی بنیاد رکھی۔ اس میں بھی وہ سخت گیر بنیاد پرستوں کی تنقید سے نہ بچ سکا۔ مورل میجورٹی نے کیتھولک، یہودیوں، مورمنز — غرضیکہ ہر اس شخص سے حمایت تلاش کی جو اسکے ایجنڈے سے متفق تھا۔ اس گناہ کی پاداش میں، بوب جانز جونیئر (بوب جانز سینئر کا بیٹا اور اسکا جانشین)، نے فیل ویل کو ''امریکہ میں خطرناک ترین شخص'' قرار دیا۔ کہا جاسکتا ہے کہ فیل ویل فعال سیاسی قدامت پرستی کی طرف رجوع چلا گیا کہ مذہبی قدامت پرستی — جس میں عقائد کی پاکیزگی، دوسرے فرقوں سے دشمنی، زنا جیسے گناہوں کی مذمت اور مادی دنیا کی زاہدانہ نفی درکار تھی — غیرمعروف ہو چکے تھے۔ پرانے پروٹسٹنٹ بنیاد پرستوں میں باقی صرف سیاست بچی تھی: اسقاط حمل، ہم جنس پرستی اور ارتقا۔ یہی مسائل تھے جنہوں نے عوام کی بڑی تعداد کو باندھ رکھا تھا۔ لیکن یہاں بھی حالات معلق تھے کیونکہ امریکی ان جیسے سماجی بندھنوں کی طرف بہت روادار ہو گئے تھے۔ آج بنیاد پرست بیشتر کلیسیا ہم جنس پرستی جیسے معاملات پر برائے نام سخت مؤقف اپناتے ہیں، عام مسیحی کی حمایت کھو دینے کے خوف سے، جسے ایک دانشور ''غیر کلیسیائی ہیری'' کہتا ہے۔ آج کے بنیاد پرست کی یہی خصوصیات ہیں ٹی وی شو دیکھیں، غنائی پارک میں جائیں، مسیحی راک خریدیں اور ری پبلکن کو ووٹ دیں۔ ماہر سماجیات مارک

شبلے (*Mark Shibley*) اسے ''قدامت پرست پروٹسٹنٹ چرچ کا کیلفورنیانا'' کہتا ہے۔ دشمن اور وہ نصب العین گنوا دینے کے بعد جنکے خلاف وہ اپنے ماننے والوں کو متحرک کرتے، بنیاد پرست — 11 ستمبر کے تناظر میں —ایک نئے دشمن کا تجربہ کر رہے ہیں، اسلام۔فیل ویل، رابرٹسن اور فرینکلن گراہم (بلی کا بیٹا) اسلام کے خلاف زہریلی اور تزہیک آمیز زبان استعمال کرتے ہوئے اسے ''شر'' اور اسکے بانی محمدؐ کو ''دہشتگرد'' کہنے لگے ہیں۔ وہی انداز تکلم جو کبھی اسقاط حمل کے حمایتیوں، ہم جنس پرستوں اے سی ایل یو کیلئے استعمال ہوتا تھا آج مسلمانوں کی طرف منتقل ہوگیا ہے۔اب دیکھنا یہی ہے کہ آیا نفرت انگیزی کی یہ کوشش ماضی کے برعکس کامیاب ہوگی یا نہیں۔

امریکی میسحیت میں مقتدر ہستی کا زوال اسوقت مزید واضح ہوجاتا ہے جب حالات کو انگلیکن فرقوں سے آگے بڑھ کر دیکھا جائے۔ ماہر سماجیات ایلن وولف (*Alan Wolfe*) بتاتے ہیں کہ امریکہ میں جن کلیساؤں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے وہ خودکو ایک آزاد اکائی خیال کرتے ہیں اور اپنے فرقے کیلئے کسی مرکز کا انکار کرتے ہیں۔ یہ تحریکیں سراسر غیر مرکزی اور جمہوری ہیں۔ وولف ایک پروفیسر کا حوالہ دیتے ہیں جو لکھتے ہیں کہ ''مسیح اور انکے شاگرد ایک طرز کے ''دھرے اور ارائے'' کے آپریشنز جیسے تھے جیسا آجکل ایئر لائن کمپنیز کرتی ہیں، کیونکہ انہوں نے مابعد جدیدیت کے ڈی ریگولیشن اور شدید مسابقت کے حالات کا جواب دیا ہے۔'' ''روحانیت کے متلاشی'' مذہب کے اس نئے روپ کا ایک پہلو ہیں۔ متلاشیوں کا خیال ہے کہ مذہب سراسر ذاتی معاملہ ہے، کسی قسم کے دینی احکام درکار نہیں ہوتے، اور یہ کہ ہر فرد اپنا عقیدہ خود ہی تشکیل دیتا ہے۔ ہر شخص ایک پادری ہے، جیسا کہ ہوئی لانگ (*Huey Long*) نے کہا۔متلاشیوں کے بیشتر کلیسا وین نویز، کیلیفورنیا، میں ریورنڈ جیس موڈی کے زیر سرپرستی چلائے جانے والے چرچ کی طرز پر ہیں، جس نے اپنے خطبے کے انداز کی ''آرائش کی، اپنی تبلیغ سے جہنم کی آگ اور خدا کے عذاب کے تمام حوالے ختم کر دیئے۔'' مسیحی الہیات کی بعض معیاری اصطلاحات بھی غائب ہیں۔ ''اگر ہم نجات یا تبدیلی مذہب کے الفاظ استعمال کرتے ہیں تو وہ سوچتے ہیں کہ ہم پابندیوں کی بات کر رہے ہیں،'' موڈی کہتا ہے**(10)**۔

جدید سماج روحانیات اور شناخت کی تلاش سے پر ہے کیونکہ یہ تحفظ اور تیقن حاصل

کرنے کی صدیوں پرانی خواہش کے حصول کا جدید طریقہ ہے۔لیکن عصر حاضر کے تمام مسیحی فرقوں کی ایک کلیدی صفت انفرادی پسند اور جمہوری ڈھانچہ ہے۔ اگرچہ تمام مذہبی حلقوں میں اس نئے رجحان کے خلاف ردعمل موجود ہے لیکن یہ نئے قدامت پرست گروہ 5 فیصد امریکیوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جمہوریانہ حیران کن ترین رجحان ہے اور نتیجے میں اس کا نقصان ہوا ہے جسے ہنٹر ''متحدر کھنے والی'' کہتا ہے — کلام مقدس، مقتدر ہستی اور روایت کی طاقت۔گزشتہ چار عشروں میں امریکہ کی قدامت پرست ترین سماجی تحریک، انگلیکن مسیحیت، جدید جمہوریت کیخلاف اٹھ کھڑی ہوئی ہے اور خودکو بدلا ہوا پایا ہے۔انگلیکن مسیحیت کی داستان امریکی زندگی میں تمام مذہبی مقتدروں کے وسیع زوال کی کہانی ہے۔اس اچھا یا برا ہوسکتا ہے، آپ کی ذاتی رائے ہے، لیکن اسمیں شک کی گنجائش بہت کم ہے کہ ایسا ہو چکا ہے۔

بہترین راستہ جواب تک معلوم ہوا اور سوچا گیا

ہیری شرمین(*Harry Scherman*) برا ڈرامہ نویس تھا لیکن اعلیٰ درجے کا کاروباری ثابت ہوا۔ برسوں تک مسودوں سے ہاتھا پائی کرنے کے بعد، ہیری نے 1926ء میں وہ شروع کیا جسے اس نے بک آف دی منتھ کلب (*Book-of-the-Month Club*) کہا۔بنیادی خیال سادہ تھا: نئے فارغ التحصیل متوسط امریکیوں کو عظیم ادب کے پر لطف احساس سے روشناس کرنا۔کلب کی تاریخ بیان کرتے ہوئے جینس ریڈ وے(*Janice Radway*) بتاتے ہیں اسکا ایک اور مقصد ''اپنے قارئین کیلئے کتابوں کے اُمڈتے طوفان کو قابو میں کرنا تھا۔۔۔انہیں یقین دلایا جا سکے کہ وہ شاہکار کتابوں کی قربانی دیئے بغیر جدید ثقافتی پیداواری رفتار کا ساتھ دے سکتے ہیں(11)۔'' کتب پانچ رکنی ادارتی بورڈ منتخب کرتا تھا جسے ''منصفین'' کہتے تھے۔تمام افرد خود معزز مصنفین تھے؛ پہلا بورڈ یال(Yale) سے ایک انگریز پروفیسر، ایک کامیاب ناول نگار، مڈویسٹرن(*Midwestern*) اخبار کا ایڈیٹر اور دو ممتاز کالم نگاروں پر مشتمل تھا۔ بورڈ نے کتب کا انتخاب اپنے کاروباری مفادات سے بے نیاز کیا۔30ء اور 40ء کے عشروں میں اس نے جارج اورول(George Orwell)، آرتھر ملر(Arthur Miller)، ٹرومین کیٹ(Truman Capote)، ارنسٹ

ہمینگوے (Earnest Hemingway) اور دیگر مصنفین کا انتخاب کیا۔ اسکے باوجود نیویارک ٹائمنر نے بی اوایم سی (BOMC) کو حقارت کی نظر سے دیکھا۔ 1960ء میں اپنے مشہور مضمون ''میس کلٹ مڈ کلٹ (Masscult and Midcult)'' میں تنقید نگار ڈوئٹ میکڈونلڈ (Dwight McDonald) نے ان الفاظ میں اسکی ہنسی اڑائی ''1926ء سے یہ اپنے اراکین کو پڑھنے کیلیئے وہ مواد مہیا کررہا ہے جس کے بارے میں بہترین یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ بدترین ہوسکتا ہے۔'' دراصل یہ اس سے کہیں زیادہ ابتر ہوسکتا تھا۔ اگرچہ یہ کبھی بوجھل حد تک سنجیدہ یا علمی نہیں ہوا تھا، بی اوایم سی اعلیٰ معیار کا ادب منتخب کرتا تھا جو عوام کی بڑی تعداد کو پسند آسکے۔ یہ کلچر کو جمہوریانے پر یقین رکھتا تھا— بلکہ یہ اسکی رہنمائی کررہا تھا— لیکن اس نے ایسا لوگوں کا ذوق بلند کرکے کیا نہ کہ معیار کو نیچے لاکر۔

پھر 60ء کا عشرہ آپہنچا۔ مقتدر پر حملے جو سماج کے ہر حصے میں جاری تھے چھوٹے مگر کتابوں کے کاروبار کی موبثر دنیا میں سرایت کرگئے تھے۔ ''یہ خیال کہ بک آف دی منتھ کلب کے منصفین قوم کے ادبی ذوق کی رہنمائی کرے ۔۔۔ بیکار ہو چکا ہے، ''نیویارک ٹائمنر (*Newyork Times*) نے لکھا تھا۔ کلب کا مستقبل خطرے میں پڑ گیا اور 1977ء میں اسے میڈیا گروپ ٹائم ان کارپوریشن (Time Inc.) نے خرید لیا۔ جلد ہی ججوں کی خود مختاری مکمل ختم ہوگئی اور کلب کا انتخاب— جو ٹائم میگزین کے مارکیٹ ڈیپارٹمنٹ کے شدید دباؤ میں ہوتا تھا— وہ کتب بن گئیں جنکی مارکیٹ میں کامیابی کا امکان تھا۔ سٹیفن کنگ (Stephen King)، ٹام کلینسی (Tom Clancy)، مائیکل کرچن (Crichton) اور ٹیری میکملن (Terry McMillan) فہرست کے جانے پہچانے نام بن گئے۔ کتابوں کی تعداد بھی بہت زیادہ بڑھ، 1980ء اور 98ء کے درمیان تین گنا اضافہ ہوا۔ ہر چیز جو قاری خرید سکتا تھا — کھانا پکانے کی کتاب، شادی کیلیئے رہنما کتابچہ، رومانوی ناول— فہرستوں میں رکھ دی گئیں۔ یہ اصل روح کے بالکل برعکس تھا۔ لوگوں کا معیار بہتر کرنے کی بجائے کلب اس کی عکاسی کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ *

* یہ حکمتِ عملی ناکام ہوئی اور بی اوایم سی دوبارہ اپنی اصل کی طرف لوٹنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسنے منصفین کا نیا بورڈ مقرر کیا ہے، جسمیں اینا کوئنلن (Anna Quindlen) جیسے نام شامل ہیں۔ یہ تبدیلی بتاتی ہے کہ لوگ ثقافت میں، بہرحال رہنمائی چاہتے ہیں۔

بک آف دی منتھ کلب کی کہانی امریکی ثقافت کی داستان ہے۔کسی دور میں دی نیویارکر(*The Newyorker*) کیلئے لکھنے والے ،جان سیبروک(John Seabrook)،اس تبدیلی کو''حویلی سے کوٹھی'' میں منتقلی کہتا ہے۔حویلی،جو چند عشرے قبل امریکی کلچر پر غالب تھا،کا استعارہ جان نے ان اشرافیہ کے متعین کردہ ثقافتی اصولوں کے لیے استعمال کیا ہے معیار جنکا رہنما اصول ہے۔آج کے کلچرل میگا سٹور میں ذوق،معیار اور درجہ بندی جیسے تصورات بے ہودہ ہیں۔ہرشے چلی جاتی ہے اور واحد اہم چیز مقبولیت ہے۔جہاں حویلیاں وہ لوگ چلاتے تھے مذہبی تربیت یافتہ تھے،کوٹھیاں انکے قابو میں ہیں جو اسکا سوچتے ہیں جو مستقبل میں مقبول ہوگا --- جو ''سنسنی'' پیدا کرتا ہے۔ اگر نیویارکر(*Newyorker*) کا عظیم ایڈیٹر ہیرالڈر(Harlod Ross) پرانے نظام کی علامت ہے تو پاپ موسیقی کا پروموٹر ڈیوڈ گیفن(David Geffen) نئے کا نشان ہے۔راس،جو بمشکل ہی مصدقہ دانشور تھا،کے دل میں مندرجات کی قدر تھی؛گیفن کو عوامی مقبولیت اپنی طرف کھینچتی ہے ۔ جیسا کہ سیبروک کہتا ہے ''پہلے کلچرل منصف،جنکا کام ''اچھے'' کا تعین ''قیمتی'' ہونے کے حوالے سے تعین کرنا تھا،کی جگہ نئے قسم کے منصفوں نے لے لی ہے جنکی مہارت ''اچھے'' کو''مقبول'' ہونے کے حوالے سے متعین کرنا ہے۔''ہماری تہذیب میں یہ وسیع تبدیلی کم وبیش ہر عجائب گھر،لائبریری، یونیورسٹی، پبلشنگ ادارے، رسالے، اخبار اور ٹی وی میں اپنے ہونے کا احساس دلا رہی ہے(12)۔''

چند برس قبل دی نیویارک ٹائمز(*The NewYork Times*) نے امریکہ دو بڑے عجائب گھروں کے سربراہان سے ان اشیا کی فہرست طلب کی جو اکیسویں صدی کے بہترین میوزیم کا حصہ ہونی چاہئیں۔فلپ ڈی مونٹ بیلو(Philipe de Monebello)، نیویارک سٹی کے میٹرو پولیٹن میوزیم آف آرٹ کے عظیم سربراہ، نے فنی شاہپارے، ذہین اور دل لبھا لینے والی پیشکشیں،عوام کی خدمت کرنے والی انتظامیہ، اس قدر فنڈز کہ کاروباری دباؤ کے تحت فیصلے کرنے پر مجبور نہ ہو، با اعتماد سرپرست،سٹاف ممبر جو فن کو پیش کرتے ہوئے اتھارٹی اور امتیاز کو نظر میں رکھے اور آخر میں ''یہ پختہ یقین کہ میوزیم فن کو اپنے اندر اتار لینے کا مقام نہ کہ محض ایک ویران جگہ'' تجویز کئے۔نیویارک کے گگن ہیم میوزیم(Guggenheim) کے سربراہ تھامس کرین(Thomas Krens) کے پاس

مختلف فہرست تھی۔ انہوں نے آغاز یقیناً فن پاروں کے ''عظیم مجموعے'' سے کیا لیکن اس کے بعد ''شاندار فن تعمیر، شاندار نمائش، دوسری شاندار نمائش، کھانے سے لطف اندوز ہونے کیلئے دو مواقع، انٹرنیٹ کے ذریعے تعارفی ویب سائٹ'' تک جاری رکھتے ہیں۔ یہ قدیم اور جدید نظام میں فرق واضح کی تصویر ہے۔

کرین میوزیم سربراہان کی نئی نسل کے نمائندے ہیں جو بس دکھانا چاہتے — کچھ بھی— ہر وہ چیز جو مشہور ہو اور ہجوم کو اپنی طرف کھینچے۔ انہوں نے حال ہی میں لاس ویگاس کے علاقے میں وینٹین ہوٹل(Venetian Hotel) اور کسینو (Casino) میں گگن ہیم میوزیم کا آغاز کیا۔ یہ گمک بھڑکیلے ہیں اور اکثر بذاتِ خود فن کو ہی نظروں سے اجھل کر دیتے ہیں۔ یہاں بھی لوگوں کو فن دکھانا نہیں؛ انہیں میوزیم تک لانا ہے۔ وہاں پہنچ جائیں، پھر ''خریداری'' کے ایک یا دو مواقع ان کو دستیاب ہوں گے۔ جیسا کہ نیوری پبلک (New Republic) میں فن کے ناقد جیڈ پیرل(Jed Perl) کرین کے مشہور ترین پراجیکٹ، سپین میں فرینک گیہری(Frank Gehry) کا ڈیزائن کردہ شاندار میوزیم کی تعمیر، کے بارے میں لکھا، ''گگن ہیم بل باؤ(Guggenheim Bilbao) میں کوئی بھی فن پارے دیکھنے نہیں جاتا۔ فن دیکھنا ایسا عمل ہے جو آپ وہاں ہوتے کرتے ہیں، جیسا کہ باتھ روم کی طرف جاتے یا کھاتے ہوئے۔'' ایسے عجائب گھروں میں نمائش کے لیے رکھے گئے فن پارے بھی مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ کرین نے ''موٹر سائیکل پر فن'' اور جارجیو ارمانی (Giorgio Armani) کے ملبوسات کی نمائش کا آغاز کیا ہے۔ جدید آرٹ کی کیٹیگری میں کمرشل فن پاروں کو بھی رکھا جا سکتا—یا چاہیے — ہے۔ لیکن، جیسا کہ پیرل نے وضاحت کی، یہ عجائب گھر کسی مخصوص اندازِ فکر یا عہد کے نمائندے نہیں، یہ ان ہی کی نمائش کرتے ہیں جو عوام میں پہلے ہی مقبول ہو چکی ہیں: ''یہ ذوق نہیں بڑھا رہے، یہ ذوق کو جائز قرار دے رہے ہیں جس کا رواج ہے۔ یہ وہ تخیلات نہیں دکھا رہے جو ایک گرافک ڈیزائنر، ایم ٹی وی(MTV) کے پرڈیوسر بعد میں عوام کے سامنے پیش کر سکتے ہیں (اور وہ معروف یا غیر معروف قرار پا سکتے ہیں)؛ وہ اسکی عکاسی کرتے ہیں جو کلچر میں پہلے معروف ہے، اور لوگوں کو مبارکباد دے رہے ہیں کہ وہ انہیں جانتے ہیں(13)۔'' مختصراً، وہ رہنمائی نہیں تقلید کر رہے ہیں۔

ایک اور بات۔ موٹر سائیکل کی نمائش کیلئے رقم بی ایم ڈبلیو کی طرف سے فراہم کی گئی

تھی، جو تیار موٹر سائیکلوں کی سب سے زیادہ تعداد رکھتی ہے۔ ارمانی نمائش صرف آٹھ ماہ بعد لگی جب ارجیو ارمانی نے بذاتِ خود گگن ہیم کے لیے 15 ملین ڈالر کا اعلان کیا۔ فن اور کاروبار ہمیشہ سے جڑے رہے ہیں، لیکن فن کی معاصر کمرشل لائزیشن مختلف ہے کیونکہ یہ عوامی اور صارف پسند ہے۔ صدیوں سے فن کے دلداہ اپنی پسند، یا وہ اکٹھے کرتے رہے ہیں جوانہوں نے ماہرین سے پسند کرنا سیکھا۔ انہوں نے شاید ہی کبھی سوچا کہ یہ عوام کی نظروں میں مقبول ہوں گی یا نہیں۔ یہ ذوق امارت کا ایک حصہ تھا۔ لیکن آج کے کارپوریٹ سپانسر بہت مختلف ہیں۔ یہ فن کو کاروباری حکمت عمل کے انداز میں ترویج دیتے ہیں۔ جیمز ٹوئیچل (James Twitchell) ، ماہر سماجیات اور امریکی منڈی کا ایجاد پسند دانشور، نشاندہی کرتا ہے کہ، نتیجہ میں، یہ عموماً ''غیر جمالیاتی معیار استعمال کرتے ہیں، جنکی نمائش سے وہ کوئی نہ کوئی سیاسی فائدہ حاصل کریں کم از کم کوئی نیا جھگڑا نہ کھڑا کر دیں۔'' ٹوئیچل کہتے ہیں کہ ان دنوں جو کچھ نمائش کے لیے رکھا جاتا ہے کا اس سے گہرا تعلق ہے کہ وہ کیا کاروباری فائدہ دے سکتی ہے۔ گگن ہیم کو ''پکا سوا اور فولاد کا عہد'' پروگرام اس وجہ سے ترک کرنا پڑا کہ کوئی شخص لوہے جیسے قدیم شے سے رشتہ رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ بی ایم ڈبلیو کو ''میونخ کے شاہکاروں'' پر پروگرام ترک کرنا پڑا کیونکہ ''میونخ اس قدر سیکسی نہیں ہے۔'' 17 ویں کے انقلابی کلاسیکل مصور گڈ ریونیو (Guido Renio) کی نمائش اس لیے ملتوی کرنا پڑی کیونکہ کسی کو اس سے کمرشل فائدہ کی امید نہ تھی۔ اگر فن کے گزشتہ سرپرست بھی یہ رویہ اپنا لیتے تو ممکن ہے آرٹ کی تاریخ بہت مختلف ہوتی۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ''سیکسی ہونا'' یا ''سنسنی'' کی اپنی خوبیاں ہیں، مثلاً جدت اور بیساختگی، لیکن دراصل یہ شہرت حاصل کرنے کے طریقے ہیں، جو بعد میں منافع میں بدلتے ہیں۔ ثقافت کا یہ جھکاؤ کسی اہم چیز سے پردہ اٹھاتا ہے: جمہوریانے اور مارکیٹائزیشن میں باہمی تعلق۔ کیونکہ آج انسان صارف کی حیثیت سے دیکھے جاتے ہیں اور اپنی قوت کا اظہار اسی نئی شناخت کے ذریعے کرتے ہیں، مارکیٹائزیشن جمہوریانے کا لازم وملزوم حصہ بن گئی ہے۔ یہی جڑواں طاقتیں جمہوریت کی لہر کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ جمہوریانے کی یہی دوہری فطرت — شہریوں اور صارفین کے ہاتھ مضبوط کرنا — وضاحت کرتی ہے کہ کیوں بہ تکم لوگ معاشرے کی اس تبدیلی پر انگلی اٹھانے کی جرأت کرتے ہیں۔ بائیں بازو کیلئے، ''ہر

انسان کا کلچر'' کی مذمت کرنا مشکل ہے۔ بائیں کیلئے یہ اعتراف ناممکن ہے کہ سرمایہ داری— ثقافت کے دائرے میں ہی سہی— منفی نتائج رکھتی ہے۔ دونوں یہ تسلیم کرنے پر رضامند نہیں کہ رہنمائی اور مقتدر کے حوالے کے بغیر، لوگ غلط انتخاب کر سکتے ہیں۔ یقیناً، رہنمائی لینے کا مطلب نہیں کہ لوگ پیچھے چلنے پر رضامند ہوں بلکہ کوئی رضا کارانہ طور پر راہ دکھانے کی ہمت کرے۔

امریکی اشرافیہ

1967ء میں سی بی ایس نیوز (CBS News) کے صدر، بل لیونارڈ (Bill Leonard) نے ایک نوجوان پروڈیوسر ڈان ہیوٹ (Don Hewitt) کو بتایا کہ وہ خبروں کا ایک پروگرام 60 منٹ (*60 Minutes*) کے نام سے کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ہیوٹ نے کچھ چاہی کہ چینل اس شو سے کیا چاہتا ہے۔ لیونارڈ کے مطالبے سادہ سے تھے: ''ہم اس پر فخر کریں۔'' اس گفتگو کو یاد کرتے ہوئے ہیوٹ — جو آج بھی اس عظیم پروگرام کا پروڈیوسر ہے— کہتا ہے کہ وہ آخری موقعہ تھا ''جب کسی ٹی وی میں کسی نے ٹی وی ہی کے دوسرے شخص سے کہا ہو'ہم اپنے پروگرام پر فخر کریں'۔''

اس جیسی درجنوں کہانیاں ہیں درجنوں پیشوں کی — صحافت، پبلشنگ، قانون، اکاؤنٹس، طب اور بہت سے۔ یہ صرف پرانے وقتوں کی یادگار کہانیاں ہی نہیں امریکی سماج میں امراء کے کردار میں اہم تبدیلی کی مظہر بھی ہیں۔ 30 برس پہلے جو لوگ کتابیں چھاپتے، ٹی وی پر خبریں پروڈیوسر کرتے، لاء فرمیں چلاتے، اور ہسپتالوں کے سربراہ خود کو جزواً منافع اور جزواً عوامی خدمت سے جڑا سمجھتے تھے۔ ٹی وی ایگزیکٹیو، مثال کے طور پر، بخوبی جانتے تھے کہ فضائی لہریں استعمال کرنے کے بدلے ان پر عوام کو معیاری پروگرام پیش کرنے کی ذمہ داری ہے۔ یہ لوگ خود کو کاروباری کم اور پیشہ ور زیادہ سمجھتے تھے— ''لوگوں کا ایک گروہ'' انگریز دانشور آر ایچ ٹانی (R. H. Tawney) کے الفاظ میں، ''جو ان قواعد وضوابط اور معیارات کے تحت اپنے فرائض انجام دیتے تھے جو اس گروہ کے ارکان کی حفاظت اور بہتر انداز میں عوام کی خدمت کیلئے نافذ کیے گئے تھے(14)۔'' 20 ویں صدی کے بیشتر وقت میں پیشہ وروں نے ایک قسم کی جدید اشرافیہ کی بنیاد ڈالی، جو اپنا مقام قائم رکھتے ہوئے ملک

کی فلاح اور مفاد کے لیے کام کرتی تھی۔ وہ اور سرکردہ شہری عوامی مفاد کے تحت اپنے اوپر چند فرائض لئے ہوئے تھے۔ امریکہ کے شہروں اور قصبوں میں عظیم عجائب گھر، اوپیرا کمپنیاں، عوامی سیرگاہیں اور کتب خانے ریاست کی طرف سے نہیں بلدیاتی شعور والے ایسے افراد نے ہی تعمیر کرائے۔ دولت وعزت محفوظ ہونے کے باعث انہوں نے میں اپنے قصبے، شہر یا ملک میں صحت کی سہولتوں میں طویل المدت — اگر کاروباری بھی تھا— دلچسپی لینے کی طرف مائل تھے۔ تمام اشرافیت اور مراعات، جو ایسی دنیا کا حصہ ہوتی ہیں، کے باعث عوامی خدمت کے جذبے سے سرشار اشرافیہ نے امریکی جمہوریت کی خوب خدمت کی۔

اینگلو امریکی معاشرے کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک یہ رہی ہے کہ شرفا وامراء اور اداروں نے ہمیشہ عوامی کام کیے ہیں۔ یہ غیر روایتی ہے؛ بیشتر ممالک فرانسیسی ماڈل کی نقل کرتی ہیں، جسمیں اقتصادی اور سماجی پہلوؤں پر نظر رکھنے کیلئے حکومتی کارندے اور ادارے مقرر کئے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان مختلف طریقوں پر غور کریں جنکے ذریعے امریکہ فنانشل مارکیٹ چلائی جاتی ہیں— نیویارک سٹاک ایکسچینج سے لیکر فیڈرل ریزرو بینک کے ذیلی دفاتر تک — آپ کو نظر آئے گا کہ ان میں سے بہت سے ادارے، اپنے آغاز میں، غیر سرکاری مگر عوامی کردار لئے ہوئے تھے۔ چھوٹے پیمانے پر دیکھیں، مین ہیٹن دو عظیم سیرگاہیں، سنٹرل پارک اور ریور سائڈ پارک، وہ لوگ چلاتے ہیں جو جزواً سرکاری ہیں اور جزواً غیر سرکاری۔ یہ ناقابلِ فہم ہوگا کہ پاریزئن (Parision) پارک شہری چلائیں۔ یا امریکن بار ایسوی ایشن اور امریکن میڈیکل ایسوی ایشن کا جائزہ لیں، جو اپنے پیشوں کو چلاتی ہیں، ان اختیارات کے تحت جو انہیں ریاست حوالے کرتی ہے۔

اس قسم کے شراکت کی جڑیں اینگلو امریکی تاریخ میں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ انگریز باؤ طبقہ کے ساتھ بڑھا پھولا، جو— جیسا کہ ہم نے پہلے باب میں دیکھا— اپنے علاقوں اور پھر ان سے بھی آگے، حکومتی ذمہ داری نبھاتے تھے۔ یہ تصور امریکہ کی نو آبادیوں تک پہنچا اور پھر ریاست تک پہنچ گیا، جہاں باوسائل لوگ سیاست اور حکومت میں داخل ہوئے یہ امید رکھے بغیر کہ یہ کبھی ان کا پیشہ بھی ہو سکے گا۔ جب جارج واشنگٹن نے صدارت کی دوہری مدت مکمل کرنے کے بعد اپنے فارم پر واپس آیا، وہ اپنے طبقہ کی جبلت پر ہی چل رہا تھا۔ وہ ورجینیا کے زمینداروں میں سے تھا، ان سے امید کی جاتی تھی کہ وہ بغیر کسی لالچ کے حلقے

کے رکن ،جسٹس آف پیس، مقامی فوج کے کمانڈر اور ایوان برگسس (House of Burgesses) کے نمائندوں میں شامل ہوں گے۔ یہ رجحان تامس جیفرسن (Thomas Jefferson)، جیمز میڈیسن (James Madison)، جیمز مونرو (James Monroe)، ولیم ہنری ہیریسن (William Henry Harrison)، جان ٹیلر (John Tyler)، بنجمن ہیریسن (Benjamin Harrison) اور تھیوڈور (Theodore) اور فرینکلن روز ویلٹ (Franklin Roosvlet) نے آگے بڑھایا۔ غالبًا اس سے بھی اہم تر یہ کہ ان قد آور شخصیات سے نیچے، امریکی اشرافیہ کے پورے طبقے نے فلاح عامہ کو اپنی زندگیوں کا لازمی حصہ تصور کرلیا، مقامی اور وفاقی سطح پر ہی حکومتوں میں شامل ہوتے اور خارج ہوتے۔بعض امیر تھے، لیکن بیشتر وکیل اور بینکار تھے۔اس کے برعکس، براعظم یورپ میں حکومت کرنا ایک پیشہ تھا،اعلیٰ ترین عہدوں پر سول سرونٹ کیرئیر والوں کو ہی مقرر کیا جاتا۔فرانس میں، مثال کے طور پر،معروف بیوروکریٹس کیلئے پرائیویٹ سیکٹر میں جانا معمول تھا لیکن کسی کاروباری شخصیت کے حکومت میں شامل ہونے کانہیں سنا تھا۔

امریکہ میں پیشہ ور ملازمین کو ہمیشہ ایک خاص مقام حاصل تھا۔ الیگزینڈر ہملٹن (Alexander Hamilton) نے یہ پیش بنی کر لی تھی جب اس نے فیڈرلسٹ پیپرز (Federalist Papers) میں وضاحت کی کہ وزارء، وکلا اور پروفیسرز غیر جانبدار ہوں گے اور پس مختلف صنعتی اکائیوں اور سماج کے طبقات کے مابین ''سرکاری منصف'' کا کام کریں گے۔ یہ تنہا ہی سماج کے عمومی مفادات کی ترویج کرسکیں گے۔تاہم آج یہ پیشے اپنے حقیقی کردار کا عکس ہیں۔تراش خراش کی ایک خاص تحریک کے تحت انہیں کچل ڈالا جہاں ایک طرف منڈی میں مسابقت بڑھ رہی ہے تو دوسری طرف پیشہ وروں اور ذاتی کاروبار کرنے والوں کے بیشتر فرائض حکومت نے خودسنبھال لیے ہیں۔''اشرافیہ نے برطانیہ کو بیوروکریسیت سے بچایا جو کہ خطے کے دوسرے تمام مما لک کی قسمت میں لکھی جا چکی تھی،'' میکس و بیر نے 1905ء میں اپنی کتاب دی پروٹسٹنٹ ایتھک اور سرمایہ داری کی روح (*The Protestent Ethics and Spirit of Capitalism*) میں لکھا تھا۔لیکن آج اینگلو امریکہ اور براعظم کی دوسری ریاستوں کے درمیان یہ فرق برائے نام ہی رہ گیا ہے۔گزشتہ 4 عشروں میں ریاست نے پیشہ وراداروں کی عدالتی وانتظامی ذمہ داریاں اور

اسکے ساتھ ساتھ اس اثر ورسوخ پر بھی قبضہ کرلیا جو پرائیویٹ کمپنیاں، خیراتی ادارے اور افراد سماج کی اجتماعی زندگی پر رکھتے تھے۔اینڈ ریو کارینگی کو تعلیم سے لگاؤ تھا ،اسلئے اس نے امریکہ میں کتب خانے کا نظام بنانے میں مدد کی۔آج ایسی کوئی بھی پیشکش کاغذی کارروائیوں اور سرخ فیتے کی نذر ہو جائے گی کیونکہ سارا عمل پوری طرح سے افسر شاہی کی نذر ہو گیا ہے۔ ریاست کے دائرہ اختیار میں یہ وسعت متعدد شعبوں میں حیران کن رہی ہے— زیادہ لوگوں کو زیادہ خدمات مہیا کرنا— لیکن اس سے امریکیوں میں یہ سوچ پیدا کوئی ہے کہ عوامی کام کرنے کا موزوں ذریعہ حکومت ہے۔اپنے حصے کے ٹیکس کی صورت میں سماج میں حصہ ڈالکر ، لوگ خود کو عوامی مفاد کی سرگرمیوں سے آزاد خیال کرتے ہیں۔یہ رجحان یورپ میں زیادہ ہے، جہاں امریکہ کی نسبت دولت کی سطح سے قطع نظر،لوگ پیسے اور وقت کی بہت تھوڑی مقدار عوامی مفاد میں صرف کرتے ہیں۔اب تو امریکہ میں عوامی خدمت کے حقیقی ادارے— مقامی حکومتیں، کمیونٹی بورڈز وغیرہ— پیشہ ور سیاستدانوں کا شعبہ سمجھے جاتے ہیں، عام شہری ان میں دلچسپی نہیں لیتا۔اشرافیہ اور سماج کے رشتے میں تبدیلی حکومت کی کامیابی کو متاثر کرتی ہے۔قانون اور کاروبار کی تعلیم کے بڑے ادارے بتاتے ہیں ، گزشتہ 30 برس میں، ان کے قابل ترین فارغ التحصیل طلبا، جو حکومت میں جانیکے خواہشمند ہیں، کی تعداد کم سے کم تر ہوتی جارہی ہے۔

غالباً قانون دانی ذاتی پیشہ میں سے واحد مثال ہے کہ جو تاریخی لحاظ سے بھی عوامی سروکار رکھتا تھا۔حتیٰ کہ آج بھی وکیل کو ''عدالت کا افسر'' سمجھا جاتا ہے۔یہ اس حقیقت کو ٹھیک ٹھیک واضح کرتا ہے کہ وکلاء پر نظام عدل کو سر بلند کرنے کا فرض اور ذمہ داری ہے۔ حکومت بھی ان سے توقع رکھتی ہے کہ وہ چند پیشہ وارانہ معیار ملحوظ خاطر رکھیں گے اور پریکٹس کا لائسنس لینے کے بدلے چند افعال سرانجام دیں گے۔تاہم، یہ پیشہ اپنے اراکین پر بہت سی اضافی شرائط اور ذمہ داری بھی نافذ کرتا ہے،ان سے مطالبہ کرتا ہے کہ زندگی میں صرف قانونی تقاضوں کا ہی نہیں اخلاقی اصول بھی مدنظر رکھیں۔ضابطہ اخلاق، جو امریکن بار ایسوسی ایشن جیسی تنظیموں کی طرف سے نافذ کیا جاتا ہے،اس طرح تیار کیا جاتا ہے کہ وکلا کو داخلی معیارات کا پابند بنایا جائے جو انہیں لائق احترام واعتماد بنائیگا نہ کہ ایک منتشر جماعت۔ تاریخی تناظر میں، وکلا اپنے موکلین کے مشیر کی حیثیت رکھتے تھے، انکے طویل مفادات کو پیش

نظر رکھے۔ اکثر اسکا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے موکل کو نصیحت کرتے کہ وہ بیجا قانونی چارہ جوئی سے باز رہے، قطع نظر کہ اسے بھاری رقم فیس کی شکل میں ملتی ہو۔ ایلیہو روٹ (Elihu Root)، نیویارک بار کے صدر، جنہوں نے 20ویں صدی کے اوائل میں وزیرِ خارجہ، سیکرٹری آف وار اور نیویارک کے سینٹر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیتے رہے، نے ایک بار کہا، ''معقول وکیل کا نصف فرض یہیں مکمل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے موکل کو بتائے کہ وہ احمق ہے اور اسے مقدمہ بازی سے گریز کرنا چاہیے۔''

امریکی سماج میں وکیل کو ممتاز مقام حاصل تھا (15)۔ ایسے ملک میں جہاں جاگیردار اشرافیہ غیر موجود تھی، وکلا نے خود کو عوامی درد رکھنے والا گروہ ثابت کیا۔ امریکہ کے ہر قصبے اور شہر میں یہی سرکردہ شہری تھے، جنہوں نے عجائب گھر، ہسپتال، بلدیاتی ادارے تعمیر کرنے میں مدد کی اور سرکاری دفتروں کے چکر لگائے۔ مثال کے طور پر، جیمز سی کارٹر (James C. Carter)، 19 ویں صدی کے اختتام پر نیویارک کے سرکردہ وکیل پر غور کریں۔ اس نے نیویارک کی بار کونسل کے قیام میں مدد کی، شہر اور ریاست میں اصلاحات کی تحریک میں کلیدی کردار ادا کیا، جسمیں ٹِلڈن کمیشن (Tilden Commision)، اینٹی ٹمانی کمیٹی (anti-Tammany Committee)، نیشنل میونسپل لیگ (National Muncipal league)، سیٹزن یونین (Citizen Union)، سٹی کلب (City Club) اور گڈ گورنمنٹ کلبز (Good Government Clubs)۔ دوسرے لفظوں میں، اسکی عوامی زندگی کا بیشتر حصہ عوامی فلاح میں صرف ہوا۔ اور اپنے لوگوں میں نایاب نہیں تھا۔ نیویارک اور امریکہ کے ہر قصبے میں اس جیسے سینکڑوں دیکھے جا سکتے تھے۔ ہنری سٹیمسن (Henry Stimson)، جس نے دونوں، تھیوڈور (Theodore) اور فرینکلن روز ویلٹ (Franklin Roosevelt)، کیساتھ سیکرٹری آف وار کی خدمات انجام دیں، اور ہربرٹ ہوور (Herbert Hoover) کے وزیر خارجہ رہے، اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں ''امریکی وکیل خود کو حکومت کا ممکنہ ملازم تسلیم کرے۔۔۔ اگر کوئی ایسا وقت آیا کہ یہ روایات سماج سے معدوم ہو گئیں اور بار کے ارکان کاروبار کے غلام بن گئے تو شہری آزادیوں کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔'' سٹیمسن نے وکالت اور شہری آزادیوں کے مابین جس تعلق کی طرف اشارہ کیا وہ بے بنیاد نہیں: جب ٹوکویل نے اپنا مشہور زمانہ جملہ کہا کہ امریکی

اشرافیہ'' یا تو بار پر ملیں گے یا بینچ پر''، تو اسکی مراد محض یہ نہیں تھی کہ وکلا امریکی سماج کا ہراول دستہ ہوں گے۔ ٹیوک ویل کو امریکہ کے متعلق ''اکثریت کے ہاتھوں استحصال'' کا خوف تھا۔ کیونکہ اسکے پاس یورپ جیسا ترقی یافتہ سماجی ڈھانچہ نہیں تھا، اسے ڈر تھا کہ اسکے پاس شرفا طبقہ کا فقدان تھا جو سماجی موازن کا کردار ادا کریں۔ ایسے طبقے کی غیر موجودگی میں، اسے خوف تھا، ملک خودغرض، سیاسی لٹیروں، عوام پرستوں اور دوسری غیر آزاد خیال قوتوں کے جال میں پھنس جائے گا۔ ٹیوکویل کے خیال میں وکلا پیدائشی شرفا ہوتے ہیں، ہملٹن کیطرح، اسکا بھی خیال تھا کہ یہ دوسری قوتوں کے زیر اثر نہیں ہوتے اور عوامی مفاد میں تمیز کر سکتے ہیں۔ وکیل، اس نے لکھا، ''عوامی احتساب کا ایسا نظام تشکیل دیتے ہیں جو جمہوریت کو برائیوں سے پاک کر کے اس کی نعمتوں کو محفوظ کرتے ہیں۔''

یہ قانون کا مثالیت پسند تصور تھا لیکن تیس برس پہلے تک اس نے پیشتر امریکی وکلا کا طرز عمل شدت سے متاثر کیا۔ مصنف مائیکل لوئیس (Michael Lewis) نیو اور لینز (New Orleans) میں اپنے والد کے شراکت داروں کو یاد کرتا ہے: ''انکی زندگیاں ایک مفروضے پر قائم رہیں: اٹارنی خطا سے پاک ہوتا ہے۔ وہ خاص علم رکھتا ہے۔ ایک ضابطۂ اخلاق پر عمل کرتا ہے۔۔۔ اسکے نزدیک دنیا کی قیمتی ترین چیز سماج میں اسکا مقام ہے اور جہاں تک ایک عام انسان جانچ سکتا ہے وہ اسے قائم رکھنے کیلئے ذہنی توانائی کا ایک اونس بھی خرچ نہیں کرتا۔ معاشرتی منصب اسکا مسئلہ نہیں؛ بلکہ یہ اسکے طرز زندگی کا نتیجہ ہے۔'' وکالت کا یہ معصوم دنیا پیشے میں آنے والے نئے مداخلت کاروں سے متزلزل ہونے لگی، 1977ء میں سپریم کورٹ کا فیصلہ کہ وکلا اپنی خدمات کے لیے اشتہار دے سکتے ہیں، بڑے بڑے قانونی اداروں میں مسابقت کا رجحان۔ وکالت نے'' امریکیوں کی دو جبلتوں، جمہوریا نے اور کاروباری کرنے کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے''، لوئیس نے لکھا(16)۔ ایک نسل پیچھے تک وکالت ایک مشترکہ کاروبار کی طرح کی جاتی تھی۔ کسی بھی شہر میں محدود تعداد میں ادارے ہوتے تھے۔ مارکیٹ میں جگہ بنانا مشکل تھا۔ پہلے سے کام کرنیوالے اچھی زندگی گزار رہے تھے لیکن کبھی اسے کاروبار بنانیکی کوشش نہیں کی۔ وکالت ایک معقول اور قابل احترام معیار اور طرز زندگی کے حصول کا ذریعہ تھا، نہ امیر ہونے کا۔ انکے پاس مستحکم مارکیٹ تھی جس میں منافع کی شرح بھی مستقل اور متوقع ہوتی تھی۔ ایسے

ماحول نے وکلا کوذاتی دلچسپیوں کو برروئیکار لانے کی ضمانت دی۔ نیویارک کی ایک لاءفرم میں ایک معمر شراکت دار نے مجھ سے کہا،

میرے پاس یہ نوجوان ہیں جوسوچتے ہیں کہ وکالت اور عوامی
خدمت کوکسطرح یکجا کر سکتے ہیں، ڈین آچیسن اور سائرس
وینس کی طرح۔لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتے۔اولاً، کوئی بھی وکیل جو
جوایک طرف ایسی سرگرمیوں میں ملوث ہوشراکت دار پسند نہیں
کریگا۔دوم، کوئی بھی شریک اتنے گھنٹے صرف نہیں کرے گا، اسلئے کہ
خودکوکاروبار میں شامل کرنے کے قابل شمار کروا سکے۔وینس
سیاسی اور پالیسی معاملات پر مہینوں کام کرتا،
جب وہ نوجوان وکیل تھا۔لیکن آپ مزید ایسا نہیں کر سکتے۔وکالت
اب ایک کاروبار ہے، اوراس مسابقتی کاروبار پر خدا کی مار ہو۔"

رکھوالوں سے گریبان پکڑنے والے

جووکالت کے لئے درست تھا، تھوڑے فرق کیساتھ ہر پیشے پر صادق آتا تھا۔امریکن میڈیکل ایسوسی ایشن(American Medical Association) کسی زمانے میں جدید دور کا کامیاب ترین اتحاد تھا، ڈاکٹروں کو عزت، حفاظت اور مضبوط بناتا تھا۔اسکے عوض ڈاکٹروں سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ مریض کی صحت کو اولیت دیں گے۔طب کا پیشہ ہمیشہ اپنے مریضوں کو یہی یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ انہیں اس حوالے سے پریشانی کی ضرورت نہیں کہ ڈاکٹر بنا کسی ٹھوس وجہ کے کوئی عمل گولی تجویز کرے گا۔ (ہپو کریٹس(Hippocratic) حلف بلوں کے چکروں کے بارے میں خاموش ہے۔) گزشتہ چند عشروں سے، تاہم، حکومت صحت کے شعبے میں سب سے بڑا عامل بن گئی ہے، بیمہ کمپنیوں اورصحت کے اداروں نے اخراجات میں کمی کی کوششیں کیں، اور صحت عامہ کے دوسرے پیشہ ور زیادہ مضبوط ہوئے ہیں، ڈاکٹروں نے اپنی ممتاز حیثیت کھودی ہے۔اب ڈاکٹر بھی ایک کاروبار کا مالک ہے، جسکا دن اخراجات میں کمی پر غور کرتے، مقدمہ بازی کی فکروں اور مسابقت کے دباؤں میں بسر ہوتا ہے۔اسکے نتیجے میں ڈاکٹر اور مریض کا بے مثال رشتہ اب

مزید موجود نہیں، سوائے انکے جو بہت امیروں کے، جنکے لئے پیسے قابلِ فکر چیز نہیں۔ وکالت کی طرح، میڈیکل کا پرانا تصور بھی پھولوں سے مزین ہے، لیکن اس سے یہ حقیقت تبدیل نہیں ہوتی کہ گزشتہ 30 برس میں ادویات میں بھی تبدیلی آئی ہے۔

کچھ یہی کہانی اکاؤنٹنگ کی بھی ہے۔ 1933ء میں کانگریس کی ایک سماعت کے دوران کینٹکی (Kentucky) سے منتخب ہونیوالے نمائندے ایلبن برکلے (Alben Barkley) نے کرنل آرتھر کارٹر (Colonel Arthur Carter)، جو اس دور کی بڑی اکاؤنٹنگ فرم کے سربراہ تھے، سے دریافت کیا کہ آیا اکاؤنٹنٹس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے کہ وہ موکلین کے حسابات کی نگرانی کریں۔ برکلے نے سوال کیا ''آپ کی پڑتال کون کرتا ہے؟'' کارٹر کا جواب تھا، ''ہمارا ضمیر۔'' یقیناً، اس کا صرف یہ مطلب نہیں تھا۔ یہ پیشہ بھی اعلیٰ معیار کی بنیادوں پر قائم تھا اور مالیاتی حسابات کا ایماندار نگران شمار ہوتا تھا۔ اکاؤنٹنٹ کو قابل اعتماد سمجھا جاتا تھا— یہ منظر اس سے مختلف تھا جو اینرن (Enron) کے زوال نے پیش کیا۔ اکاؤنٹنٹس کی بڑی فرم آرتھر اینڈرسن (Arthur Anderson) کی 2002ء میں تباہی کو سمجھنے کے لیے وال سٹریٹ جرنل (*Wall Street Journal*) نے اکاؤنٹنٹس سے انٹرویو کیے جنھوں نے بتایا کہ کس طرح اس پیشے نے گزشتہ 20 برسوں میں ڈرامائی موڑ مڑے ہیں۔ اگر وکلا کو خدمات کا اشتہار کی اجازت دنیا وکالت میں بڑی تبدیلی تھی تو اکاؤنٹ میں یہی کام 1989ء میں فیڈرل ٹریڈ کمیشن (Federal Trade Commission) اور امریکن انسٹی ٹیوٹ آف سرٹیفائڈ پبلک اکاؤنٹنٹس (American Institute of Certified Public Accountants) کے مابین معائدے میں انہیں اجازت دے کہ وہ اپنی مرضی سے معاوضہ لے سکتے ہیں نہ کہ فی گھنٹہ۔ اسکا مطلب تھا کہ اب اکاؤنٹنٹس عمومی مشاورت سے بڑی بڑی رقوم اکٹھی کر سکتے ہیں۔ اس تبدیلی کا مقصد پیشہ میں اصلاحات لانا اور زیادہ کھولنا اور مسابقت کا عمل تیز کرنا تھا (یہاں بھی، جمہوریا نے اور کاروباری کرنے نے ایک ساتھ کام کیا)۔ لیکن انکا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اکاؤنٹنٹس نے ٹیکس بچانے کے طریقے ایجاد کر لیے اور فرموں کی بچائی ہوئی رقوم میں سے اپنا حصہ وصول کرنے لگے۔ انتھونی رائیڈر (Anthony Rider) ارنسٹ اینڈ ینگ (Ernst & Young) کے اکاؤنٹنٹ، نے جرنل کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا کہ کس طرح اسے پارٹیوں کو نئی خدمات فروخت کرنا سکھایا گیا: قانون، بیمہ،

مشاورت، پلاننگ، ہر وہ چیز جو اجرت دیتی ہو۔"یہ ایسے ہی تھا جیسے رپورٹرز کو حصص کی فروخت بتانا،" رائیڈر یاد کرتے ہوئے بولا،"میں یہ نہیں کرسکا۔ میں جانتا تھا میرے کلائنٹس کو انکی ضرورت نہیں۔" رائیڈر کو نکال دیا گیا لیکن اسکے بہت سے ساتھی حالات کے مطابق بن گئے۔ وقت کیساتھ ساتھ اکاونٹنٹ کلائنٹس کے مطالبات پورے کرنے کیلئے سر کے بل کھڑے ہونے پر بھی تیار ہونے لگے، بنیادی طور پر ان کا کردار، جیسا کہ وال سٹریٹ جرنل (Wall Street Journal) نے لکھا،"رکھوالاوں سے گریبان پکڑنے والوں میں بدلنے لگا(17)۔"

اداروں کے مابین حدودِ فاضل کا دھندلانا وال سٹریٹ میں روز کا معمول ہیں۔ بینکروں اور برکروں پر اپنے سرمایہ کاروں کی ذمہ داریاں ہیں، ان میں ایک کہ یہ ادارے اپنے محققین، جو ان کمپنیوں اور بینکاروں کی جانچ پڑتال کرتے ہیں، اور اپنے بینکاروں، جن سے یہ لوگ سرمایہ کاری کرتے ہیں، کو اپنے دائرہ اختیار میں رکھیں۔ ہنری کافمین (Henry Kaufman)، سالومون برادرز (Salomon Brothers) میں تحقیق کے سابق سربراہ، یادداشت پر زور ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ 80 کے عشرے تک، فرمیں ان حدود کا احترام کرتی تھیں اور تحقیق کلیتاً آزاد رکھتی تھیں۔ 90ء کی دہائی کے اختتام تک، یہ حدود تیزی سے ختم ہو رہی تھیں؛ انٹرنیٹ نے انہیں صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔ محققین ٹیکنالوجی کے میدان میں مصروف کمپنیوں کے کھاتوں کے بارے میں بے ہودہ رپورٹیں شائع کرتے ہیں اور بینک انکو معلومات فراہم کرنے کے بدلے بڑی بڑی رقوم اینٹھتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر سرگرمیاں بالکل قانونی دائرے میں آتی ہیں۔ درحقیقت، اس عمل میں ڈی ریگولیشن کے بہت سے عمومی فائدے بھی تھے، مسابقتی مارکیٹ قائم کرنا، نئے لوگ سامنے لانا اور تکنیکی اور انتظامی جدتیں پیدا کرنا۔ لیکن اس نے بہت سے مسائل کو بھی جنم دیا، مفادات کے جھگڑے شروع کیے، سہولیات میں رکاوٹ ڈالنا اور عوام کا وسیع تر مفاد خطرے میں ڈالنا— جنہیں بالآخر ان تبدیلیوں کا وصول کنندہ سمجھا جاتا تھا۔ نئی مالیاتی منڈیاں پہلے سے زیادہ توانائی سے بھرپور اور کھلی تھیں— لیکن یہ متلون مزاجی، غلط معلومات، فراڈ اور خبط کی طرف بھی زیادہ مائل تھیں۔ انٹرنیٹ کے تناظر میں، بہت سے سیاستدان اور بیوروکریٹ چیخ چیخ کر زیادہ نگرانی اور ریگولیشن کا مطالبہ کر رہے ہیں— ان کاموں کو غیر قانونی قرار دینا چاہتے ہیں جو قبل ازیں

صرف غیر اخلاقی تھے۔ اگر اور جب کبھی یہ قوانین منظور کر لئے گئے تو غیر روایتی ریگولیشن کے اینگلو امریکی ماڈل سے روایتی ریگولیشن کی طرف مزید، غالبا ناگزیر، تبدیلی ہوں گے۔ غالباً اس مسئلے زیادہ بہتر، لچک دار اور ذہین حل ہے کہ یہ ادارے خود کو منظّم کریں، وہ حدیں بحال کریں جو گزشتہ چند عشروں میں پھلانگ لی گئی ہیں۔ لیکن اس مطلب ہمٹی ڈمٹی کو دوبارہ شروع کرنا ہوگا۔

اشرافیہ کی خودکشی

مخصوص پیشوں کے رجحانات میں اس تبدیلی کے پس پردہ جو بڑا ثقافتی تغیر کارفرما ہے وہ اشرافیہ کا کردار ہے۔ امریکی اشرافیہ کے بارے میں بات کرنا یا سوچنا پسند نہیں کرتے۔ یہ لفظ بذاتِ خود ادعا پسند اور غیر امریکی لگتا ہے۔ لیکن امریکہ میں ہمیشہ سے اشرافیہ کا وجود تھا— لوگوں کا چھوٹا سا طبقہ جو تمام بڑے بڑے ادارے کو چلاتا تھا۔ قدیم اشرافیہ عموماً بند نظام تھے، سلسلہ بھی خون کے رشتوں، پیدائش یا نسل سے چلتا تھا۔ نیا نظام زیادہ جمہوری ہے، لوگ پیسے، ذہانت، شہرت کے باعث شامل ہو جاتے ہیں— کلی طور پر، انتخاب کا زیادہ جمہوری طریقہ ہے۔ ایک اور بڑا فرق، تاہم، قدیم اشرافیہ سماجی حوالے سے زیادہ ذمہ دار تھے کیونکہ ان کا سماجی منصب کسی خطرے میں نہیں تھا۔ نئے لوگ کہیں زیادہ مسابقتی دنیا میں مصروف عمل تھے۔ بڑی کمپنیوں کے چیف ایگزیکٹوز کے پاس بے پناہ طاقت تو ہے لیکن یہ خود کو غیر محفوظ سمجھتے ہیں، چاروں طرف سے ایک دباؤ میں، باقی رہنے، دوسروں سے آگے رہنے کیلئے مسلسل مجبور رہتے ہیں۔ پس، انکی دلچسپیاں زیادہ وسیع نہیں محدود ہیں؛ ان کی سوچ بھی طویل المدت نہیں صرف کل کی فکر کرتی ہے۔ مختصراً، یہ اشرافیہ کی طرح سوچتے یا کام نہیں کرتے، جو بڑی بدقسمتی ہے، کیونکہ وہ ابھی تک ہیں۔

اشرافیہ کے رجحانات میں اس بڑی تبدیلی کا سب سے بڑا مظہر وہ ایشو ہیں جنکی یہ حمایت کرتے ہیں۔ 20 ویں صدی کے اوائل میں، رابرٹ بروکنگس (Robert Brookings) جیسے لوگوں نے پبلک پالیسی ریسرچ اداروں کی بنیاد رکھی— ان میں بروکنگز انسٹی ٹیوٹ (Brookings Institute جسکی بنیاد 1916ء میں رکھی گئی) پہلی مثال تھی— اسکا مقصد گروہ بندیوں اور تفرقہ بازی سے بالاتر ہو کر ملک کی خدمت کرنا تھا۔ بروکنگز کا

مقصد،'' سیاست یا روپے پیسے کے مفادات سے بالکل آزاد' ادارہ بنانا تھا۔۔۔ملک کے اقتصادی حقائق جمع کرے، انکی وضاحت کرے، اور عام فہم انداز میں عوام کے سامنے لائے(18)۔'' نیشنل بیورو آف اکنامک ریسرچ (National Bureau of Economic Research جسکی بنیاد1920ء میں رکھی گئی) ایسے غیر جماعتی مقاصد کے لیے وقف تھا۔ تاہم، 20ء صدی کے اوائل، کسی بھی طرح کم نظریاتی دور نہیں تھا، جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ دراصل، غالبًا ان جھگڑوں کے باعث جو ان دنوں میں ہر ایشو کے ساتھ جڑے تھے ــ خواتین کا حق رائے دہی، محصولات، کاروبار کو منظّم کرنا، جنگ عظیم اول، لیگ آف نیشنز ــ لوگ ایسے ادارے تشکیل دینا چاہتے تھے جو سیاست کی داغدار شخصیت سے بے نیاز ہو کر عوامی حکمت عملی کا جائزہ لیں۔ کونسل آن فارن ریلشینز (Council of Forieng Relations CFR)، مثال کے طور پر، کی بنیاد1921ء میں ڈیموکریٹس اور ری پبلکنز نے عالمی معاملات میں امریکی مداخلت کے مسئلہ پر جماعتی حمایت حاصل کرنے کیلیے رکھی تھی۔ بظاہر تو یہ سب اس طنز آمیز دور میں بہت قابل احترام اور فرض شناس نظر آتا ہے ،لیکن یہ لوگ درحقیقت یقین رکھتے تھے کہ عوامی مسائل پر غیر سرکاری نقطۂ نظر حاصل کرنا جمہوریت کے لیے از حد ضروری ہے۔ سی ایف آر کا پہلا اعزازی صدر الیہو روٹ (Elihu Root)، ایک سینئر ری پبلکن ،اور پہلا صدر جان ڈبلیو ڈیوس (John W. Davis)، جو 1924ء میں ڈیموکریٹ پارٹی کا صدارتی امیدوار تھا۔ سی ایف آر نے خارجہ پالیسی پر بحث کا ایسا ماحول قائم کرنے کی جدوجہد کی جو مہذب مگر غیر سرکاری اور جماعتی اثرات سے آزاد ہو۔ سی ایف آر رسالے ،فارن افیئرز (*Foreign Affairs*)، کے بانی ایڈمنسٹر نے ایک مرتبہ اپنے ڈپٹی کو کہا کہ اگر ان میں سے کوئی ایک ڈیموکریٹ مشہور ہو گیا، دوسرے کو فوراً ری پبلکن کی مہم جاری کرنا گی۔

آج، جب اشرافیہ کسی مسئلے میں مداخلت کرتے ہیں تو ایسا جماعتی مفادات کے تناظر میں ہوتا ہے، عموماً اس مسئلے پر جو انہیں متاثر کرتا ہے۔ گزشتہ 30 برس میں قائم کیا گیا تقریباً ہر ادارہ اور تھنک ٹینک انتہائی نظریاتی ہے۔ اسکی ایک وجہ امریکہ کے قدامت پرست حلقوں کی طرف سے اس مہم کا مقابلہ کرنے کی اجتماعی کوشش ہے جو بروکنگ انسٹیٹیوٹ اور کونسل آن فارن ریلشنز، جنکے بارے میں خیال ہے کہ 60ء اور 70ء کے عشروں میں بائیں بازو کی

طرف جھک گئے، نے شروع کی۔ لیکن اس جھکاؤ کو اور زیادہ جانبدار اداروں کے قیام سے ختم کرنے کی بجائے، قدامت پرستوں نے اپنے نظریات کی ترویج کرنے والوں کی تشکیل سے کیا۔ یہ قدامت پرست طرز عمل بالآخر ایک آزاد خیال ردعمل پیدا کریگا، واشنگٹن میں پبلک پالیسی کی دنیا کو مزید تقسیم سے دوچار کرے گا۔ پبلک پالیسی کے بیشتر اداروں میں دانشوروں کا انتخاب انکے نظریات سے کیا جاتا ہے نہ کہ مہارت اور تجربہ کی بنیاد پر، اور اکثر وہ نتائج جانتے ہیں جن پر انہیں پہنچنا ہوتا ہے۔ انہیں بظاہر تو مجبور نہیں کیا جاتا لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ ان تھنک ٹینکس نے انہیں آزاد دانشور بننے کیلئے نہیں طلب کیا۔ جیسے کہ برٹن پائنس (Burton Pines)، ہیریٹیج فاؤنڈیشن (Heritage Foundation) میں ریسرچ ڈائریکٹر، نے علی الاعلان اعتراف کیا، ''ہمیں یہاں کسی پی ایچ ڈی کمیٹی میں شامل نہیں کیا گیا۔ ہمارا کردار پبلک پالیسی تیار کرنے والے قدامت پرستوں کو دلائل فراہم کرنا ہے کہ اپنے نقطۂ نظر کو پھیلا سکیں (19)۔''

جماعتی ادارے ان کہیں زیادہ کم پریشان کن ہیں جو خاص نظریات نہیں کھلے مفادات کیلئے بنائے گئے ہیں۔ واشنگٹن میں موجود بہت سے ''انسٹی ٹیوٹ'' اور ''فاؤنڈیشن'' دراصل مخصوص مفاداتی گروہوں کیلئے فرنٹ آفس ہیں: کارپوریشنز، مزدور تنظیمیں، حتیٰ کہ بیرونی حکومتیں بھی۔ وہ ''تحقیق'' کا بیراج پیدا کرتے ہیں تاکہ اپنے محسنوں پر ثابت کرسکیں کہ وہ سبسڈی یا دوسری نوازشات کے حق دار ہیں۔ جماعتی حدود اور سرپرستی کے درمیان، پبلک پالیسی کی آزاد جانچ واشنگٹن سے تقریباً غائب ہوگئی ہے۔ واشنگٹن دو نظریاتی حصوں میں تقسیم ہوکر رہ گیا ہے اور ہر کوئی، بالآخر، ان میں سے ایک کا حصہ بنتا ہے۔ ماضی پرستانہ سی نظر ڈالتے ہیں: پبلک پالیسی کبھی غیر جانبداری میں تیار نہیں ہوتی، جماعتی سیاست اور مفاداتی گروہ متاثر کرتے ہیں — اور ایسا ہونا چاہئے۔ لیکن جس نے بھی واشنگٹن کا گزشتہ 30 برس میں مشاہدہ کیا اس میں ایک ڈرامائی تبدیلی آئی ہے، مفادات کے حق میں جارحانہ حکمت عملی، چاہے وہ دانشور اپنائیں یا لابئسٹ، کا اضافہ ہوا ہے۔ جماعت بندی کی حدوں سے آگے نکلنے کی کوششوں کی بجائے واشنگٹن کی نئی اشرافیہ اسے اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتی ہے۔

ایک ادارے کو امریکی سماج میں ثالث کا کردار ادا کرنا ہے: پریس۔ یہ دنیا کو اپنے لوگوں پر کھولتا ہے اور لوگوں کو دنیا پر۔ کسی بھی دوسرے ادارے سے زیادہ امریکہ میں سچ اور

سیاسی ایجنڈے کے تعین میں پریس سے زیادہ فیصلہ کن کردارادا کیا ہے۔ پھر بھی دوسرے ثالثی اداروں کے برعکس، جنہوں نے تاریخی حوالے سے عوامی جذبات ٹھنڈے کیے ہیں، پریس انہیں اکثر ہوا دیتا ہے۔ یہ خبروں میں سنسنی خیز اور ڈرامائی انداز دیتا ہے۔ یہ ٹی وی اور جریدوں پر صادق آتی ہے، لیکن یہ رجحان صحافت کو سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے ۔ اسکی وجوہات بمشکل ہی غارتی ہیں۔صحافت بھی جمہوریانے اور مارکیٹا ائزیشن کی اسی لہر کی زد میں ہے جس میں دوسرے تمام شعبے ہیں۔ تین بڑے ٹی وی چینل، مثال کے طور پر، 1980ء کی دہائی تک ایک اتحاد کی شکل میں کام کرتے رہے، جانتے تھے کہ انکے پاس ناظرین کا مخصوصہ طبقہ ہے۔اس پکے گڑھ، مشمولات پر خاص پابندیوں کے ساتھ، نے نیٹ ورکس کو مجبور کیا کہ وہ اپنے نیوز بیورو کو غیر منافع بخش سمجھنے لگیں۔ وہ خبروں، دستاویزی فلموں اور ثقافتی پروگراموں میں رقم خرچ کرتے۔

پھر معلومات کا انقلاب آ گیا، لاگت کمی ہوئی، نئے راستے کھلے، اور ہر قسم کی نئی مسابقت ساتھ لایا۔کیبل ٹی وی کے عروج کا مطلب تین ٹی وی چینلز کی اجارہ داری کا خاتمہ تھا۔ آج روایتی نیٹ روکس کو ایک ایک منٹ خبروں، تفریح اور گفتگو کے پروگراموں کے میدان میں نئے چینلز سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اس مسابقت نے چند بہترین شخصیات اور پروگرام پیدا کیے ہیں۔بعض اوقات اس میں بور پروگرام بھی فائدے میں رہتے ہیں۔ مجموعی تاثر نیچے تک ایک دوڑ کا رہا ہے۔اگر آپ اپنے ناظرین کو ہنسا یا خوفزدہ نہیں کر سکتے تو وہ آپکا چینل چھوڑ کر دوسرے پر چلا جائیگا۔ ایک تجربہ کار براڈ کاسٹر نے مجھ سے کہا،'' متبادلات کا عروج ناظرین کے حوالے سے مثبت ہونا چاہیے تھا کیونکہ انہیں انتخاب کو موقعہ ملتا ہے۔لیکن اصل معاملہ یہ ہے کہ اس طرح لوگوں کو جنسی اور سطحی قسم کے پروگرام دکھانا آسان ہو گیا ہے۔اچھی کتابوں کی طرح اچھے پروگرام تیار کرنا بھی دیکھنے والے سے کچھ مانگتے ہیں۔لیکن کوئی ایگزیکٹو آج اپنے ناظر کو ایک منٹ کے لیے بھی بور کرنے کا خطرہ مول نہیں لیگا۔ اس

ریموٹ کنٹرول سے ہر کوئی خوفزدہ ہے۔''اس ماحول میں، یقیناً، خبروں کے چند اچھے پروگرام بھی ہیں جو اس رجحان کو ہوا میں اڑا دیتے ہیں۔لیکن ان میں سے اکثر کئی دہائیاں پہلے شروع ہوئے اور اس عرصے میں انہوں نے اپنے ناظرین حاصل کیے ہیں۔

کاغذی صحافت بھی متبادل ذرائع سے خبریں حاصل کرنے کے رجحان کے ہاتھوں لتاڑی

گئی ہے۔ بہت سے اخبار، جو کبھی نامی گرامی تھے، بند ہوئے؛ دوسرے اپنی سابقہ شہرت کا عکس رہ گئے۔ لیکن کاغذی صحافت اسی حوالے سے ترقی کر رہی ہے کہ مٹھی بھر معیاری اخبارات اور رسائل آج بھی موجود ہیں۔ نیویارک ٹائمز(*New York Times*)، وال سٹریٹ جرنل(*Wall Street Journal*) اور واشنگٹن پوسٹ (*Washington Post*) پہلے سے کہیں بہتر ہیں۔ ایسا اس لئے کہ یہ ٹی وی کی نسبت کہیں کم لوگوں کو ہدف بناتے ہیں، اسی منتخب گروہ کا ہی مقابلہ کرتے ہیں۔لیکن امریکہ میں چھوٹے چھوٹے سینکڑوں اخبارات جو شہری ذمہ داریاں ادا کر رہے ہیں، ان تین سے نہیں ہو سکتی تھیں۔ انکے مسلسل معیار کی ایک اور — اہم — وجہ یہ ہے کہ تینوں خاندانی لوگ، جن میں عوامی خدمت کا جذبہ ہے، چلاتے ہیں اور جنہیں اسکا بخوبی احساس ہے کہ وہ محض ایک کاروبار نہیں بلکہ قومی ادارہ چلا رہے ہیں۔ جب بھی خاندانی مالک نے اپنا اخبار کسی بڑے ادارے کے ہاتھ فروخت کیا ہے، اسکے معیار میں ڈرامائی کمی آئی ہے؛ لاس اینجلس ٹائمز سے لے کر فیلاڈلفیا انکوائرر تک کسی کو بھی دیکھ لیں۔ اکثر تو اخبار بالکل ہی بند کر دیئے گئے۔ چند سنجیدہ رسائل نے ترقی کی ہے ،لیکن وجہ وہی ہے کہ ان اخبارات ،جیسا کہ دی نیو یارکر اور دی اٹلانٹک منتھلی (*The Atlantic Monthly*)— دونوں کو معیاری اخبارات سے کم قارئین کا سامنا ہے — کے مالکان معیار کو نظر انداز کرنے پر راضی ہیں۔* لیکن ایسے مالکان کم سے کم ہیں، اس کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ یہ بہت بڑی بدقسمتی ہے؛ یہ ممکن ہے کہ معیاری صحافت، جو زیادہ سامعین تک پہنچ سکے، کے بغیر فعال آزاد خیال جمہوریت قائم ہو، لیکن آئیڈیل سے کہیں زیادہ دور ہے۔ میڈیا، آخر کار، واحد صنعت ہے جسکی حفاظت امریکی آئین میں کی گئی ہے۔ تاہم، اس کیساتھ جڑے المیے منفرد نہیں ؛ جمہوریت کی ترقی کے لیے دوسرے ادارے بھی ضروری ہیں، اور ان کا زوال بھی پریشان کن ہے۔ مصنف جیمز فیلوز (James Fallows) کہتا ہے کہ ''بعض اشیا اور خدمات ایسی ہوتی ہیں جنکی سماج کیلئے اہمیت کاروباری انداز میں ڈھال

*نیوز ویک (*Newsweek*)، جہاں میں خود کام کرتا ہوں، وسیع تقسیم ہونے والے ان چند اشاعتوں میں سے ہے جو اب بھی خبروں کو سنجیدگی اور تفصیل سے کور کرتے ہیں۔ یہ ایسا کرنے میں اس لئے کامیاب ہے کہ نیوز ویک گراہم (Graham) خاندان کی ملکیت ہے جو واشنگٹن پوسٹ (*Washington Post*) بھی چلاتے ہیں۔

کرنہیں جانچی جاسکتی ــــ صحت عامہ، تعلیم، صحافت اور قانون کے بارے میں سوچیں۔ سماج کی حالت بدترین ہوتی اگر انکے ذریعہ اور نوعیت کا تعین آزاد منڈی کے بل پر کیا جاتا۔ آپ اپنے بچے کو ایسے ادارے میں داخل نہیں کرائیں گے جس نے اپنا سلیبس مارکیٹ کی ڈیمانڈ کے مطابق طے کیا ہے۔ اسی طرح، اچھی صحافت کے سماج کو ان سے کہیں فائدے ہیں جو منافع پیدا کرتے ہیں۔'' اسکا ہرگز یہ مطلب نہیں ان اداروں کو بچانے کے لیے حکومت قواعد وضوابط کو ضرور استعمال کیا جائے۔ دراصل، تاریخی تناظر میں قانون اور صحافت کیلئے، واحد حل عوامی خدمت سے معمور اشرافیہ ہی ہے۔ لیکن اس وقت کیا کیا جائے اگر یہ اشرافیہ ہی شاذ و نادر ہوں؟

سماج میں آپ کی عزت اور مرتبہ محفوظ تو عوامی خدمت کرنا آسان ترین ہوتا ہے۔ یہی معاملہ امریکہ کی حقیقی اشرافیہ ــــ پروٹسٹنٹ اسٹیبلشمنٹ ــــ کا تھا۔ ریاست کے قیام سے 1960ء کے عشرے تک امریکی سماج پر سفید فام اینگلوسیکسون پروٹسٹنٹ طبقہ غالب رہا ہے۔ صدور، وزرا خارجہ، گورنر، سرکردہ صنعت کار، بار کونسلوں کے سربراہ اور تمام یونیورسٹیوں کے صدور یہی لوگ تھے۔ خاندانوں کے جال، سکولوں، کالجوں اور کلبز کے ذریعے انکا ایک دوسرے سے رشتہ تھا، جس سے یہ مراعات یافتہ طبقے کی نہیں ایک سماجی طبقہ بن گئے تھے ــــ یورپی اشرافیہ کا امریکی روپ۔ باہر کے افراد کو کلبز میں داخلے کی اجازت تھی تاوقتیکہ وہ اینگلوسیکسون پروٹسٹنٹ کی طرح دِکھیں، ملبوس ہوں اور گفتگو کریں۔ (''یہودی سوچو، انگریز نظر آؤ'' کامیابی کا یہودی نسخہ تھا۔) سماجی طبقہ کیساتھ مخصوص اقدار بھی آئیں۔ سفید فام اینگلوسیکسون پروٹسٹنٹ طبقہ کی اقدار فکری اور تعلیمی نہیں تھیں۔ ایک اخبار کا کالم نگار جوزف ایلسوپ (Joseph Alsop) ایک واقعہ یاد کرتا ہے جب وہ گروٹن، نئے برطانیہ کا

پریپ سکول جو، اپنے عروج کے دنوں میں، سفید فام پروٹسٹنٹ بچوں کی تربیت کا اولین ادارہ تھا، میں داخل ہو رہا تھا۔ اسکی ماں نے ہیڈ ماسٹر اینڈی کوٹ پی باڈی (Endicott Peabody) کو بتایا کہ چھوٹا جو (Joe) کتابوں اور نظریات میں دلچسپی رکھتا ہے۔ ''ہم یہ سب اسکے دماغ سے نکال باہر پھینکیں گے''، ریورینڈ پی باڈی نے جواب دیا۔ گروٹن بھی روشن ذہن نہیں ''طاقتور مسیحی'' پیدا کرنے کی کوشش کرتا تھا، جو نیک اور محنتی زندگی گزاریں، ایک ضابطۂ اخلاق کے پابند رہیں، عوامی خدمت کو ایک ذمہ داری سمجھیں جو طاقت کے ساتھ آتی

ہے۔ گروٹن کا نعرہ'' خدمت کرنا حکومت کرنا cui servire est regnare—''ہے(20)۔* بہت سے پہلوان اور ورزش کرنیوالے تھے جنہیں نوکریاں اور ترقیاں ملتی تھیں، مراعات بھی لیتے تھے کیونکہ ایک خاص نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ مجموعی طور پر اینگلوسیکسون انتظامیہ نے عوامی خدمات کی تلقین اور تقلید کی — صدارت سے لیکر مقامی حکومتوں تک۔

جیسے جیسے امریکہ 20ویں صدی میں زیادہ متنوع النسل، کھلا اور شمولیت پسند ہوا ، سیکسون انتظامیہ کو ایک کشمکش کا سامنا ہے: یہ اپنی قوت کو برقرار رکھتے ہوئے یہ اپنے گروہوں میں اجنبیوں کا داخلہ روک سکتے ہیں، یا یہ اپنے دروازے سماج کے غیر سفید فام ارکان پر بھی کھول سکتا ہے۔ ان کی کہانی ملی جلی ہے۔ شروع میں، اس صدی کے اوائل میں، اشرافیہ نے ذات کی حیثیت حاصل کر لی اور اس کی رکنیت سوشل کلبز تک محدود ہوگئی، اور آئیوی لیگ (Ivy League) سے قابل یہودیوں کو دور رکھا جاتا (21)۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ، یہ حدیں قابل عمل نہیں رہیں۔ جزواً، اس وقت کے مزاج کے مطابق یہ نا قابل عمل تھا، جزواً سرمایہ داری نظام با صلاحیت و قابل ترین لوگ مانگتا تھا، انکی نسل سے قطعِ نظر۔ بالآخر سفید فاموں نے اپنے کلبز کے دروازے دوسروں پر کھول دیئے۔ 60ء اور 70ء کے عشروں تک، تمام ادارے جنکے اختیارات پروٹسٹنٹ اسٹیبلشمنٹ کے پاس تھے باہر والوں کیلئے بھی کھول دیئے گئے۔ اسی میں اسٹیبلشمنٹ کی اپنی موت کا سامان تھا۔ چاہے شہری حقوق کی تحریک سے یا آئیوی لیگ کالجوں کے آغاز سے یا وال سٹریٹ میں سفید جوتے تیار

کرنیوالے ، سفید فاموں نے اقتدار کی غلام گردشوں میں نئی اشرافیہ قبول کی — یہودی، آئرش کاتھولک، اطالوی اور پھر بالآخر عورتیں سیاہ فام اور ایشیائی باشندے۔ (اس دنیا کے

* اسکا ترجمہ ایسا ہی کیا جاتا ہے۔ اسکا زیادہ لغوی ترجمہ ہوگا، ''اس (خدا) کی خدمت کرنا حکومت کرنا ہے''، ہوگا، لیکن پی باڈی ہمیشہ چاہتا تھا کہ فقرے کو ہمیشہ عوامی خدمت کے معنوں میں لیا جائے۔ وہ اس فرق کو ترجیح دیتا تھا، جو'' دعاؤں کی عام کتاب (Book of Common Prayer)'' سے ہے، ''جسکی خدمت مکمل نجات ہے''۔ اس نے ایک بار کہا، ''اگر گروٹن کے کچھ لڑکے عوامی خدمت میں قدم نہ رکھیں اور ہماری مادرِ وطن کے لئے کچھ نہ کریں، یہ اس لئے نہ ہوگا انہیں ابھارا نہیں گیا۔''

کچھ حصے — مردوں کے چند چھوٹے کلب — سماج سے کٹ کر خاص نسلوں کے لئے ہی رہے ہیں۔ مخصوص کلب اب امریکہ میں موجود ہیں لیکن اب وہ پیسہ دیکھتے ہیں نہ کہ نسل۔) سفید فاموں نے یہ تبدیلی اسلئے نہیں کہ انہیں دھکیلا جا رہا تھا بلکہ جانتے تھے یہی درست راستہ ہے۔ اپنی مراعات اور اقدار کے انتخاب میں انہوں نے موخرالذکر کو منتخب کیا۔

امریکہ کی نئی اشرافیہ سمارٹ کالج گریجوایٹ ہیں۔ یہ اپنی پیشروؤں سے کہیں متنوع اور متحرک اشرافیہ ہیں۔ اس طبقہ کے افراد کو اپنے اشرافیہ ہونے کا احساس نہیں۔ اگر وہ ردعمل کرتے ہیں تو محض انکار ہے۔ دنیا کے امیر ترین افراد میں شامل ہونے کے بہت برسوں بعد تک بل گیٹس خود کو متوسط طبقے میں شمار کرتا رہا۔ حال ہی میں، جب انکی دولت اس قدر ہوگئی کہ نظرانداز نہ کی جا سکے، لوگوں نے اسے دیکھا اور اسکے ہم جنس افراد جنکا یہ نمائندہ تھا، کا ردِ عمل ایک سا تھا: ایک عام انسان جسے اتفاق سے ڈھیروں ہاتھ لگی گئی ہو۔ لیکن یہ تصور غلط اور نقصان دہ ہے۔ لوگوں کا چھوٹا سا گروہ — غالباً 10 لاکھ یا آبادی کا اعشاریہ 5 فیصد — امریکہ کے کم و بیش تمام بڑے ادارے چلاتا ہے یا کسی طرح انہیں متاثر کرتا ہے۔ اس صورت حال نے ملک پر ڈرامائی اثرات مرتب کیے ہیں۔* ان کا موازنہ ایک عام امریکی شہری سے کیا جائے تو یہ بہت بااختیار ہیں۔ اگر نہ یہ خود اور نہ ہی ملک انکو اشرافیہ شمار کرے تو دونوں ہی ایک دوسرے کے ساتھ ایڈجسٹ نہیں کریں گے۔ اشرافیہ کو طاقت کی کمی نہ ہوگی کیونکہ وہ نظروں میں آئے بغیر گزر جاتے ہیں ---اس سے کہیں دور۔ رڈیارڈ کپلنگ (Rudyard Kipling) کے بقول، انکے پاس قوت ہوگی لیکن ''ذمہ داری سے

* قوت صرف اقتصادی اور سیاسی نہیں ہوتی۔ عہد وسطیٰ کے نظریہ کے مطابق جن کے پاس خاص مہارتیں اور فن ہیں ان کی ذمہ داریاں بھی خاص ہیں۔ علم قوت ہے۔ اگر آپ کو یہ بات پرانی لگے تو اس غور پر جو شمالی امریکہ کے ماہرِ حیاتیات نے مجھ سے کہی: ''ہم میں سے چند درجن ہی جانتے ہیں کہ خطرناک مواد کسطرح تیار کرنا ہے، اس قدر خطرناک جو ہزاروں کی جان لے سکے، اگر زیادہ نہیں تو۔ مجھے یہ سوچ کر خوف محسوس ہوتا ہے۔ میں نہیں جانتا اس قوت کا کیا کروں۔'' نہ وہ اور نہ ہی سماج ہی یہ سوچتا ہے کہ اپنے علم کو کیسے استعمال کیا جانا چاہیے۔ ہر کسی کے ذہن میں یہی ہے کہ وہ تجربہ گاہ میں محقق ہے، نہ کہ کوئی امیرزادہ۔ پھر بھی اس کے پاس قدر طاقت ہے کہ یورپ کے کسی بھی شہزادہ کے پاس ہوتی تھی۔

آزاد طاقت؛ صدیوں سے چلا آرہا فاحشہ کا حق (22)۔"

19 ویں صدی کے اختتام پر پہلے سنہری دور میں نمود و نمائش آج کی امیرانہ سرگرمیوں کا مقابلہ کرتی تھی۔ لیکن اس وقت امیر، غالباً مذہب کے زیرِ اثر یا بنیاد پرستی کے، اپنی دولت مندی کے اثرات کی فکر میں رہتے تھے۔ غور کریں کہ گروٹن جیسے ادارے گزشتہ 3 یا 4 عشروں میں کیسے تبدیل ہوئے ہیں۔ 70 کی دہائی تک ان کی چند ایک خوابگاہ ہی انفرادی ہوتی تھیں، دروازے اور چھت کے بغیر ان عمارتوں میں چند ایک سہولیات دستیاب تھیں اور سٹیریو اور ٹی وی وغیرہ کا نام تک نہ تھا۔ لڑکے صبح قطار بنا کر دھات سے بنے بیسن میں ہاتھ دھوتے اور ٹھنڈے پانی سے نہاتے۔ گروٹن جانیوالے لڑکے، کہہ لیں، 20 کے عشرے میں، اکثر کھاتے پیتے گھرانوں کے چشم و چراغ تھے اور بچپن سے وسیع دالانوں اور ملازمین کی فوج کیساتھ پلے بڑھے تھے۔ پھر بھی انہیں سکول میں سپارٹن طرز زندگی میں رہنا پڑتا۔ اس کا مقصد، جیسا کہ مورخ صحافی نکولس لیہمن (Nicholas Lehman) نے لکھا ہے، "امیر لڑکوں کو پلکے بوائے یا نازک مزاج بننے سے روکنا تھا۔ انہیں مالی استحکام دینا نہیں (جو کہ وہ پہلے ہی رکھتے تھے) اچھا اور کار آمد بنانا مقصود تھا (23)۔" آج گروٹن یا اینڈوور (Andover) جیسے سکول اور ہارورڈ (Harvard) اور ییل (Yale) جسے کالج طلبا کو مستحکم ہونے کی تعلیم دیتے ہیں، یا کم از کم اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں کامیابی کے گر سکھاتے ہیں۔ لوگوں کو اچھا انسان بنانے کے لیے تربیتی عمل کو بذات خود مشکل، محنت طلب سمجھا جاتا ہے۔ گروٹن کا ایک سابق طالب علم نے سکول کے اپنے حالیہ دورے کو یاد کیا: "سونے کے کمرے ویسے ہی دِکھتے ہیں لیکن اب ان میں سٹیریو اور ٹی وی آ گئے ہیں اور ہر وہ سہولت جو آپ چاہتے ہیں۔ عمومی تاثر، نسبتاً ہمارے دور سے، تیتروں کے ایک فارم کا لگتا ہے۔ ہمیں شعوراً، تن آسان چیزوں سے باز رکھا جاتا تھا۔ انہیں وہ بھر بھر کر دی جا رہی ہیں۔" بات یہ نہیں کہ گروٹن جیسے ادارے معیار میں گر گئے ہیں۔ لیکن سماج کی طرح، وہ کردار کی بجائے کامیابیوں پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ *

اینگلو امریکی اشرافیہ کا مذاق اڑانا آسان ہے، جس میں بلند خیال پدریت کا قابلِ

* یہ رجحان دوسرے سکولوں میں اس سے بھی مضبوط دیکھا جا سکتا ہے، لیکن نیو انگلینڈ پریپ سکولوں کے معاملے میں، آپ ان کی اپنے ہی ماضی سے انحراف دیکھ سکتے ہیں، جب انہوں نے ایسا کیا— کردار پر بہت زیادہ توجہ اور کامیابیوں پر بہت کم۔

غور ماحول ہے، یہ اپنے کلچر کے بارے میں احساس تفاخر کا نتیجہ ہے۔لیکن اس میں چند مثبت اقدار بھی ہیں— شرافت، نفاست، آزادی اور پروٹسٹنٹ طرز پر مقصدیت کا احساس— جو سماج کیلئے معیارات کے تعین میں مدد دیتے ہیں۔یقیناً، یہ ضوابط مصنوعی، نسل مرکزی، اور اکثر منافقانہ ہیں۔اکثر وبیشتر ناجائز استعمال ہوتے ہیں، اور مانے جانے سے زیادہ توڑے جانے میں زیادہ معزز سمجھے جاتے ہیں۔لیکن کیا کیا جائے؟''منافقت،'' جیسا کہ مورخ جان لوکاس (John Lukacs) نے لکھاہے،''وہ سیمنٹ ہے جو تہذیب کو جوکر رکھتی ہے۔''اخلاقی معیار سماج کے بلند آدرشوں کی علامت ہیں نہ کہ اسکی پیچیدہ حقیقتوں کی۔جب با اختیار طبقہ احساس کرتا ہے کہ سماجی رویے کی چند حدود ہیں، وہ اپنی طاقت پر بند باندھتے ہیں اور، بالواسطہ، سماج کو بتاتے ہیں،''یہی ہے وہ جسکے لیے ہم کوشش کرتے ہیں۔''

ایک آخری مثال شاید امریکہ میں اشرافیہ کے بدلے ہوئے تصور کی وضاحت کر دے(24)۔کامیاب ترین فلم ٹائی ٹینک(*Titanic*) اور تاریخی حقائق میں اختلافات میں سے ایک بالخصوص قابل ذکر ہے۔فلم میں، جہاز ڈوبنے کے دوران، پہلے درجے کے مسافر چند ایک موجود چھوٹی کشتیوں میں بیٹھنے کی جدوجہد کرتے ہیں۔صرف سخت جان ملاحوں کی ہمت کی وجہ سے، جنہوں نے بندوقوں کی مدد سے ان امراء کو پرے رکھا، اور بچوں اور عورتوں کو کشتیوں میں روانہ کیا۔دراصل، بچ جانیوالواں کے بیان کے مطابق،''عورتیں اور بچے پہلے'' کے تصور پر اعلیٰ طبقہ میں بلا امتیاز عمل ہوا۔اعداد وشمار حقیقت واضح کردیتے ہیں۔اول درجے میں تمام بچے، 5 کے علاوہ تمام عورتیں (کل تعداد 144 تھی)، تین نے اپنے خاوندوں کیساتھ مرنے کو ترجیح دی، بچالئے گئے۔اسکے برعکس، اسی درجے کے 70 فیصد مرد ہلاک ہوگئے۔دوسرے درجے میں، جو امیر ملازمت پیشہ سے بھرا تھا، 80 فیصد عورتیں بچ گئیں، 90 فیصد مرد ڈوب گئے۔فوربز کے مطابق پہلے درجے میں 400 مرد مسافر سوار تھے۔جان جیکب ایسٹر (John Jackob Astor)، اس وقت امریکہ کا امیر ترین شخص، کو، کہا جاتا ہے، لڑ کر کشتی تک پہنچنا پڑا، اپنی بیوی کو سوار کیا، اور پھر، خود بیٹھنے سے انکار کر کے، پیچھے ہٹا اور اسے خدا حافظ کہہ دیا۔اسی طرح بینجمن گگن ہیم نے نشست لینے سے انکار کر دیا اور اپنی جگہ ایک عورت کو دے دی، اس سے کہا کہ وہ اسکی بیوی کو یہ پیغام پہنچا دے:''میری بیوی کو بتانا۔۔۔ میں نے کھیل کو ایمانداری اور اختتام تک کھیلا۔کوئی بھی عورت اس کشتی پر

باقی نہیں بچے گی کیونکہ بینجمن گگن ہیم ایک بزدل ہے۔'' دوسرے الفاظ میں، دنیا کے چند طاقتورترین افراد ایک غیرتحریری روایت کے پابند ہوتے — حتیٰ کہ اسکا مطلب یقینی موت تھا۔

فلمسازوں نے اچھے کے لئے ہی کہانی میں بدلی: کوئی بھی آج اس پر یقین نہ کرتا۔ہم نے اپنے اعلیٰ طبقوں کو کسی قسم کی ذمہ داری کے احساس سے آزاد کر دیا ہے اور انہوں نے خوش دلی سے ردِعمل دکھایا۔ جدید سماج میں وہ ہم جیسے ہی ہیں، عام انسان۔ہم ایسا رویہ دکھاتے ہیں کہ شاید سماج میں اس قدر جمہوری اور متحرک ہے کہ اس میں اشرافیہ کا وجود نہیں ہے۔ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ مراعات کیساتھ ذمہ داریاں بھی آتی ہیں۔ سماجی کنونشن، پیشہ ورایسوسی ایشنز، اخلاقی سبق، پریپ سکول — یہ سب طاقتور کو مہذب بنانے کے طریقے تھے۔ ماضی میں، امریکی سماج کو ان مردوں، عورتوں سے امید تھی کہ یہ ذمہ دار رویہ اپنائیں گے اور کسی نہ کسی طرح عوامی زندگی میں شامل ہوں گے۔

واشنگٹن ڈی سی کے نیئر ایسٹ پوٹو میک پارک (Near East Potomac Park) میں ایک یادگاری مجسمہ ایستادہ ہے، ایک مرد کا جسکے بازو کھلے ہیں، مسیح کی طرح، اسکے چبوترہ پر عبارت ہے: ''ٹائی ٹینک کے بہادر مردوں کے نام، جنہوں نے اپنی جانیں دیں کہ عورتیں اور بچے بچائے جائیں۔'' یہ سارے امریکہ کی 25000 عورتوں کے عطیات سے نصب کیا گیا تھا۔ جب سماج کے رہنما آدرشوں کے مطابق رہیں تو یادگار ہو جاتے ہیں۔ جب ایسا نہیں ہوتا تو بہت مایوسی ہوتی ہے۔ آج، اسکے برعکس، ہمیں بااختیار نشستوں پر بیٹھے ہوؤں سے بہت کم امیدیں ہیں، اور وہ شاذ و نادر ہی ہمارے امیدوں پر پورا نہیں اترتے۔

اختتامیہ

الجھن سلجھانے کا راستہ

20 ویں صدی دو رجحانات کے زیر اثر رہی ہے: سرمایہ دارای کی ریگولیشن اور جمہوریت کی ڈی ریگولیشن۔ دونوں تجربات حد سے بڑھ گئے۔ دونوں درپیش مسائل، بے قابو سرمایہ دارای اور چند سری حکومت، کا دانش مندانہ حل تھے۔ لیکن جیسا کہ اویلن وا(Evelyn Waugh) نے اپنے طربیہ ناول ''سکوپ(*Scoop*)'' میں نشاندہی کی کہ ہر اچھا خیال ''ایک حد تک'' ہی مؤثر ہوتا ہے۔

20 ویں صدی کے پہلے برسوں میں، آزاد منڈیاں اور تجارت ہی مستقبل کا ناگزیر راستہ نظر آتی تھیں۔ ممالک ایک دوسرے کے ساتھ تجارت کر رہے تھے، اپنی منڈیاں، بلکہ سماج، ایک دوسرے پر کھول رہے تھے۔ منڈیاں رواں دواں تھیں۔ لیکن یہ انکشاف ہوا کہ پہلی جنگ عظیم سے قبل کے سالوں میں، افراط زر کی حد سے بڑھی شرح اور کساد بازاری عدم مداخلت کیلئے بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئے۔ اس وقت سے جب کوئی مسئلہ کھڑا ہوتا —اقتصادی، سماجی یا سیاسی— حکومت کی مداخلت اسکا حل تھا۔ ہر بحران نئے حل اور ضابطے لے کر آتا اور ہر حل نئی بیورو کریسی کو جنم دیتا۔ نتیجے میں، 20 ویں صدی کے زیادہ دور میں، سرمایہ داری پر اس حد تک محصولات لگائے گئے، پابندیاں عائد ہوئیں اور قومیایہ گیا کہ 1945ء میں برطانیہ کا سرکردہ مورخ اے جے پی ٹیلر(A. J. P. Taylor) یہ کہہ اٹھا، ''امریکی طرز زندگی پر کوئی بھی یقین نہیں رکھتا...... یہ پرائیوٹ انٹر پرائز ہے۔'' 1961ء میں برطانیہ کی ملکہ الزبتھ دوم کو گھانا کے دورے میں ''عظیم ترین سوشلسٹ بادشاہ'' کا خطاب دیا گیا، جسے انکی ٹوری پارٹی نے ایک اعزاز کے طور پر قبول کیا۔ 1971ء میں قدامت پسند ری پبلکن رچرڈ نکسن نے امریکی معیشت پر اجرت اور قیمتوں کو کنٹرول کرنیکا نظام لاگو کیا اور

اعلان کیا ''اب ہم سب کینز کے ماننے والے(Keynesians) ہیں''،وہ مروجہ نظریہ ــ حتیٰ کہ امریکہ میں بھی ــ کی عکاسی کر رہا تھا کہ سرمایہ داری کو ریاست کو کنٹرول کرنا چاہیے۔

جمہوریت مخالف سمت میں چلی گئی۔''جمہوریت کے امراض کا حل''،متاثر کن امریکی فلسفی جان ڈیوی (John Dewey) نے 1927ء میں لکھا،''اور زیادہ جمہوریت ہے۔''وہ غیب دان تھا۔ بیشتر مسائل جو بیسویں صدی میں اکثر جمہوریتوں کو درپیش تھے کا حل حق رائے دہی وسیع کرکے، بالواسطہ انتخابات کے خاتمے،اشرافیہ کی طاقت گھٹا،اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ طریقوں سے طاقتور بنا کر کیا گیا۔نتائج پرجوش تھے۔امریکہ میں اسکا مطلب تھا کہ سیاہ فام اور عورتوں کو بھی ووٹ کا حق مل گیا،سینٹر بلاواسطہ منتخب ہوں گے،اور کلبز نے اپنی نوعیت اور ضابطے بدل لئے۔بیسویں صدی کی سیاسی تاریخ زیادہ براہ راست سیاسی شرکت کی کہانی ہے۔اور کامیابیوں نے جمہوریت کا مستقبل روشن رکھا ہے۔ بیماری چاہے کچھ بھی ہو،زیادہ جمہوریت علاج بن گئی۔

سرمایہ داری کی ریگولیشن 70ء کی دہائی میں ٹیکسوں کی بھاری شرح اور رومی طرز کے حکومتی کنٹرول کے باعث حد سے بڑھ گئی تھی۔گذشتہ دو دہائیوں سے،ساری دنیا کی حکومتوں نے،امریکہ سے فرانس، بھارت سے برازیل تک،صنعت،کمپنیوں کو نجکانے،اور محصولات کم کرنے میں لگی رہی ہیں۔جبکہ 1990ء کی دہائی کا اقتصادی بوم منکشف ہوا، نئے ریگولیشن قوانین اور سرمایہ داری میں حکومت کی مداخلت کی نئی تشریح کی ضرورت ہوگی۔لیکن چند حکومتوں کے ہی ایک نسل پیشتر کی داغدار سرگرمیوں کی طرف لوٹنے کا امکان ہے۔ریاست اقتصادیات پر کنٹرول کے عروج سے واپس لوٹ پسپائی اختیار کر چکی ہے۔

جمہوریت کی ڈی ریگولیشن بھی بہت آگے تک چلی گئی ہے۔اس نے ایک کمزور نظام کو جنم دیا ہے، جو رائے عامہ کے حصول اور اسے آگے لیجانے کے قابل نہیں ہے۔اگرچہ کوئی بھی موجودہ جمہوریت کو برا بھلا کہنے کی جرأت نہیں کریگا،لوگوں کی اکثریت جبلی طور پر مسئلہ کو سونگھ لیتی ہے۔سیاست اور سیاسی نظام کے لئے عوامی احترام، ترقی یافتہ جمہوریت میں،تاریخی پستیوں میں ہے۔ایک اور سازش یہ کہ،بار بار کی رائے شماری میں، جب امریکیوں سے پوچھا جاتا ہے کہ کہ کون سے ادارے ان کیلئے سب سے زیادہ قابل احترام

ہیں، تین انکی ہمیشہ ان کے سرفہرست ہوتے ہیں: سپریم کورٹ، مسلح افواج اور فیڈرل ریزرو سسٹم۔ ان تینوں میں ایک قدر مشترک ہے: یہ عوامی دباؤ سے محفوظ ہیں اور غیر جمہوری انداز سے کام کرتے ہیں۔ یوں لگتا ہے امریکی اسی لیے انہیں پسند کرتے ہیں کہ یہ پیروی کرنے کی بجائے رہنمائی کرتے ہیں۔ اسکے برعکس کانگرس، جو عوامی رائے کا عکاس ترین سیاسی ادارہ، بیشتر سروے میں نچلے درجوں میں آتا ہے۔ عوام اس دلالی اور نتیجہ میں پیدا ہونے والی معذوری کو مایوسی، حتیٰ کہ تضحیک سے دیکھتے ہیں۔ یقیناً یہ نفرت و مایوسی انہیں ان عملوں کا جشن منانے سے نہیں روکتی جو ان حالات کے ذمہ دار ہیں۔

نیابتی جمہوریت

جب خطرات حد سے بڑھ جائیں تو ہم خود کو روز روز کی سیاست کے حوالے نہیں کرتے۔ کسی بھی جمہوریہ نے ایک ہفتہ کی رائے شماری پر اعلان جنگ نہیں کیا ہیے۔ دہشت گردی کیخلاف جنگ کو ان حکومتوں نے شروع کیا ہے جنہیں عوام نے آزادی سے عمل کرنے کا اختیار دیا ہے۔ ہمیں نئے خطرات کا سامنا ہے لیکن حکومت کو نئے اور گہرے دباؤ کا بھی سامنا ہے۔ جمہوریتوں کو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ دہشتگردی کے ساتھ مؤثر انداز میں نپٹ سکتی ہیں، یا پھر ہم بہت سے ترقی پذیر ممالک میں ایک نئی جبریت اٹھتے ہوئے دیکھیں گے۔ ترقی پذیر ممالک، بالخصوص عالمِ اسلام، کو ایک مشکل قدم کی ضرورت ہوگی، جو انکے حالات میں توازن قائم کرے۔ انہیں دہشتگردی کے نئے خطرات سے نمٹنے کے لیے کافی مضبوط ہونا ہوگا۔ اسکے ساتھ اس حد تک کھلا اور جمہوری بھی کہ ایسی سیاسی مخالفت کو جنم نہ دیں جو انتہا پسندی میں بدل جائے۔ دوسرے الفاظ میں، انہیں دہشت گردوں کو ختم کرنا ہوگا دہشتگردی کی افزائش کیے بغیر۔ جب یہ صحیح ہوتا ہے، تو پھر ریاست کی طاقت، اسکا استحقاق اور اثر پذیری مل کر کام کر سکتے ہیں، ایک بہترین چکر میں ہر ایک دوسرے کو مضبوط کرتا ہے۔ جب چیزیں بے ترتیب ہوتی ہیں تو یہی بہترین چکر بدترین —اور متشدد، ہو جاتا ہے۔ استحصال انتہا پسندی پیدا کرتا ہے جو مزید استحصال کو جنم دیتا ہے۔ روس کا چیچنیا کیساتھ رویہ اس بدترین اور پرتشدد سلسلے پریشان اور افسوس ناک مثال ہے۔

گلوبلائزیشن نے مخصوص چیلنجوں کو جنم دیا ہے۔ پھیلتی ہوئی عالمی معیشت نے حکومتوں

کو مجبور کر دیا ہے کہ منظّم حکمت عملیاں اپنائیں جو طویل مدت تک مالی استحکام قائم رکھیں۔
جب یہ ایسا نہیں کرتیں، منڈیاں ریاستوں کو اسقدر تیز اور سخت سزا دیتی ہیں کہ مثال نہیں ملتی، کرنسیوں اور سٹاک مارکیٹ تباہی کی طرف دھکیل دی جاتی ہیں۔اور طویل المدت پالیسیاں قلیل المدت اذیتیں دیتی ہیں — ووٹرز کو۔آبادیاتی تبدیلیاں مغربی حکومتوں کے دباؤ ڈال رہی ہیں کہ اپنی فلاحی ریاستوں میں اصلاحات لائیں، خصوصاً ادھیڑ عمر شہریوں کیلئے۔ یہ تقریباً ناممکن ہوگا کیونکہ معمر شہری سیاسی طور پر طاقتور ہیں؛ وہ منظّم، پیسے سے بھی حصہ ڈالتے ہیں، اچھی لابنگ کرتے ہیں اور باقاعدگی سے ووٹ ڈالتے ہیں۔تاہم، حقیقی اصلاحات سے مراد بلاشبہ ان کے مفادات میں کمی ہوگا۔حکومتوں کو مشکل فیصلے کرنا ہوں گے، کمزرویوں سے فائدہ اٹھانے کی لالچ کا مقابلہ کرنا ہوگا، اور طویل المیعاد حکمت عملیاں نافذ کرنا ہوں گی۔ واحد ممکن راستہ جس سے یہ جدید جمہوریتوں میں حاصل کیا جاسکتا ہے، چند فیصلہ سازوں کو مفاداتی گروہوں، لابیز اور سیاسی مہم کے شدید دباؤ سے علیحدہ کر لیا جائے — کہنے کا مطلب ہے، جمہوریت کے شدید دباؤ سے۔

ایسا پہلے ہی ہو رہا ہے۔ آزاد مرکزی بینکوں کے عروج سے، جیسا کہ یوایس فیڈرل ریزرو (U.S. Federal Reserve)، گزشتہ چند دہائیوں سے، اس رجحان کی واضح ترین مثال ہے۔ جدید ترین جمہوریتوں میں، حکومت کا طاقتور ترین اقتصادی آلہ غیر منتخب ادارہ چلاتا ہے۔اور یہ کام بھی کرتا ہے۔ اگرچہ ان میں چند ایک خرابیاں ہیں، لیکن مرکزی بینکوں کی آزادی کا نتیجہ زیادہ ذمہ دار مالیاتی پالیسی کی صورت میں نکلا ہے۔ جزواً اس نظم وضبط، تجارتی چکر، جو کبھی شدید تھا، سے رکاوٹیں دور کی جاتی رہی ہیں۔2000-02 کے عروج، جس کے بعد گذشتہ نصف صدی کا طویل ترین بوم آیا، اتنا شدید نہیں جس قدر بہت سوں کو خوف تھا۔

مرکزی بینک ہی اسکی واحد مثال نہیں۔ یورپی یونین کی غیر جمہوری ماہیت کے باعث یورپ میں بہت گھٹن پائی جاتی ہے، اکثر غیر جمہوری پالیسی سازی کی بدترین مثال کی حیثیت سے تنقید کا نشانہ بنائی جاتی ہے۔ لیکن پریشان کن حقیقت ہے کہ یورپی یونین مؤثر رہی ہے کیونکہ اسے سیاسی دباؤ سے محفوظ رکھا گیا ہے۔1970ء کے عشرے تک، یورپ کی معیشتیں غیر فعال ہوگئیں، انکی حکومتیں طاقتور مفاداتی گروہوں کے باعث مفلوج ہو کر رہ

گئیں،ان میں سے بیشتر تحفظ پسند،اور تبدیلی کے مخالف۔گزشتہ دہائی سے، یورپ قابل ذکر اصلاحات— مالی، زرعی اور ریگولیٹری — کی اصلاحات لانے میں کامیاب رہا ہے،صرف یورپی یونین کی طاقت کے بل پر۔ جب یورپی یونین نے اپنی حکمت عملیاں تبدیل نہیں کیں تو اسکی وجہ رکن جمہوری حکومتیں ہیں۔ یورپ کی اہم سیاسی جماعتوں سے کسی میں بھی اتنی جرأت نہیں کہ ان ساختی اصلاحات کی وکالت کریں، جوسب جانتے ہیں کہ خطے کے طویل المیعاد استحکام کیلئے ضروری ہیں۔''یورپی یونین خطے میں آزادمنڈی اصلاحات کی سرکردہ، اور واحد ،ذریعہ ہے،'' جرمنی کے''ڈائی زیٹ(*Die Zeit*)'' کا ایڈیٹر جوزف جوفی (Joseph Joffe) لکھتا ہے۔''برسلز کے بغیر ہم اپنی اہم صنعتوں کوڈی ریگولیٹ نہ کر پاتے۔''یورپی یونین کے بجٹ ہدف چھوٹنے کے خوف کے بغیر اٹلی جیسے ملک کبھی بھی کم ترین خسارے کی طرف حرکت نہ کر پاتے۔ برسلز کے بغیر یورپ کے رائیگاں سبسیڈیز کی اصلاح کے لیے کوئی دباؤ نہیں ہوگا۔

اینگلوامریکی دنیا میں یورپی یونین کو مضحکہ خیز شکل میں دیکھا جاتا ہے۔اس حد تک کہ امریکی —اور برطانوی، جواس وقت یورپی کرنسی، یورو، کواپنانے نہ اپنانے کی تلخ بحث میں الجھے ہیں— کچھ خیالات رکھتے ہیں، وہ مضبوط اور سادہ ہیں۔ یورپی یونین بڑی ، پھولی ہوئی اور غیر جمہوری ہے اور یورپی زندگی کے دلکش تنوع کو نگل رہی ہے۔(''برسلز میں غیر منتخب بیوروکریٹ انگریز شراب سازوں کو بتارہے ہیں کہ شراب کیسے بنانی ہے!'') برطانیہ اور امریکہ میں یورپ پر تنقید کرنیوالے زیادہ تر سرمایہ دارای اور آزاد تجارت پر یقین رکھتے ہیں۔لیکن براعظم یورپ میں یورپ پر انگلیاں اٹھانے والے—جہاں یہ سب سے زیادہ کام کرتی ہے— مخالف سمت میں ترغیب رکھتے ہیں۔ ڈنمارک یورپی یونین اور یورو کے بارے میں سب سے متشکک ہے ۔لیکن پاؤل نائرپ رسموزن (Poul Nyrup Rasmussen)، پیشے کے لحاظ سے ماہر معاشیات اور ڈنمارک کے سابق وزیراعظم، نے واضح کیا کہ یورپی یونین کے مخالف زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو'' گلوبلائزیشن سے خوفزدہ ہیں: کم ہنر مند مزدور، عورتیں اور سرکاری ملازم۔ ان کیلئے یورپی یونین عالمی سرمایہ داری اور آزاد منڈیوں کی نئی دنیا کا محض ایک حصہ تھی۔'' یہی وجہ ہے کہ یورپی یونین اور اس جیسے دوسرے ادارے یہاں قائم رہیں گے۔کوئی جتنا چاہے ان پر تنقید کا کرے، حقیقت یہی ہے کہ آج

کی دنیا میں ممالک استصواب رائے سے سود کی شرح یا سود مخالف پالیسی نہیں اپنا سکتے۔ برسلز جن کاموں کیلئے ذمہ دار ہے—ریگولیٹری، تجارت، مالیاتی اور سود مخالف— امریکہ اور برطانیہ سمیت دوسرے ممالک میں پہلے سیاسی دباؤ سے آزاد ہیں۔

یورپی یونین جیسے ادارے، جن کی اکثر مطلق العنان، اور عام لوگوں کی رسائی سے باہر ہونے پر مذمت کی جاتی ہے، اصل میں ایسے نہیں ہیں۔ یورپی یونین کے اختیارات میں مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ برسلز کا بجٹ یورپی یونین کی مجموعی پیداوار سے صرف ایک فیصد سے تھوڑا ہی زائد ہے۔ اینڈریو موورک (Andrew Moravscik)، یورپ کا بہترین امریکی دانشور، نشاندہی کرتا ہے کہ مترجم اور کلرک نکال دیں، یورپین کمیشن میں 2500 افسران ہیں، ''کسی بھی متناسب حجم کے یورپی شہر کے ملازمین سے بہت کم اور تنہا فرانسیسی ریاست کے ملازموں کی کل تعدا کا صرف ایک فیصد ہے۔'' جہاں تک اس کی غیر جمہوری فطرت کا تعلق ہے، کوئی نیا قانون پاس کرنا چاہے تو اس کے 71 فیصد حکومتی ووٹوں کی ضرورت ہوتی ہے، ''امریکی آئین میں ترمیم کیلئے مطلوب شرح سے بھی زیادہ۔'' یورپی یونین، موورک کہتا ہے، کو مافوق ریاست خیال کرنے کی بجائے بین الاقوامی تنظیم سمجھنا جائے۔ اس قسم کے اکثر اداروں کیطرح، یہ اپنے رکن ممالک کی خواہشات کی عکاسی کرتی ہے۔ یورپی یونین اپنے اختیارات میں نہیں پھیل رہی۔ اسکے برعکس، اسمیں کانٹ چھانٹ ہو رہی ہے، اتھارٹی کی حدود واضح اور رکن ریاستوں کے ساتھ اپنا تعلق واضح کر رہی ہے۔ یورپی راہنماؤں کا رجحان ایک بڑی اور بہتر یورپی یونین کے قیام کی طرف ہے، جو وہ مہمات ہضم کر سکے جو یورپی یونین نے پہلے ہی سر لے رکھی ہیں۔

جواز یا استحقاق کا مسئلہ

یورپی یونین کی مشکلات، تاہم، ترقی یافتہ جمہوریتوں کے بنیادی مسئلہ کو اجاگر کرتی ہیں۔ اچھی حکومتوں کے لیے دباؤ بڑھ رہا ہے، لیکن جمہوری عہد میں، اس ناگزیری کے نتیجے میں تخلیق ہونے والی بیوروکریسی کے پاس جواز کی کمی ہے۔ عوامیت پرست، جیسے فرانس میں جین میری لی پن (Jean Marie Le Pen)، امریکہ میں پیٹ بچنن (Pat Buchanan) اور آسٹریا میں جارجک ہیڈر (Jorge Haidar) وغیرہ نے ان اداروں

کے اختیارات کے خلاف مہم چلائی ہے۔ وہ بیگانگی اور سمجھ میں نہ آنیوالے احساسات کو ضرب لگاتے ہیں۔ جب شرح سود بڑھتی ہے، تجارتی معاملات طے پاتے ہیں، صنعتیں ڈی ریگولیٹ کی جاتی ہیں عوامیت پرست احتجاج کرتے ہیں کہ یہ سب چند منحوس اداروں کی وجہ سے ہوا ، اندھیرے میں کام کر رہی ہیں۔ پھر بھی یہ ادارے اچھا کام کرتے ہیں ،ٹھیک روزمرہ سیاست سے خود کو دور رکھ کر۔ یہ مضبوط ترقی ،بہتر پیداواری صلاحیت، مستحکم مالیاتی ماحول اور دیگر اقتصادی مواقعوں کی فراہمی سے عام شہری کو بہت فائدے مہیا کر رہے ہیں۔ یہ مسئلہ کس طرح حل کیا جائے اور مؤثر اور جائز حکومت حاصل کرنا ہے؟

جمہوری نظریہ نگار کیطرف سے مدد کی امید نہ رکھیں۔ سینکڑوں غیر منتخب شدہ اداروں کی موجودگی کے باوجود (جو کہ اب جمہوری) جو حکومتوں کو فیصلہ سازی میں مدد دیتے ہیں، سیاسی فلسفہ دان جو جمہوریت کے بارے میں لکھتے ہیں اکثر اساسی طور پر مکمل اور آزاد جمہوریت کے حامی ہیں۔ ان مسائل سے لاعلم ہونے جو ان اداروں کا وجود لازم بنا دیتے ہیں اور اس حقیقت سے بے بہرہ ہو کر کہ یہ ادارے اپنے منتخب آقاؤں کے سامنے جوابدہ ہیں، نظریہ ساز دنیا کی حکومت کے خلاف گلیوں میں احتجاج میں شمولیت اختیار کر کے مطمئن ہیں۔ وہ لوگوں کے سامنے فتح کے گیت گاتے ہیں اور لوگوں کی پہلے سے زیادہ براہ راست شمولیت پر اکساتے ہیں (سوائے یونیورسٹیاں چلانے کے، جو آج بھی عہدِ وسطیٰ کی سلطنتوں کی طرح چلائی جاتی ہیں)۔ نتیجتاً ،ان دنوں فلسفے کا حقیقت سے تعلق بہت کم ہو گیا ہے۔

سیاستدان بھی، کم وبیش، جمہوری جواز کے مسئلے کو ہوا دیتے ہیں۔ پیچیدہ مسائل کو غیر منتخب اداروں کے حوالے کر کے خوش ہونے پر ،اور پھر انہی پر تنقید کر کے خود کو بڑا بناتے ہیں۔ پس فرانسیسی سیاستدان وہ تمام فائدے حاصل کرنے میں مسرور رہے ہیں جو کم بجٹ خسارے سے حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن جب انہیں یہ مقصد حاصل کرنے کیلئے اخراجات کم کرنے پڑتے ہیں، وہ ووٹروں کو یاد کرائیں گے کہ یہ یورپی یونین کی غلطی کا نتیجہ ہے۔ ''مجھے الزام نہ دو برسلز نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کیا'' یورپ کے حکمران طبقے میں معذرت کا معروف طریقہ بن گیا ہے۔ یہ سن کر حیران نہیں ہونا چاہئے کہ یورپی یونین کا جواز بحران کا شکار رہا ہے۔

یہ مسئلہ بڑھنے والا ہے۔ عالمی تجارتی تنظیم (WTO) ان طاقتور اداروں کے سلسلے کی

جدید ترین کڑی ہے جو وسیع اختیارات رکھتے ہیں،عوام کی رسائی سے باہر ہیں،اوراس نے تنقید کی ایک نئی لہر کو اپنی طرف کھینچا ہے۔ اگرچہ گلوبلائزیشن مخالف گروپ بہت سے اختلافات اور متضاد ایجنڈے رکھتے ہیں،تاہم سب اس پر متفق ہیں کہ ڈبلیوٹی او جیسے اداروں کو نامبارک سمجھتے ہیں۔ان کے کچھ تحفظات حقیقی ہیں—ڈبلیوٹی او کی کارروائیوں کو مزید کھلا ہونا چاہیے— لیکن حقیقت میں ڈبلیوٹی او اچھا کام کرتی ہے صرف اسلیے کیونکہ عوامی دباؤ سے محفوظ ہے۔جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے،''لوگوں'' پر کھلا ہونے کا مطلب ہے منظّم سیاسی مفادات کیلیے کھلا ہونا، جوعموماً چندلوگوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔اگر تجارتی مذاکرات مستقل جمہوری تبدیلیوں کی اجازت دیں تو سیاسی طور پر طاقتور گروہوں کے لیے معمہ بن کررہ جائیں گے۔مغربی دنیا میں زراعت،ان اہم شعبوں میں سے ایک ہے جہاں آزاد تجارت کے سمجھوتوں نے کوئی اثرنہیں ڈالا، یہ تباہ کن حد تک مہنگی اور غیر پیداواری رہی ہے کیونکہ امیر کسانوں کے چھوٹے گروہوں نے جمہوری نظام کو مفاد کیلیے استعمال کیا ہے۔تجارتی حکمت عملی میں زیادہ جمہوریت سے مراد زرعی سبسڈیز جیسی مزید پالیسیاں۔

موجودہ نظام—جو عالمی تجارتی تنظیم اور اسکے پیش روؤں،جنرل ایگریمنٹ آن ٹیرف اینڈ ٹریڈ—نے غیر معمولی نتائج دیئے ہیں۔تجارت کا پھیلاؤ گزشتہ 50 برس میں دنیا کی عظیم اقتصادی کامیابی رہی ہے،ساری دنیا میں موجود غربت اور بیماری میں ڈرامائی حد تک کمی لائی۔دنیا نے گزشتہ پانچ سوسال کے مقابلے میں پچھلے پچاس برس میں زیادہ اقتصادی ترقی کی ہے۔کیا ہم اس نظام کو تباہ کرنا چاہتے ہیں جس نے یہ سب ممکن بنایا اسے کیلیفورنیا کی مقننہ کی طرح بنا کر؟

ڈبلیوٹی او، یورپی یونین،فیڈرل ریزروسسٹم اور دوسرے اداروں کو تنزلی کیطرف لے جانے یا ان سے دور بھاگنے کے بجائے مغربی سیاستدانوں کو پس پردہ محرکات کو سمجھنا چاہیے۔انہیں ان اداروں کا انکے بدخواہوں سے بچانا چاہیے،کہ یہ میڈیسونئن طرز پر زیادہ جمہوری ہیں۔اسکے دیے ہوئے حل کے بارے میں کوئی کچھ بھی سوچے،جیمز میڈیسن اور ساتھی فیڈرلسٹ —1789ء!— میں یہ سمجھنے میں پیش پیش تھے کہ عوامی حکومت ایک مسئلے سے سب سے زیادہ آلودہ ہوگی؛مخصوص مفادات ۔ کیونکہ میڈیسن سمجھ گیا کہ'' مخصوص مفادات'' بالاخر آزادی اظہار کی ایک شکل ہیں، جانتا تھا، ان پر پابندی لگانے کا آسان

راستہ نہیں ہے۔ بالاخر میڈیسن نے اپنی امید امریکی حکومت کے ڈھانچے سے لگالی۔ اسکے خیال میں، امریکہ ایک ری پبلک تھا نہ کہ ایک خالص جمہوریت اور یہی اسکی سب بڑی قوت تھی۔ اسکا مطلب تھا کہ پبلک پالیسی براہ راست، جذبات میں آکر یا محدود مفادات کیلئے تیار نہیں ہوگی۔ ''جماعتِ نمائندگان'' سے لیکر شہریوں کے ایک گروہ تک جسے باقی ماندہ منتخب کریں گے، کے ذریعے ''رائے عامہ کو منتخب شہریوں، جن کی بصیرت انہیں ملک کے حقیقی مفادات کا علم دے سکتی ہے، اور جنکی حب الوطنی اور عدل کیلئے محبت میں یہ امکان انتہائی کم ہوگا کہ اسے وقتی یا محدود مفادات پر قربان کردیں، کی جماعت سے لیجاتے ہوئے بہتر بھی بنایا جاسکتا ہے اور وسیع بھی کیا جاسکتا ہے۔''

ممکن ہے اسکے الفاظ پرانے سنائی دیں، لیکن یہ ایک شاندار جدید خیال کی نمائندگی کرتے ہیں: نمائندگی۔ جیسے جیسے زندگی پیچیدہ ہوتی ہے ہم نمائندے بناتے چلے جاتے ہیں۔ بالاخر، نمائندگی ہی وہ طریقہ ہے جس سے جدید کاروبار چلتا ہے۔ شراکت دار کمپنیوں کی ملکیت رکھتے ہیں لیکن انکی دیکھ بھال اور انتظام ان لوگوں کے ہاتھ دے دیتے ہیں جو اپنا وقت اور توانائی کمپنی کیلئے وقف کرسکتے ہوں اور متعلقہ کام میں مہارت بھی رکھتے ہوں۔ کمپنیوں پر حتمی کنٹرول شراکت داروں کا ہی ہوتا ہے لیکن وہ تسلیم کرتے ہیں کہ خود کمپنیاں نہیں چلا سکتے۔ اسکا یہ مطلب نہیں کہ بعض افسران ملنے والے اختیارات کا غلط استعمال نہیں کریں گے، بلکہ شراکت دار انہیں سزا دیں گے اور وہ اکثر ایسا کرتے ہیں۔

نمائندگی کی جمہوریت، امریکہ کے متعدد بانیوں کے خیال میں، بہتر حکومت پیدا کریگی کیونکہ اسے وہ لوگ چلائیں گے جو پبلک معاملات میں دلچسپی اور تجربہ رکھتے ہیں اور ساتھ ہی عوام کو جوابدہ بھی ہیں۔ سب سے بڑھ کر، میڈیسن کی رائے میں، یہی وہ طریقہ تھا جس سے محدود مفادات اور قلیل المدت سوچ کو پچھاڑا جاسکتا ہے — ٹھیک وہی مسئلہ جو آج ہمیں درپیش ہے۔ لیکن جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں میں نمائندگی بڑھتی ہے، سیاست میں یہ رجحان بالکل الٹی سمت چلتا ہے۔ اگر آپ کاروباری دنیا میں یہ بحث کریں کہ ایک ناتجربہ کار بھی بڑا کاروبار چلا سکتا ہے کیونکہ کاروبار میں تجربہ کسی انسان کی صلاحیتوں کا پیمانہ نہیں ہے، تو آپ کو مذاق اڑایا جائیگا۔ یہی بات آپ حکومت کے بارے میں کہیں تو دانا شمار ہوں گے۔ ہم یہ فیصلہ کرچکے ہیں کہ گو ہم اپنے ٹیکس فارم پر نہیں کرسکتے، وصیت نہیں لکھ سکتے، یا

اپنے کمپیوٹر نہیں چلا سکتے، لیکن قانون پاس کر سکتے ہیں۔

تھوڑا بہت زیادہ ہے

آج ہمیں سیاست میں جو چاہیے وہ زیادہ نہیں کم جمہوریت ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ ہم بااختیار افراد یا آمروں کو گلے لگا لیں بلکہ ہمیں یہ پوچھنا چاہئے کہ ہمارے معاشرے میں کچھ ادارے ـــ جیسے فیڈرل ریزرو سسٹم اور سپریم کورٹ ـــ بہت اچھے انداز میں کام کرتے ہیں اور کچھ دوسرے ـــ جیسے مقنّنہ ـــ برے انداز میں کام کرتے ہیں۔ کیونکہ ایسا ہوتا ہے، ایلن بلنڈر (Alan Blinder)، پرنسٹن کا ایک پروفیسر، نے 1997ء میں فارن افیئرز (Foreign Affairs) میگزین کے اپنے مضمون میں اسی سوال پر غور کیا(1)۔ بلنڈر حکومت میں دو میعادیں پوری کر چکا تھا، پہلی وائٹ ہاؤس میں اقتصادی مشاورتی کونسل (Council of Economic Advisers) میں اور دوسری فیڈرل ریزرو میں، جہاں اس نے وائس چیئر مین کی حیثیت سے کام کیا۔ اس نے اپنے مضمون میں لکھا کہ وائٹ ہاؤس میں پالیسی سازی قلیل المیعاد سیاسی اور انتخابی معاملات سے مغلوب تھی، جبکہ فیڈرل ریزرو میں پالیسی سازی کے سروکار اسکے معاشرتی، اقتصادی اور آئینی اہلیت سے تھا۔ یہ فرق فیڈرل میں مستقل اعلیٰ معیار کی فیصلہ سازی کی وجہ قرار دیا جاتا تھا۔

بلنڈر نے کہا کہ فیڈرل ریزرو کی فیصلہ سازی تین نیک وجوہات کی بنا پر سیاست سے علیحدہ تھی۔ پہلی، شرح سود ایک تکنیکی معاملہ ہے جسے ناتجربہ کاروں کی نسبت ماہر بہتر طور پر حل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ دوسرا، مالیتی پالیسی تیار کرنے کیلئے طویل وقت درکار ہوتا ہے جس کیلئے صبر اور مستقل مزاجی کی ضرورت ہوتی ہے۔ آخر میں، افراط زر (بلند شرحِ بیروزگاری) فائدوں (اشیاء کی قیمتوں میں مستقل کمی، بچت شرح سود وغیرہ) سے پہلے آتی ہے۔ نتیجے میں، شرح سود کی اچھی حکمت عملی اس فضا میں نہیں بنائی جا سکتی جس پر قلیل المیعاد خیالات کا غلبہ ہو۔ لیکن بلنڈر نے اعتراف کیا کہ ''ایک ناگوار سوچ میرے سر میں رینگنے لگی:۔ فیڈرل کی خودمختاری کی دلیل کا اطلاق حکومت کے دوسرے حصوں پر بھی اسی قوت سے لاگو ہوتی ہے۔ بہت پالیسی فیصلے پیچیدہ تکنیکی شعور مانگتے ہیں اور ان کے اثرات مستقبل

بعید تک جاتے ہیں۔اس نے صحت عامہ، ماحولیاتی پالیسی اور ٹیکس پالیسی کوایسے ہی معاملات شمار کیا۔

امریکہ کے وفاقی انکم ٹیکس پرغور کریں۔اپنی پہلی تشکیل1914ء میں، یہ مکمل ٹیکس کوڈ14 صفحات پر مشتمل تھا اور انفرادی ٹیکس ادائیگی صرف ایک صفحے پر پورے آ جاتی تھی۔آج یہ ٹیکس کوڈ2000 صفحات پر مشتمل ہے، 6000 صفحات قواعد وضوابط کے ہیں اور ہزاروں فیصلوں اور تشریحات کیلئے ہیں۔انٹرنل ریوینیو سروسز (Internal Revenue Service) نے480 اور280 ٹیکس فارم انکی وضاحت کیلئے شائع کیے۔یہ غیر واضح ہے کہ ان رومی طرز کے ضوابط پر امریکیوں کی کتنی لاگت آتی ہے ؛ اندازے تو600 بلین ڈالرز فی سال تک جاتے ہیں، لیکن بیشتر دانشور100 بلین ڈالرز یا انکم ٹیکس ریونیو کا تقریباً ٪15(تقریباً375 ڈالرز سے 450 ڈالرز فی کس فی سال) تک بتاتے ہیں۔ڈیل جورگنسن (Dale Jorgenson)، ہارورڈ یونیورسٹی میں شعبہ معاشیات کے چیئر مین ، شمار کرتا ہے کہ فلیٹ ریٹ ٹیکس(flat-rate tax) سے سالانہ آمدن موجودہ انکم ٹیکس کے برابر بڑھ سکتی ہے جبکہ اقتصادی نمو200 بلین ڈالر فی سال تک بڑھ جاتی ہے۔

ٹیکس کوڈ ایک سادہ سی وجہ کی بنا پر وقت کھپانے والا، پیچیدہ اور مہنگا طریقہ بن گیا ہے: جمہوریائی سیاست۔یہ سیاستدانوں کوموقعہ دیتا ہے کہ وہ توجہ حاصل کیے بغیر اپنی پسند کے پروگراموں گروپوں اور کمپنیوں کو فنڈ دے سکیں۔ایک گرانٹ کا نوٹس میں لیا جائیگا ؛ ٹیکس قانون میں چھوٹی سی تبدیلی کا نہیں۔ممکن ہے ایک جیسی بیلنس شیٹ والی کارپوریشنیں بہت مختلف شرح کا ٹیکس دیں ،اسکا انحصار اس پر ہے کہ آیا انکے پاس ایسے لابسٹ ہیں جو کانگرس کو کوڈ پر انکے فائدے میں نظر ثانی پر مجبور کریں۔اکثر نیا قانون اتنے محدود صورت میں لکھا جاتا ہے جیسے کسی مخصوص کمپنی کو سبسڈی جاری کرنے کے لئے ہو۔اگرچہ ٹیکس میں ہر چھوٹ معمولی معلوم ہوتی ہے تاہم مجموعی لاگت حیران کن ہے، یہ2001ء میں وفاقی حکومت کے لیے گذشتہ ریوینیو میں مجموعی طور پر550 بلین رہی۔ان ''ٹیکس اخراجات'' میں سے کچھ ان پروگراموں کیلئے ہوتے ہیں جنہیں وسیع پیمانے پر عوامی حمایت حاصل ہو،لیکن دوسرے— صنعت کیلئے محدود ہدف والی ٹیکس چھوٹ— کو صرف کارپویٹ کا فائدہ ہی کہا جاسکتا ہے۔

تمام سیاسی آراء کے امریکی متفق ہیں کہ ٹیکس کوڈ بھدا، نا اہل اور غیر منصفانہ ہے۔ تاہم کسی کو بھی یقین نہیں کہ اس کی کبھی اصلاح ہو گی، کیونکہ یہ جمہوری سیاست میں پیوست ہے۔ بلنڈر نشاندہی کرتا ہے کہ تین وجوہات جن کی بنا پر فیڈرل ریزرو سسٹم خودمختار ہے، سختی کیساتھ ٹیکس پالیسی پر بھی لاگو ہوتی ہیں۔ وہ ایک آزاد وفاقی ٹیکس اتھارٹی کی تجویز دیتا ہے، جو کہ بہت حد تک فیڈرل ریزرو جیسی ہو۔ کانگریس اسے واضح ہدایات اور راہنمائی دے گی اور اسکی بنا پر یہ ٹیکس قانون سازی کریگی۔ پھر کانگریس اس پر ووٹ دیگی لیکن ترامیم کی اجازت نہ ہوگی۔ اگرچہ بمشکل ہی یہ کمزوریوں سے مبرا ہے، لیکن اس قسم کا نظام بلاشبہ بہتر ٹیکس کوڈ پیش کریگا جو فی الوقت ہمارے پاس ہے۔

امریکہ کی حکومت کچھ جگہوں پر پہلے ہی اس قسم کی نمائندگی کے تجربات کرتی ہے۔ عموماً صدر کو تجارتی سمجھوتوں پر مذاکرات کا اختیار دیا جاتا ہے جو ایک مکمل پیکج کی صورت میں کانگریس کو پیش کیے جاتے ہیں۔ کانگریس مجموعی طور پر ووٹ دیتی ہے لیکن ترامیم کی اجازت نہیں۔ کانگریس نے اسی قسم کا عمل 1990ء کی دہائی کے اوائل میں استعمال کیا، جب اسے درجنوں فوجی اڈوں کو بند کرنے کی ضرورت تھی جیسا کہ سرد جنگ کے بعد فوجیں واپس بلائی گئیں۔ بحران میں پھنس جانے پر، قانون سازوں کو احساس ہوا کہ شفاف نتائج تک پہنچنے کا واحد راستہ ہے کہ اس عمل کو سیاست سے دور رکھا جائے۔ ورنہ کانگریس کے تمام ارکان فوجی اڈے بند کرنے کے حامی تھے، سوائے وہ جو انکے ڈسٹرکٹ میں تھے۔ انہوں نے ایک غیر جانبدارانہ کمیشن کو یہ ذمہ داری دی کہ وہ بند کئے جانیوالے اڈوں کا تعین کرے۔ حتمی فہرست کانگریس کو واحد ووٹنگ کیلئے پیش کی گئی، ہاں یا ناں، اور تبدیلی کی اجازت نہ تھی۔ یہ تمام عمل اچھے چلے ہیں، مؤثر حکومت کیساتھ جمہوری کنٹرول کا امتزاج ہے۔

نمائندگی اس حکمت عملی کا جدید مترادف ہے جو ہومر کے آوارہ منش ہیرو، یولیسس (Ulysses)، نے سائرن (Sirens) کے قریب سے گزرتے استعمال کی، جس کے گیت آدمیوں کو سمندر میں کود مرنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ یولیسس نے اپنے جوانوں کے کان موم سے بھر دیئے تا کہ وہ سائرن کی پکار نہ سن سکیں۔ اور اپنے لئے، وہ اس موسیقی کو سننا چاہتا تھا، چنانچہ اس نے خود کو بحری جہاز کے مستول سے مضبوطی باندھ لیا اور ساتھیوں کو بتا دیا کہ چاہے وہ کچھ بھی کہے وہ اسے نہ کھولیں۔ جیسے ہی وہ مکار پانیوں سے

گزرے، یولیسس اس موسیقی کے نشے میں آ گیا اور رہائی کی بھیک مانگنے لگا۔ لیکن اسکا طریقہ کام کر گیا۔ اسکے ساتھیوں نے اس کے ابتدائی احکامات کو پکڑے رکھا اور اسے بندھا ہی رہنے دیا۔ نتیجے میں، کشتی اور اسکے ملاح اس آزمائش سے کامیاب نکل آئے۔ سیاستدانوں کو آج سیاست کے متلاطم پانیوں سے گزرتے ہوئے ریاست کے جہاز سے باندھ لینا چاہئے۔

اعلیٰ ترین خطرات

ترقی پذیر ممالک میں نمائندگی کی بہت ضرورت ہوتی ہے کیونکہ خطرات عموماً زیادہ ہوتے ہیں۔ حکومتوں کو اپنی پالیسیوں میں دل جمعی اور نظم و ضبط دکھانا چاہیے، بصورت دیگر منڈیوں کا اعتقاد بہت جلد ان سے اٹھ جاتا ہے۔ انہیں طویل المدت منصوبوں پر توجہ کرنی چاہیے اور اسکے شہری ترقی جیسے، تعلیم اور صحت عامہ، ورنہ انکے سماج آہستہ آہستہ جمود یا یہاں تک کہ انارکی کا شکار ہو جائیں گے۔ طویل المیعاد حکمت عملیاں انتہائی منافع بخش رہتی ہیں؛ قلیل المیعاد سرپرستانہ سیاست بہت مہنگی ہے۔

عام طور پر آمروں نے ان حکمت عملیوں پر جمہوریت پسندوں سے بہتر کام نہیں کیا ـــــ اس سے کوسوں دور ہیں۔ بیشتر آمروں نے اپنے ملک کو ذاتی مفاد کیلئے لوٹا ہے۔ دانشور یہ پوچھتے ہیں کہ آیا جمہوریت غریب ممالک کی اقتصادی ترقی کی مدد کرتی ہے یا نقصان پہنچاتی ہے، اور بہت سے جائزوں کے باوجود کسی نتیجہ خیز جواب پر نہیں پہنچے(2)۔ لیکن گذشتہ پچاس سالوں سے ترقی پذیر ممالک کی کامیابی کی ہر کہانی نے آزاد خیال آمریت میں ہی جنم لیا ہے۔ چاہے تائیوان ہو یا جنوبی کوریا، سنگاپور، چلی، انڈونیشیا اور یا چین، وہ حکومتیں جو طویل المیعاد حکمت عملیوں کیلئے زیرک فیصلے کرتی ہیں، انہیں بدلہ بھی مضبوط اقتصادی ترقی اور بڑھتی ہوئی شرح خواندگی، بہتر معیار زندگی اور خواندگی کی صورت میں ملتا ہے۔ تیسری دنیا کے کسی ملک کیلئے یہ سوچنا مشکل ہے جس نے مذکورہ بالا ممالک کی طرح شرح نمو حاصل کی ہو۔ جو اصلاح کے راستے پر چلے ہیں، بہت جلد سیاسی طور پر طاقتور گروہوں کے لیے سبسڈیز کی ضرورت کی وجہ سے مشکل صورتحال کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بھارت اصلاحات کے مسلسل پروگرام پر عمل کے قابل نہیں رہا ہے، اسکی بڑی وجہ ہے کہ اسکے سیاستدان اپنے آئین

پر کوئی مشقت مسلط نہیں کریں گے — چاہے عارضی۔ نتیجے میں، تمام تر جمہوری عظمت کے باوجود ملک انسانی ترقی کے تقریباً ہر معیار میں پیچھے ہی جاتا رہا: اوسط عمر، شیر خواروں کی شرح اموات، صحت، تعلیم، خواندگی وغیرہ۔ اب یہ اقوام متحدہ کے 2002ء میں کیے جانیوالے انسانی ترقی کے شمار میں 124 ویں (173 میں سے) نمبر پر ہے، یقینی طور پر، چین سے تو پیچھے ہے، گوئیٹمالہ، بولیویا اور شام سے بھی پیچھے ہے اور کیوبا سے کہیں پیچھے ہے۔ یقیناً یہی وقت ہے پوچھنے کا کہ آیا بھارت جیسی جمہوریتیں، جنکے مغربی دانشور گن گاتے ہیں، اپنے لوگوں کے لیے کام کر رہی ہیں۔

حل تیسری دنیا میں جمہوریت کو اٹھا کر رکھ دینا نہیں ہے۔ ترقی اور بڑھوتری پر اسکے اثرات سے قطع نظر جمہوریت کے بہت زیادہ فائدے ہیں۔ اس میں حقیقی اقتصادی خوبیاں ہیں۔ اگرچہ یہ بہترین نتائج حاصل نہیں کرتی تاہم بدترین سے بچا کر رکھتی ہے۔ آپ انتخابات سے لی کوآن یو (Lee Kuan Yew) تو شاید حاصل نہ کر سکیں مگر آپ موبیٹو سیسی سیکو (Mobutu Sese Seko) بھی نہیں لیں گے۔ تاہم جمہوریت کے بارے میں یہ دل بڑھاوا مسائل حل نہیں کریگا۔ ایک راہ ضرور ہونا چاہیے کہ جمہوری نظاموں کام کریں اسطرح کہ مسلسل مایوس کن نتائج کے ساتھ قلیل المیعاد حکمت عملیاں نہ پیدا کریں۔ غریب ملکوں میں بہت کچھ داؤ پر لگا ہے۔

نمائندگی کی کوئی شکل ایک حل ہوسکتی ہے۔ مرکزی بینکوں زیادہ مضبوط ہونے چاہئیں، ایک ایسا عمل جو پہلے ہی شروع ہو چکا ہے۔ ججوں کو بھی ایسی ہی آزادی ہونی چاہئے۔ عدلیہ کو مضبوط کرنے اور بدعنوانی سے لڑنے کیلئے وزارت انصاف اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کو بھی زیادہ آزادی دینی چاہئے۔ بہت سے امریکی ادارے، جیسے فیڈرل ریزرو سسٹم، سیکوریٹیز اینڈ ایکسچینج کمیشن (Securities and Exchange Commission) اور فیڈرل بیورو آف انویسٹی گیشن وغیرہ کے پاس رہنما لمبی مدت (7 سے 10 سال) کے لیے ہوتے ہیں اور معمول کے انتخابی چکر نہیں ٹکراتے۔ ایسا جان بوجھ کر کیا جاتا ہے تا کہ انہیں سیاست سے دور رکھا جائے۔

ایک اہم میدان جہاں تخلیقی تنظیم نو ممکن ہوسکتی ہے اقتصادیات کا ہے۔ اس میدان میں فیصلہ سازی روزمرہ سیاست سے علیحدہ ہونی چاہئے۔ تیسری دنیا کے ایک ملک میں مالیات

کے وزیر کے پاس یہ صلاحیت ہونی چاہیئے کہ وہ سالانہ بجٹ ایک پیکج کی صورت میں پیش کرے جو تبدیل نہیں کیا جاسکتا، صرف مجموعی طور ہی پر قبول یا رد ہوسکتا ہے۔ (برطانیہ، اپنے پارلیمانی نظام اور سخت جماعتی نظم وضبط کی وجہ سے، غیر رسمی طور پر ایسا کرتا ہے، نتیجے میں ایک مؤثر مالیاتی حکمت عملی نافذ کرنے کی اہلیت رکھنے کیلئے مشہور ہے۔) اس سے آگے بڑھا جاسکتا ہے اور وزیر معاشیات کو معمول سے لمبے عرصے کیلئے مقرر کرنے کی اجازت دی جائے — جیسا کہ فیڈرل ریزرو کے سربراہ — تا کہ جب کوئی سیاسی بحران کسی حکومت کے خاتمے کا باعث بنتا ہے تو یہ خود بخود معاشی اصلاحات کی تباہی کا باعث نہیں ہوتا۔ ان میں سے کوئی بھی اقدام سیاست کو مکمل طور پر باہر نہیں رکھے گا۔ نہ ہی ایسا کرنا چاہیئے۔ سیاست صحت مندانہ عمل ہے؛ اس کے ذریعے لوگ جمہوریت میں اپنی قوت کا اظہار کرتے ہیں۔ آپ کو کسی بھی حکمت عملی — اصلاح پسند یا دوسری — کیلئے حمایت درکار ہوتی ہے۔ اسکی بجائے، مقصد محض تیسری دنیا کے دباؤ والے حالات میں سیاست کے شدید دباؤ کو کم کرنا ہے تا کہ نظام بہتر کام کرے۔ یہ ہمیشہ بہتر کام نہیں کریگا۔ کچھ وزراء اور بیوروکریٹس دیئے جانیوالے اختیارات کا ناجائز استعمال کریں گے۔ دوسرے نیک نیت ہونگے مگر احمقانہ حکمت عملیاں اپنائیں گے۔ لیکن غالبًا یہ بیشتر ترقی پذیر جمہوریتوں میں مروج نظاموں ترقی اور جنہوں نے عوام کو بہت کم دیا ہے، سے بہتر کام کرے گا۔

اس پر زور دینا اہم ہے کہ یہ تبدیلیاں جمہوریت کے ساتھ موافق ہیں۔ یہ اتھارٹی کی اداروں میں نمائندگی کرتی ہیں، لیکن اصل قوت منتخب نمائندوں کے ذریعے عوام کے پاس ہی ہے۔ یہ چیک مضبوط ہونا چاہیئے۔ مقنّنہ میں دوتہائی اکثریت اس قابل ہونی چاہیئے کہ مذکورہ بالاحفاظتی اقدامات کو روند دے۔ پارلیمانی کمیٹیوں کو باقاعدگی سے تمام غیر منتخب اداروں پر نظر رکھنی چاہیئے۔ ایک طرح سے یہ نئی ترتیبیں اس انداز کی وسیع صورت ہیں جسطرح امریکہ میں ایک انتظامی محکمہ، مثلاً صحت کا، کام کرتا ہے۔ یہ کانگریس کے دیئے ہوئے واضح راہنما اصولوں کی بنیاد پر حکمت عملیاں بناتا اور نافذ کرتا ہے۔ مقنّنہ حرفِ آخر ہوتی ہے لیکن پالیسی کا بہت کچھ حصہ غیر منتخب بیوروکریٹس پر چھوڑ دیتی ہے۔ اگر یہ فلاحی پالیسی کیلئے کام کرتی ہے تو ٹیکسوں کیلئے کیوں نہیں؟ سب سے بڑھ کر یہ کہ سیاستدانوں کو عوام کیلئے ان نظاموں کا دفاع کرنا چاہیئے، یہ وضاحت کریں کہ نمائندگی اچھی حکومت اور جمہوری کنٹرول

میں معقول توازن ہے ۔عدالتوں اور مرکزی بینکوں کا احسان مندانہ اعتراف کرتے ہوئے لوگ واضح طور پر اس دلیل (کم ازکم مغرب میں) کو سمجھتے ہیں۔

نمائندگی محض ایسا عمل نہیں جو صرف سیاسی میدان میں وجود رکھتا ہے۔ بہت سے دوسرے میدانوں میں بھی ہمیں اس انتخاب کا سامنا ہے۔کیا ہم اقتصادی اور معاشی میدان میں اختیارات گھٹانے ،ثالثوں کو نظر انداز کرنے اور پرانے معیاروں کو توڑنے کے راستے پر جانا چاہتے ہیں یا اسکی بجائے ہم ان راہنما اور پرانے اصولوں ، جو کبھی روایتی طور پر ہمارے معاشرے کا حصہ رہے ہیں،کو اپنے پاس رکھنا اور ان کی تشکیل نو کرنا چاہتے ہیں؟ ٹیکنالوجی نظریہ کے ساتھ مل گئی ہے تا کہ نمائندگی کے بغیر دنیا کے سبز دکھائے۔آپ خود اپنے دلال، اخبار کے ایڈیٹر، وکیل اور ڈاکٹر بن سکتے ہیں۔لیکن کیا آپ ایسا کرنا چاہتے ہیں؟ اس معاملے پر رویے 1990ء کی دہائی کے عروج کے مقابلے میں کم بوکھلائے ہوئے یا سنجیدہ ہیں۔لوگ سمجھنے لگے ہیں غالباً کوئی وجہ ہے کہ بہت سے ثالث مختلف میدانوں میں مختلف سطحوں پر اپنا وجود قائم رکھے ہوئے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرمایہ کار سٹاک ٹریڈ کو کام میں لانے ،مالیاتی اور سرمایہ کاری سے متعلق مشاورت اور حتیٰ کہ پرانے طرز کی ہینڈ ہولڈنگ پر عمل درآمد کیلئے سرمایہ کار تھوڑی سی زیادہ رقم لگانے پر راضی ہو جائیں گے۔ جائز شکایات اور طبی مسائل میں مبتلا ہونے والوں نے ادراک کیا ہے کہ خود تشخیصی —انٹرنیٹ سائیٹس کے مطالعے اور چیٹ گروپس میں شامل ہو کر —ہی واحد مفید طریقہ ہے۔صحافت کی دنیا میں ذاتی ویب سائیٹ (بلاگ (blog)) نے روایتی میڈیا کا قاتل ہے۔ بلکہ یہ کچھ نئی چیز بن گئی ہے۔اخبار اور رسالوں کی جگہ لینا تو دور کی بات ہے، بہترین بلاگ —اور بہت چالاک ہی بہترین ہوتے ہیں—انکے مددگار بن گئے ہیں ۔وہ آگاہ عوام کے لئے ایک نئے ثالث ہیں۔اگرچہ بلاگ تخلیق کرنے والے خود کو ڈیموکریٹ کہتے ہیں،لیکن حقیقت میں ٹیوکویل طرز کی جدید اشرافیہ ہیں۔ویب کا زیادہ حصہ اسی انداز سے آگے بڑھا ہے کیونکہ یہ جس قدر بڑا اور پھیلا ہو گا،لوگوں کو اسی قدر اسکے استعمال میں مدد درکار ہو گی۔

آگے کی طرف اور نیچے کی طرف

ان تمام حوصلہ افزا علامات سے بھی ایک وسیع رجحان ہمیں سماج کی پریشان کن جمہوریانے کی طرف دھکیل رہا ہے۔سیاست دن بدن معاشرے میں سرایت کرتی جارہی

ہے، یورپی معاشرے امریکی بن گئے ہیں، پرانے ادارے بند ہو رہے ہیں، ٹیکنالوجی بیشتر واسطوں کو خطرے میں لانے میں لگی ہے۔اس سب کا نتیجہ بہت ہی اچھا ہے جیسے کہ ماضی میں ہوتا آیا ہے۔لیکن یہ ہمارے سماج کے تانے بانے کو بھی ادھیڑ دے گا۔ادارے جنہوں نے مغرب میں آزاد خیال سرمایہ داری اقدار کو محفوظ رکھا، صدیوں میں قائم ہوئے تھے۔ وہ عشروں میں تباہ ہو رہے ہیں۔ایک بار منتشر ہو گئے تو انہیں بحال کرنا آسان نہیں ہوگا۔ہم اس تباہی کو ہوتا دیکھ رہے ہیں لیکن اسے روکنے کے قابل نہیں — یہ غیر جمہوری ہوگا۔لیکن یہ ہماری سیاست، اقتصادیات اور ثقافت، جو دن بدن زیادہ قلیل المیعاد مفادات اور دلچسپیوں کے غلبے میں ہوں گے، پر اپنے نشان چھوڑے گی۔ایڈمنڈ برک (Edmund Burke) نے ایک دفعہ معاشرے کو مردوں، زندوں اور جو ابھی پیدا نہیں ہوئے، کے درمیان شراکت داری کہا۔ارتقا پذیر نظام میں یہ دیکھنا مشکل ہوگا کہ مستقبل میں ان لوگوں کیلئے کون بولے گا جو کہ ابھی پیدا نہیں ہوئے ہیں۔

اس دوران، تمام تبدیلیوں کے اثرات کیساتھ عوام کی بے اطمینانی بڑھتی رہے گی۔اگر یہ مسائل اٹھتے ہیں، تو آخر کار لوگ جمہوریت کی تعریف وہ کریں جیسی یہ ہے: نظریاتی حد تک تو یہ نظام کھلا اور قابلِ رسا ہے، کل حقیقت میں اس پر منظّم، امیر یا متعصب اقلیتوں کی حکمرانی ہے جو خود کو محفوظ رکھنے کیلئے دنیا کی مستقبل قربان کر رہے ہیں۔ یہ تصور براہ راست جمہوریت سے دلچسپی رکھنے والوں کے نظریے سے بہت مختلف ہے، جو کہتے ہیں کہ نئی دنیا جس میں ہم رہتے ہیں کی آزادی ہمیں قدیم یونان کی شہری ریاستوں کی طرف دھکیل دیگا۔ میں یہ قاری پر چھوڑتا ہوں کہ وہ فیصلہ کرے کہ آج کی کیلیفورنیائی سیاست اپنے عروج کی قدیم ایتھنی جمہوریت سے مشابہ ہے۔ کسی بھی واقعے میں، یہ یاد کرنے لائق ہے کہ قدیم یونان میں براہ راست جمہوریت صرف ان چھوٹے شہروں میں آزمائی گئی جہاں چند ہزار افراد کو ووٹ دینے کی اجازت تھی۔ یہ بھی یاد کرنے کے لائق ہے کہ سو برس میں ہی ان میں سے بیشتر جمہوریتیں آمریت میں ڈھل گئیں یا انتشار کا شکار ہو گئیں — اکثر صورتوں میں دو ہی باتیں ہوئیں۔

اس قسم کی باتیں بعید از قیاس معلوم ہوں گی، لیکن اگر موجودہ رجحان جاری رہا، بلاشبہ جمہوریت کو اپنے جواز کے بحران کا سامنا ہوگا جو تباہ کن ثابت ہوسکتا ہے۔ جواز سیاسی طاقت

کے لیے آبِ حیات ہے۔''طاقتور ترین کبھی اتنا طاقتور نہیں ہوتا کہ آقا بن سکے''،ژاں یاک روسو نے کہا تھا،''حتی کہ وہ طاقت کو حق اور فرمانبرداری کو فرض میں نہ بدل دے۔'' آج یہ اختیار صرف جمہوریت کے پاس ہے۔لیکن یہ ہماری وفاداریوں پر اپنی گرفت کھو سکتی ہے۔ با قابو اور غیر فعال جمہوریت کا بڑا ترین خطرہ یہی ہے کہ یہ بذاتِ خود جمہوریت کو ہی مشتبہ کر دے گی،تمام عوامی اندازِ حکومت کو دھندلا دیگی۔ایسا بے مثال نہیں ہوگا۔جمہوریت کی ہر لہر کے بعد کچھ پسپائیاں ہوتی ہیں جن میں نظام ناکافی دکھائی دیتا ہے اور پر جوش رہنما نئے متبادل پیش کرتے ہیں اور جنہیں مایوس لوگ خوش آمدید کہتے ہیں۔ایسا آخری دور یورپ میں جنگوں کے درمیانی عرصے میں تھا،جب جذبات انگیز خطیب چھائے ہوئے تھے،جن میں سے اکثر جمہوریت کیلئے عوام کی عدم فریبی پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔یہ بھی یاد کرنے کے قابل ہوگا کہ 1930ء کی دہائی میں اشتراکیت اور فاشزم کا معانقہ اس قدر غیر معقول نہیں لگتا آتا جس قدر آج لگتا ہے۔جبکہ جمہوریتیں دباؤ اور دلدل میں پھنسی تھیں،آمر ریاستوں نے اپنے سماجوں میں حرکت لا کر پیش قدمی شروع کر رکھی تھی۔

جدید جمہوریتوں کو مشکل اور نئے چیلنجوں کا سامنا ہوگا— دہشتگردی کا مقابلہ، عالمگیریت کیساتھ موافقت پیدا کرنا، بڑھتی عمر کے سماج کیساتھ ہم آہنگ ہونا وغیرہ—اور انہیں اپنا نظام موجودہ انداز سے کہیں بہتر بنانا ہوگا۔یعنی جمہوری فیصلہ سازی کو مؤثر بنایا جائے، آئینی آزادخیالی کو جمہوری عمل میں شامل کیا جائے ،ٹوٹے ہوئے سیاسی ادارے بحال کئے جائیں۔شاید مشکل ترین کہ،یہ ہمارے سماجوں میں بے پناہ اختیار رکھنے والوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھائیں، رہنمائی کریں، اور ایسے معیار قائم کریں جو کہ نہ صرف قانونی بلکہ اخلاقی بھی ہوں۔اس داخلی ٹھوس پن کے بغیر جمہوریت ایک کھوکھلا خول بن جائے گی، نہ صرف غیر موزوں ہوگی بلکہ ممکنہ خطرناک بھی ہوگی،شہری آزادی کو فرسودہ کر دے گی،آزادی کا ناجائز استعمال کریگی ،روزمرہ زندگی انحطاط کا شکار کردیگی۔

یہ ایک المیہ ہوگا کیونکہ جمہوریت ،اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود،ساری دنیا کے لیے''آخری بہترین امید'' ہے۔لیکن اس کو ہمارے وقتوں کیلئے محفوظ اور مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔80 برس پہلے، ووڈرو ولسن امریکہ کو 20 ویں صدی صدی میں اس چیلنج کے

ساتھ لے کر گیا کہ دنیا کو جمہوریت کیلئے محفوظ بنایا جائیگا۔ جیسا کہ ہم 21 ویں صدی میں داخل ہوئے ہیں، ہمارا کام جمہوریت کو دنیا کیلئے محفوظ بنانا ہے۔

....

نوٹس

نوٹس پر ایک نوٹ

تاریخ اس کتاب کا موضوع نہیں ہے۔ بحث میں اگر اس کا کوئی حصہ ہے تو وہ اس میں بیان خیالات اور دلائل کے حوالے سے ہے۔ پس ان اختتامیہ نوٹس کا مقصد کسی قابلِ زکر معلومات کی نشاندہی کرنا یا غیر روایتی اقتباس کا حوالہ دینا ہے۔ اسکے لئے میں نے جو اسلو استعمال کیا کہ عام قاری سوچتا ہے، ''یہ کہاں سے آیا'' ہے۔ میں نے اس سوال کا جواب مہیا کیا ہے۔اگر میں نے عمومی بحث کے لئے ثانوی ذرائع کا سہارا لیا ہے تو اس کا ذکر متن کے اندر ہی کر دیا ہے۔ تاہم اس کا حوالہ یہاں بھی دیا جا سکتا ہے۔

جو تاریخی توجیہات میں نے اپنائی وہی ہیں جسے عام طور پر واقعات کی ''روایتی توجیہہ'' یا کسی پیچیدہ تاریخی مظہر کی ابتدائی وضاحتیں کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، انگلش آزاد خیالی کی بالعموم اور پارلیمانی قوت کی بالخصوص پیش قدمی کے لئے میں نے وہی وضاحت اپنئی ہے جسے ''وِگ تشریح (*Whig Interpretation*)'' کہا جاتا ہے۔ ایسا اسلئے نہیں کہ ترمیم پسندوں کے اہم دعووں کا انکاری ہوں — بلکہ میں تو اس سلسلے میں ای جے ہابز بام (*E.J. Hobsbawm*) کا کام بے مثال تصور کرتا ہوں — میں سمجھتا ہوں یہ تاریخی بیانات پر نظر ثانی ہے نہ کہ ان کی نئی توجیہہ۔ روس پر ہارورڈ کے عظیم مورخ، رچرڈ پائپس (*Richard Pipes*) نے کہا، ''ترمیم پسندی کے ساتھ یہ مسئلہ ہے کہ یہ انحرافات اور انوکھے پن کو کسی مظہر کے پہلو کی حیثیت سے نہیں دیکھتے بلکہ اس کا عین شمار کرنے لگتے ہیں۔'' پس جے پی کینن (*J. P. Keynon*)، ایک ترمیم پسند مورخ، متفق ہے کہ گو کہ برطانوی تاریخ کی وِگ تشریح میں کچھ اسقام ہوں مگر کسی عمومی معقول وضاحت اسکی جگہ نہیں لے سکی۔ پائپس وضاحت کرتا ہے کہ ترمیم پسندوں کے دعوے کیریئر ازم کے باعث عموماً بڑھا چڑھا کر پیش کئے جاتے ہیں: ''مورخین کی ہر نسل اپنے نئے پن کا دعویٰ انوکھے پن اور بے ہودگی پر زور

دیتے ہوئے اپنے پیشروؤں کے کام مشکوک بنا کر کرتے ہیں۔ ٹھیک اسی وجہ سے کسی تاریخ موضوع پر حرفِ آخر ہی حرف اول بھی ہوتا ہے" (رچرڈ پاپئس Property and Freedom [Newyork: Alford Knoff, 122 n. 149])۔

پہلا باب

1۔ "قسطنطین کا عہد" (The Age of Constantine) مصنف جیکب بروخت (Jacob Burckhardt) ترجمہ موسیٰ حادث۔ مطبوعہ Berkeley: University of California Press, 1983) صفحہ 351۔

2۔ "بنجمن قسطنطین: سیاسی تحریریں" (Benjamin Constant: Political Writings) میں "قدما کی شہری آزادیاں بمقابلہ جدید کے" (*The Liberty of Ancients compared with that of Moderns*) مطبوعہ New York: Cambridge University Press, 1988 صفحہ vii۔ Biancamaria Fontana, ed.)۔

3۔ "روم کی باقیات" (*The Lagecy of Rome*) میں "تعارف" (Introduction)۔ مصنف ہربرٹ ایسکوئیتھ (Herbert, Asquith) مطبوعہ (Oxford, Clarendon Press, 1923) صفحہ vii۔

4۔ بحوالہ "افلاطون سے نیٹو تک: مغرب اور اسکے حریفوں کا تصور" (*From Plato to NATO: The Idea of the West and its Opponents*) مصنف، ڈیوڈ گریس (David Gress)۔ مطبوعہ (New York: Free Press, 1998) صفحہ 125۔ میں اس شاندار کتاب میں روم اور کاتھولک چرچ پر بحث کیلئے اسکا بطور خاص مشکور ہوں۔

5۔ "رومی سلطنت کا زوال اور انحطاط" (*The Decline and Fall of the Roman Empire*) مصنف ایڈورڈ گبن (Edward Gibbon)، جلد سوم، باب 27، حصہ 4۔ اس کہانی اور حوالے کیلئے ایک بار پھر ڈیوڈ گریس کا شکریہ۔

6۔ "یورپی معجزہ: ماحولیات، معاشیات اور جیو پولیٹیکس یورپ اور ایشیا کی تاریخ میں" (*The European Miracle: Environment, Economics and*

(*Geopolitics in the History of Europe and Asia*)، مطبوعہ (New York: Cambridge University Press, 1981)۔ یہ انتہائی شاندار کتاب ہے مگر جانز نے کلچر پر مجھ سے زیادہ توجہ دی ہے۔

7۔ ''یورپ کی آزاد خیالی کی تاریخ'' (*The History of European Liberalism*) مصنف گیڈو ڈی رگیرو (Guido de Ruggiero)، مطبوعہ (Oxford: Oxford University Press, 1927)۔ ایک شاندار کتاب جو کلاسیکل کا درجہ پانے کی حق دار ہے۔

8۔ ''اشرافی حکومت اور سماج، اٹھارویں صدی کے برطانیہ میں'' (*Aristocratic Government and Society in Eighteenth Century England*)، مولفہ ڈینئیل اے باؤ (Daniel A. Baugh)، مطبوعہ (New York: New Viewpoints, 1975)۔

9۔ ''وال سٹریٹ جرنل'' (*Wall Street Journal,* March 10, 1999) میں مضمون ''قوانین تشکیل دینا'' (Laying Down the Laws)، مصنف پال جانسن (Paul Johnson)۔

10۔ ''برطانیہ میں سیاسی استحکام کی نشوونما: 1725-1675'' (*The Growth of Political Stability in England, 1675-1725*)، مصنف جے ایچ پلمب (J. H. Plumb)، مطبوعہ (London: Macmillan, 1967)، صفحہ 30-29۔ مورخ جے ایچ پلمب کے الفاظ میں ''1688ء کا انقلاب ایک یادگار تھی جو اعلیٰ طبقہ نے آزادی کے اپنے تصور کے مطابق گھڑی تھی۔''

11۔ ''صبحِ صادق سے شام تک: 1500ء سے حال تک'' (*From Dawn to Decadence: 1500 to the Present*)، مصنف ژاک بارزن (Jacques Barzun)، مطبوعہ (New York: HarperCollins, 2000)، صفحات 289-287۔

12۔ ''مونٹیسکو'' (*Montesquieu*)، مصنف جوڈتھ شیکلر (Judith Shklar)، مطبوعہ (New York: Oxford University Press, 1987)، صفحہ 121۔

13۔ ''مغربی دنیا کا عروج: جدید معاشی تاریخ'' (*The Rise of the Western*

Douglas) مصنفین ڈگلس نارتھ، (*World: A New Economic History*
North) اور رابرٹ تھامس (Robert Thomas)، مطبوعہ (:Cambridge
Cambridge University Press, 1973)، صفحہ x۔

14۔ ''پراپرٹی اور آزادی'' (*Property and Freedom*)، مصنف مِلڈرڈ کیمبل (Richard Pipes)، مطبوعہ (New York: Knopf, 1999)، صفحہ 111۔

15۔ ''الزبتھ کے تحت ابتدائی انگریز زمیندار اور ابتدائی سٹورٹ'' (*The English Yeomen under Elizabeth and the Early Stuart*)، مصنف مِلڈرڈ کیمبل (Mildred Campbell)، مطبوعہ (,New York: A. M. Kelley 1968)۔ بیرنگٹن موور (Barrington Moore) کی ''آمریت اور جمہوریت کے سماجی ماخذ: جاگیردار اور کسان جدید دنیا کے ظہور میں'' (*Social Origions of Dictatorship and Democarcy: Lord and Peasant in the Making of the Modern World*)، مطبوعہ (Boston: Beacon Press, 1966) میں بھی اسکا حوالہ موجود ہے۔

16۔ موور (Moore) کی ''سماجی ماخذ ---'' (*Social Origins*)، صفحہ 418۔ اصل متن میں ''bourgeois'' لکھا ہے نہ کہ ''bourgeoisie''، لیکن اسکے لئے عموماً موخر الذکر تلفظ استعمال ہوتا ہے اور میں نے بھی یہی کیا ہے۔

17۔ ''پینگوئین تاریخِ عالم'' (*The Penguin History of the World*)، مصنف جے ایم رابرٹس (J. M. Roberts)، مطبوعہ (,New York: Penguin 1977)، صفحہ 553۔

18۔ ''صنعت اور سلطنت'' (*Industry and Empire*)، مصنف ای جے ہابز بام (E. J. Hobsbawm)، مطبوعہ (New York: Penguin, 1969)، صفحہ 26۔

19۔ ہابز بام (Hobsbawm)، ''صنعت'' (*Industry*)، صفحہ 48۔

20۔ ''امریکہ 1750ء پر: سماجی چہرہ'' (*America at 1750: A Social Portrait*)، مصنف رچرڈ ہوفسٹڑ (Richard Hofstadter)، مطبوعہ (:New York Knopf, 1971)، صفحہ 131۔

21۔ ''امریکی انقلاب کی بنیاد پرستی'' (The Radicalism of American *Revolution*)، مصنف گورڈن ووڈ (Gordon Wood)، مطبوعہ (New York: Random House, 1993)، صفحہ 348۔

22۔ ووننگ کی شرح کا حساب بی آر مچل (B. R. Mitchell) کی (Abstract of British Historical Statistics)، مطبوعہ (Cambridge: Cambridge University Press, 1962) کو استعمال کر کے کیا گیا ہے؛ برطانیہ کے تاریخی G.I.S یونیورسٹی آف ایسکیس (University of Essex) اور ای جے ایونز (E. J. Evans) کی ''جدید صنعتی ریاست کی ایجاد: ابتدائی صنعتی برطانیہ 1870-1783'' (The Forging of the Modern Industrial State: Early Industrial Britian, 1783-1870)، مطبوعہ (New York: Longman, 1983) پر دستیاب ہیں۔ ''جمہوریت کی سیاست: برطانوی ریفارم ایکٹ 1867ء'' (The Politics of Democarcy: The English Refrom Act of 1867)، مصنف گٹروڈ ہیملفرب (Gertrude Himmelfard)، مطبوعہ (Journal of British Studies 6, 1966)، بھی دیکھئے۔

23۔ ''پروٹسٹنٹ اخلاقیات اور سرمایہ داری کی روح'' (*The Protestant Ethics and the Spirit of Capitalism*)، مصنف میکس ویبر (Max Weber)، مطبوعہ (New York: Scribner's, 1958)۔

24۔ ''مشرقی ایشیا کی ترقی کے پس پردہ: معاشی معجزے کی سیاسی اور سماجی بنیادیں'' (*Behind the East Asia's Growth: The Political and Social Foundations of an Economic Miracle*)، مولفہ ہنری روون (Henry Rowen)، مطبوعہ (London: Routledge, 199)، صفحات 59-39 میں دیکھئے: ''تیز تر معاشی ترقی کیلئے سیاسی بنیادوں کی تشکیل'' (Constructing the Political Foundations for Rapid Economic Growth)، مصنف منشن پائی (Minixn Pie)۔

25۔ ''ترقی پذیر ممالک میں مسابقتی انتخابات'' (*Competitive Elections in*

Developing Countries) مولفہ مائرن وینر (Myron Weiner) اور ارگن اوزبدن (Ergun Ozbudun)، مطبوعہ (Durham, N.C.: Duke University Press, 1987)، صفحہ 20 میں ''عملیت پسند جمہوری نظریہ'' (Empirical Democratic Theory)، مصنف مائرن وینر (Myron Weiner)۔

دوسرا باب

1۔ یہ بیان اور اسکے بعد آنے والی لیوگر (Leuger) کی بحث کارل شراسکی (Carl Schorske) کی شاندار کتاب ''Fin-de-Siecle: سیاست اور کلچر'' (*Fin-de-Siecle: Politics and Culture*)، مطبوعہ (New York: Vintage, 198) لئے گئے ہیں۔

2۔ 1933ء کے انتخابات قومی ہسٹریا کی حالت میں ہوئے تھے، جسے نازی پارٹی نے پوری طرح استعمال کیا اور اسے جنم دیا۔ پھر بھی ان کے لئے موجود عوامی حمایت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ انتخابات کے اعداد وشمار درج ذیل ہیں:

پارٹی	1930	1932 (جولائی)	1932 (اگست)	1933
نیشنل سوشلسٹ	107	230	196	288
سوشل ڈیموکریٹ	`43	133	121	120
کمیونسٹ	77	89	100	81
سینٹر (کاتھولک)	68	97	70	73

3۔ ''ووٹنگ سے تشدد تک: جمہوریانہ اور قوم پرست اختلاف'' (*From Voting to Violence: Democratization and Nationalist Conflict*)، مصنف جیک سنائیڈر (Jack Snyder)، مطبوعہ (New York: Norton, 2000)، صفحہ 118۔ ویمار ری پبلک پر شیری برمین (Sheri Berman) کا مضمون دیکھئے: ''عالمی سیاست'' (*World Politics 49, no. 3, April 1997*) میں ''سول سوسائٹی اور ویمار ری پبلک کا زوال

''(Civil Society and the Collapse of Wiemar Republic)۔

4۔ فرانس پر دیکھئے: ''ری پبلکن لمحہ: 19ویں صدی کے فرانس میں جمہوریت کیلئے جدوجہد'' (*The Republican Moment: Struggle for Democracy in Nineteenth Century France*)، مصنف فلپ نورڈ (Phillip Nord)، مطبوعہ (Cambridge, Mass.: Harvard University Press, 199)۔ برطانیہ پر دیکھئے: ''آزاد خیال برطانیہ کی پراسرار موت'' (*Strange Death of Liberal England*)، مصنف جارج ڈینجر فیلڈ (George Dangerfield)، مطبوعہ (New York: Capricorn Books, 1961) سے چندلوگ ہی آگے بڑھے ہیں۔ ''سلطنت کا دور'' (*The Age of Empire*)، مصنف، ایرک ہابز بام (Eric Hobsbawm)، مطبوعہ (New York: Vintage, 1989)۔

5۔ ''عالمی سیاست'' (*World Politics 53,no.3 April 2003*) میں دیکھئے: ''جدیدیت تاریخی تناظر میں: سامراجی جرمنی'' (Modernization in Historical Perspective: The case of Imperial Germany)۔ ایک متاثر کن مضمون ہے۔

6۔ ''جرمنی میں سماج اور جمہوریت'' (*Society and Democracy in Germany*)، مصنف رالف ڈینڈرف (Ralf Dahrendorf)، مطبوعہ (New York: Doulbeday, 1969)۔ جرمنی کی سیاسی پیش قدمی وسیع اور پیچیدہ موضوع ہے لیکن ڈینڈرف کا جواب — جو میرا بھی ہے — اس کا بہترین اور سادہ ترین ہے۔ جرمن پیش قدمی کے مزید پیچیدہ اور تفصیلی تجزیہ کے لئے دیکھئے: ''جرمن تاریخ کی جزئیات'' (*The Peculiarities of Germany History*)، مصنفین ڈیوڈ بلیک برن (David Blackbourn) اور جیف ایلے (Geoff Eley)، مطبوعہ (New York: Oxford University Press, 1984)۔

7۔ ''بورژوا اور جوابی انقلاب'' (The Bourgeosie and the Counter-Revolution)، مصنف کارل مارکس (Carl Marx)، مطبوعہ (*Neue Rheinische Zeitung, December 1848*) دوبارہ شائع ہوا (Marx and Engles Collected Works, volume 8, 154-79)۔ اس ایڈریس پر بھی دستیاب

ہے(www.marx.org/archive/marx/works/cw/vol/ume08/)۔

8۔ ''جزئیات''(*Peculiarities*)، مصنفین بلیک برن (Blackbourne) اور ایلے(Eley)۔

9۔ ''کیمبرج یورپ کی معاشی تاریخ''(*Cambridge Economic History of Europe Vol. 5*)، ڈائریکٹرز ای ای رچ(E. E. Rich) اور سی ایچ ولسن (C. H. Wilson)، ''ابتدائی جدید یورپ کی معاشی تنظیم''(*The Economic Organization of Early Modern Europe*)، مطبوعہ(Cambridge: Cambridge University of Press, 1977)، صفحہ 583۔

10۔ ''مطلق العنان جمہوریت کے ماخذ''(*The Origions of Totalitarian Democracy*)، مصنف جیکب ایل ٹیل من(Jacob L. Talmon)، مطبوعہ(London: Secker and Warburg, 1955)۔

11۔ ''پیپرز آف ووڈرو ولسن(*Papers of Woodrow Wilson*, Vol. 5)، مولفہ آرتھر ایس لنک(Arthur S. Link)، مطبوعہ(Princetion: Princeton University Pres, 1968)، صفحات 67-365 میں دیکھئے: ''انتظامیہ کا مطالعہ''(The Study of Administration)، مصنف وڈرولسن(Woodrow Wilson)۔

12۔ ''ڈائڈیلس''(*Daedalus* 123, no. 2 (Spring 1994)) میں دیکھئے: ''دوسرا ویلوٹ انقلاب: کانٹیننٹل آزاد خیالی اور اسکی شورش پسندی''(The Other Velvet Revolution: Continental Liberalism and Its Discontent)، مصنف مارک لیلا(Mark Lilla)۔

13۔ ''امریکن پالیٹیکل سائنس ریویو''(*American Political Science Review* 53 (March 1959)) میں دیکھئے: ''جمہوریت کی چند سماجی شرائط: معاشی ترقی اور سیاسی جواز''(Some Social Reqisites of Democracy: Economic Development and Political Legitimacy)، مصنف سیمور مارٹن لپسٹ (Seymour Martin Lipset)۔

14۔ ''عالمی سیاست''((*World Politics*, 49, no. 2 (January 1997))

میں دیکھئے: ''جدیدیت : تصورات اور حقائق'' (Modernization: Theories and Facts)، مصنفین ایڈم پرزوسکی (Adam Przeworski) اور فیرنینڈو لیمونگی (Fernando Limongi)۔ میں نے افراطِ زر کیلئے اعداد بمشکل ہی امریکی ڈالر میں 2000 کے purchasing power parity (PPP) کے مطابق لائی۔ پی پی پی اب عام طور پر مستعمل طریقہ ہے جو کرنسی کی قدر کو داخلی طور پر قوت خرید کے حوالے سے ماپتا ہے نہ کہ شرح تبادلہ کے حوالے سے، اسلئے معیار زندگی میں فرق کو زیادہ بہتر انداز منعکس کرتا ہے۔ پرزوسکی اور لیمونگی کا اسل ڈیٹا 1985ء امریکی ڈالر میں تھا۔

15۔ ''عالمی معیشت: ہزار سالہ تناظر'' (The World Economy: A Millennial Perspective)، مصنف اینگس میڈیسن (Angus Maddison) مطبوعہ (Organization for Economic Co-operation and Development, 2001)۔ میں نے میڈیسن کے اعداد و شمار کو کم و بیش 2000ء میں امریکی ڈالر کے مطابق لایا ہے۔

16۔ ''نیوری پبلک'' (*New Republic*, March 9, 1998) میں دیکھئے: ''کوریا کیا سکھاتا ہے'' (What Korea Teaches)، مصنف رابرٹ کاگاں (Robert Kagan)۔

17۔ ''مشرقی ایشیا کی نشوونما کے پس پردہ حقائق: معاشی معجزے کی سیاسی اور سماجی بنیادیں'' (*Behind East Asia's Growth: The Political and Social Foundation of an Economic Miracle*)، مولفہ ہنری روون (Henry Rowen)، مطبوعہ (Cambridge, Mass.: Harvard University Press, 1997) صفحات 59-39 میں دیکھئے: ''تیز تر سیاسی نشوونما کیلئے سیاسی بنیادوں کی تشکیل'' (Constructing the Political Foundations for Rapid Economic Growth)، مصنف منشن پائی (Minxin Pei)۔

18۔ ''جمہوری لمحہ: انیسویں صدی کے فرانس میں جمہوری جدوجہد'' (*The Republican Moment: Struggle for Democarcy in Nineteenth Century France*)، مصنف فلپ نورڈ (Philip Nord) مطبوعہ (Cambridge,

(Mass.: Harvard University Press, 1995)، صفحہ 8۔

19۔ ''قومی وسائل کی فراوانی اور معاشی نمو'' (Natural Resource Abundance and Economic Growth)، مصنف جیفری ڈی ساچے (Jeffery D. Sachs) اور اینڈریو ڈی وارنر (Andrew D. Warner)، مطبوعہ (Natural Bureau of Economic Reaserch) ورکنگ پیپر نمبر W5398۔

20۔ بحوالہ ''مشرق وسطیٰ کا موزیک'' (A Middle Eastern Mosaic)، مصنف برنارڈ لوئس (Bernard Lewis)، مطبوعہ (New York: Random House, 2000)، صفحہ 225۔

21۔ زرعی اصلاحات ایک وسیع موضوع ہے مگر ایک مدلل اور ٹھوس تعارف کے لئے دیکھئے : ''امریکہ کا مشن: امریکہ اور بیسویں صدی میں جمہوریت کیلئے عالمگیر جد و جہد'' (*America's Mission: The United States and the Worldwide Struggle for Democarcy in the Twentieth Century*)، مصنف ٹونی سمتھ (Tony Smith)، مطبوعہ (Princeton: Princeton University Press, 1995)۔ سمتھ کی یہ بات دل کو لگتی ہے کہ وہ ممالک جہاں امریکہ جمہوریت پھیلانے میں کامیاب رہا، زرعی اصلاحات کے باعث تھا۔ دیکھئے: ''سرمایہ کا معمہ'' (*The Mystery of Capital*)، مصنف ہرنینڈو ڈی سوٹو (Hernando de Soto)، مطبوعہ (New York: Basic Books, 2000)۔

تیسرا باب

1۔ ''نیوز ویک انٹرنیشنل'' (*Newsweek International*) میں دیکھئے مضمون: ''پارٹی لائن سے جڑے رہنا'' (Sticking to the Party Line)، مضمون نگار کیرل (Caryl)، مطبوعہ 16 اپریل 2001؛ ''آل پوٹن آل دی ٹائم'' (All Putin All the Time)، 16 اپریل 2001ء؛ اور ''کامریڈ پوٹن کا روس'' (Comrade Putin's New Russia) 7 مئی 2001ء۔

2۔ مصنف کے ساتھ گفتگو۔

3۔ بحوالہ ''مشکل گیند کو کھیلنا'' (Playing Hardball)، مضمون نگار جوزف

کانٹیرر(Joseph Contreras)، مطبوعہ (Newsweek International)، 27دسمبر1999ء۔

4۔ دیکھئے: ''نیویارک ٹائمز''(New York Times)، 27دسمبر، 1999ء، مضمون ''افریقہ جمہوریت کے راستے پر رینگتے ہوئے''(Africa Creeps along Path to Democracy)، مضمون نگار راخل ایل سوارنز(Rachel L. Swarns) نورمتسو اونیشی(Norimitsu Onishi) کے ہمراہ۔

5۔ ''جرنل آف ڈیموکریسی''(Journal of Democracy 6, no. 1(1995)) میں دیکھئے: ''افریقہ کی انتہاؤں کے درمیان''(Between Afarica's Extremes)، مصنف میکائیل چیگی(Michael Chege)۔''افریقہ میں جمہوریت کو پھیلانا''(Developing Democarcy in Afarica)، مصنف لیری ڈائمنڈ(Larry Diamond)، مطبوعہ (Stanfrod University) بھی دیکھئے؛ (Universitystanford.edu/Seminar/DiamondAfrica.htm) پر بھی دستیاب ہے۔

6۔ دیکھئے : ''فنانشل ٹائمز(Financial Times)،''ازرینی کی آہنی حکومت کو چیلنج''(Challange to Azeri's Iron Rule) مطبوعہ 7فروری 1998۔

7۔ ''دی اکنامسٹ''(The Economist) میں دیکھئے: ''جدید جیو پالیٹکس کا جائزہ''(A Survey of the New Geopolitics)، 31جولائی1999۔

8۔ دوبارہ اشاعت،''ایشین ایج''(Asian Age)، 3جنوری1998ء، 12۔

9۔ ''امریکہ تاریخ کے نئے نقطہ ہائے نظر''(New Viewpoints on American History)، مصنف آرتھر شیلزینگر(Arthur Schlesinger)، مطبوعہ (New York: Macmillan, 1922)، صفحہ 22-23۔

10۔ ''آؤٹ لک''(Outlook)، 17نومبر 1997ء، 23-22۔

11۔ ''کثرتی سماجوں میں سیاست: جمہوری عدم استحکام کا نظریہ''(Politics in Plural Societies: A Theory of Democractic Instability)، مصنفین ایلون رابوشکا(Alvin Rabushka) اور کینتھ شیپل(Kenneth Shepsle)،

مطبوعہ(Columbus, Ohio: Charles E. Merill, 1972)،صفحات 92-62۔

12۔ ''قوم پرستی، نسلی تصادم اور جمہوریت''(*Nationalism, Ethnic Conflict and Democracy*)مولفہ لیری ڈائمنڈ(Larry Diamond) اور مارک ایف پلیٹنر(Mark F. Plattner)، مطبوعہ(Balitmore: John Hopkins University Press, 1994)میں دیکھئے: ''منقسم معاشروں میں سیاست''(Democracy in Divided Societies)، مصنف ڈونلڈ ہوروونز.

13۔ ''انٹرنیشنل سیکورٹی''(*International Security 20, no. 1(1995)*)میں دیکھئے:''جمہوریانہ اور جنگ کا خطرہ''(Democratization and the Danger of War)، مصنفین جیک سانیڈر(Jack Synder) اور ایڈورڈ مینز فیلڈ(Jack Mansfield) کی مشترکہ کاوش۔

چوتھا باب

1۔ ''جمہوریت اور عرب کا سیاسی کلچر''(*Democarcy and Arab Political Culture*)، مصنف ایلے قیدوری(Elie Kedurie)، مطبوعہ(Washington, D.C.: Washington Institution for Near Studies, 1992)،صفحہ 5۔

2۔ ''کیا غلط ہوا: مغربی اثرات اور مشرقِ وسطیٰ کا ردِعمل''(*What Went Wrong: Western Impact and Middle Eastern Response*)، مصنف برنارڈ لوئیس(Bernard Lewis)، مطبوعہ(Oxford: Oxford University Press, 2002)،صفحہ 97۔

3۔ صحیح مسلم، کتاب نمبر 20، حدیث 4533(Sahih Muslim, book 20, hadith 4533)۔

4۔ بحوالہ ''مشرقِ وسطیٰ کا موزیک''(A Middle East Mosaic)، مصنف برنارڈ لوئیس(Bernard Lewis)، مطبوعہ(New York: Random House, 2000)،صفحہ 246۔

5۔ ''حکمت کے سات ستون''(*Seven Pillars of Wisdom*)، مصنف ٹی ای لارنس(T. E. Lawarnce)۔

6۔ بحوالہ ''مشرقیت'' (*Orientalism*)، مصنف ایڈورڈ سعید (Edward Said)، مطبوعہ (New York: Random House, 1978)، صفحہ 38۔

7۔ دیکھئے: (PS: Political Science and Politics 27, no. 3)، مطبوعہ (September 1994)، صفحہ 511 میں ''عرب جمہوریانہ: ایک خراب رشتہ؟'' (Arab Democratization: A Poor Cousin?)، مصنف بہاگت کورانی (Bahgat Korany)۔

8۔ ''عالم عرب: سماج، کلچر اور ریاست'' (*The Arab World: Society, Culture and State*)، مصنف حلیم برکات (Halim Baraka)، مطبوعہ (Berkeley: University of California Press, 1993)، صفحہ 23۔

9۔ ''قاہرہ کی دستاویزات'' (*The Cairo Documents*)، مصنف محمد حسین ہیکل (Mohammad Heikal)، مطبوعہ (Garden City, N.Y.: Doubleday, 1973)۔

10۔ دیکھئے: ''فارن افیئرز'' (*Foriegn Affairs 74, no. 5*)، مطبوعہ (September 1995) میں ''مصر کے دکھ'' (The Sorrows of Egypt)، مصنف فواد عجمی (Fouad Ajami)۔

11۔ ''ورلڈ ڈویلپمنٹ انڈیکیٹر'' (*World Development Indicator*)، 2002، عالمی بنک (World Bank)۔

12۔ جان واٹر بری (John Waterbury) نے دکھایا ہے کہ کم محصول شدہ کے برعکس مشرقِ وسطیٰ ''تیسری دنیا میں سب زیادہ محصول لینے والا خطہ ہے''۔ 1975 سے 1985 کے دوران کے عالمی بنک کی طرف سے جاری کردہ اعداد و شمار کی مدد سے، واٹر بری نے واضح کیا کہ ''مشرق وسطیٰ کی ریاستوں میں ٹیکس کل قومی آمدنی کا 25 فیصد ہیں جبکہ لاطینی امریکہ میں یہ شرح 12 فیصد ہے۔ یہ شرح مشرق وسطیٰ کی بیشتر ریاستوں میں پیٹرولیم کارپوریشنز کا غالب اثر و رسوخ ظاہر کرتی ہیں، جن پر آسانی اور بہت زیادہ ٹیکس عائد کیا جاسکتا ہے۔ اوسطاً مشرقِ وسطیٰ کے کل ریونیو کا 19 فیصد کارپوریٹ سیکٹر سے آتا ہے، جبکہ یہی عدد افریقہ میں 20 فیصد، ایشیا میں 19 فیصد اور لاطینی امریکہ میں 10 فیصد ہے۔'' لیکن

واٹر بری نے مشرق وسطیٰ کی ریاستوں کو آسان دولت کے مقدار اور قسم کے لحاظ سے تقسیم نہ کر کے غلطی کی ہے۔ اگر اس نے کیا ہوتا تو معلوم ہو جاتا کہ تیل پیدا کرنے والے ممالک ـــ سعودی عرب اور کویت ـــ انتہائی کم یا بالکل ٹیکس نہیں لگاتے، جبکہ بڑے اور تیل سے محروم ممالک جیسا کہ مصر اور شام معقول مقدار میں بلاواسطہ اور بالواسطہ ٹیکس عائد کرتے ہیں۔ اگر آسان دولت جو تیل پیدا کرنے والے ممالک وصول کرتے ہیں، کی مقدار خاصی ہے مگر یہ باقی رہنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ ایسی ریاستوں میں اس آمدنی کا بڑا حصہ سیدھا فوج کے پاس چلا جاتا ہے۔ پس مشرق وسطیٰ میں جمہوریت کے مطالبے کی عدم موجودگی دو علیحدہ علیحدہ وجوہات کے باعث ہے: حقیقی امیر ریاستوں میں رشوت کی فروانی، غریبوں میں عوامی استحصال۔ لیکن دونوں اس آمدنی کی مہربانی ہے جو سیدھی حکومت کی جیب میں جاتی ہے اور حقیقی اقتصادی سرگرمیوں کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

13۔ پاکستان سے تعلق رکھنے والے عالم ابو الاعلیٰ مودودی نے کہا کہ نوآبادیاتی حکومتوں کو اسی نظر سے دیکھا جا سکتا ہے جس سے اسلام سے پہلے کے قبائل کو دیکھا جاتا ہے۔ جیسے ان سے رسول اللہ نے جنگ اور مقابلہ کیا، اسی طرح مسلمانوں کو ان نوآبادیاتی استحصال کرنیوالوں کے خلاف جہاد شروع کرنا چاہیے۔ قطب نے مودودی کا یہ استدلال قبول کیا اور اسے غیر مذہبی مسلمان حکومتوں پر بھی لاگو کر دیا۔ دیکھئے: ''سنگِ میل'' (*Milestones*)، مصنف سید قطب (Sayyid Qutb)، مطبوعہ (Indianapolis: American Trust Publications, 1990)۔ قطب کے بہترین تعارف کے لئے دیکھئے: ''مسلم انتہا پسندی مصر میں: نبی اور فرعون'' (*Muslim Extremism in Egypt: The Prophet and Pharao*)، مصنف گائیلز کیپل (Gilles Kepel)، مطبوعہ (Berkeley: University of California Press, 1985)۔

14۔ عہدِ وسطیٰ کے علما کی قوت کے لئے دیکھئے: ''اسلام: کنارے کا منظر'' (*Islam: The View from the Edge*)، مصنف رچرڈ ڈبلیو بیلوے (Richard W. Bulliet)، مطبوعہ (New York: Columbia University Press, 1994)۔

15۔ دیکھئے: ''جرنل آف ڈیموکریسی 7، نمبر 2 (1996) 62'' (*Journal of Democracy 7, no. 2 (1996) 62*) میں ''اسلام اور آزاد خیال جمہوریت: تاریخی

پس منظر''(Islam and Liberal Democracy: A Historical Perspective)، مصنف برنارڈ لوئیس(Bernard Lewis)۔

پانچوں باب

1۔ Bureau of Economic Analysis.

2۔ گیلپ پول کے اعداد وشمار www.gallup.com پر دستیاب ہیں؛ ہیرس پول نمبر 4 بتاریخ 17 جنوری 2001، www.pollingreport.com پر دستیاب ہے۔

3۔ 1964 اور 2000 کے درمیان، ووٹ دینے کے قابل آبادی میں سے رجسٹرڈ ووٹروں کی تعداد 65 فیصد سے بڑھ کر 76 فیصد ہو گئی۔ اسی عرصے میں ووٹ دینے کے قابل آبادی کی شرح جو ووٹ ڈالتی ہے 63 فیصد سے کم ہو 51 فیصد رہ گئی۔ رجسٹرڈ ووٹروں کی تعداد جو ووٹ ڈالتے ہیں کی شرح 67.5 سے بڑھ کر 95.8 کی حیران کن شرح تک پہنچ گئی۔

4۔ ''تنہا باؤلنگ: امریکی سماج کا زوال اور نشاۃ ثانیہ''(*Bowling Alone: The Collapse and Revival of American Society*)، مصنف رابرٹ ڈی پٹنم(Robert D. Putnam)، مطبوعہ(New York: Simon and Schuster, 2000)، صفحہ 46۔

5۔ ''لوگ حکومت پر اعتماد کیوں نہیں کرتے''(*Why People Don't Trust Government*)، مصنفین جوزف ایس نائی(Joseph S. Nye)، فلپ ڈی ذیلکو(Philip D. Zelikov) اور ڈیوڈ سی کنگ(David C. King)، مطبوعہ(Cambridge, Mass.: Harvard University Press, 1997)۔

6۔ دیکھئے: ''ایڈمنڈ برک کی منتخب تحریریں، جلد چہارم''(*Select Works of Edmund Burke, vol. 4*)، مولف ای جی پیئن (E. J. Payne)، مطبوعہ(Indianapolis, Ind.: Liberty Fund, 1999) میں ''برسٹل کے ووٹروں سے خطاب''(Speech to the Electors of Bristol)، ایڈمنڈ برک۔

7۔ ''نیویارک ٹائمز''(*New York Times*)، شمارہ 3 جنوری 1999 میں ''دھوپ نے کیسے کانگرس کو متاثر کیا''(How th Sunshine Harmed Congress)، مصنف ڈیل بمپر(Dale Bumper)۔

8۔ ''واشنگٹن پوسٹ'' (*Washington Post*) شمارہ 15 اپریل 2002 میں دیکھئے: ''2003 کا بجٹ اخراجات میں بڑا اضافہ مکمل کرتا ہے'' (*2003 Budget Completes Big Jump in Speding*)، مصنف گلین کیسلر (Glenn Kessler)۔

9۔ بحوالہ *Demosclerosis* مصنف جوناتھن راؤچ (Johnthan Rauch)، مطبوعہ (New York: Random House, 1994)، صفحہ 135۔ اس کتاب کے نئے ایڈیشن کا نام ہے: ''حکومت کا اختتام: واشنگٹن نے کام کرنا کیوں چھوڑ دیا'' (*Government's End: Why Washington Stopped Working*)، مطبوعہ (New York: Public Affairs, 1999)۔

10۔ ''پارٹی ختم ہے: امریکہ میں سیاست کی ناکامی'' (*The Party's Over: The Failure of Politics in America*)، مصنف ڈیوڈ بروڈر (David Broder)، مطبوعہ (New York: Harper and Row, 1972)۔

11۔ ''نیویارک ٹائمز'' (*New York Times*)، شمارہ 31 جولائی 2000 میں دیکھیے (Poll of Delegates Shows Convetion Solidly on Right)، مصنف ایڈم نیگورنی (Adam Nagourney) اور جینٹ ایلڈر (Janet Elder)؛ ''نیویارک ٹائمز'' (*New York Times*)، شمارہ 18 اگست 2000 میں دیکھئے: (Poll Finds Delegates to the Left of Both Party and Public)، مصنف ایڈم کلیمر (Adam Clymer) اور مارجوری کونلے (Marjorie Connelly)۔

12۔ ''اٹلانٹک منتھلی'' (*Atlantic Monthly*)، شمارہ نومبر 1995 میں دیکھئے: ''ایلیٹ پرائمری'' (The Elite Primary)، مصنف ڈیوڈ فرم (David Frum)۔

13۔ ''اٹلانٹک منتھلی'' (*Atlantic Monthly*)، شمارہ جنوری 1997 میں دیکھئے: ''مقدس مقابلہ'' (Running Sacred)، مصنف انتھونی کنگ (Anthony King)؛ ''مقدس مقابلہ: کیوں امریکی سیاستدان مہم بہت زیادہ چلاتے ہیں اور حکومت کم کرتے ہیں'' (*Running Sacred: Why American Politicians Campaign Too Much and Govern Too Little*)، مطبوعہ (New York: Free Press, 1999)۔ امریکی سیاست کا کنگ کا کام بہت شاندار ہے اور اس میں وہ انداز ملتا ہے جو

امریکی سیاست پر دوسری امریکی تحریروں میں نہیں ملے گا۔

14۔ ''سین فرانسسکو کرانیکل''(*San Fransico Chronicle*)، شمارہ 20 مئی 1998 میں دیکھئے: ''لوگوں کا انقلاب''(The People's Revolution)۔

15۔ ''پٹڑی سے اتری جمہوریت: تحریک گزاری کی مہم اور پیسے کی طاقت''(*Democracy Derailed: Intiative Campaigns and the Power of Money*)، مصنف ڈیوڈ بروڈر(David Broder)، مطبوعہ (New York: Harcourt, 2000)۔

16۔ ''ویکلی سٹینڈرڈ''(*Weekly Standard*)، شمارہ 31 جولائی 2000 میں دیکھئے: ''کیلیفورنیا سے فرق نہیں پڑتا''(California Doesn't Matter)، مصنف فریڈ بارنس(Fred Barnes)۔

17۔ ''نیوز ویک''(*Newsweek*)، شمارہ 25 نومبر 1978 میں دیکھئے: ''ٹیکسوں کی سیاست''(The Politics of Taxes)، مصنف سوزن فریکر(Susan Fraker)۔

18۔ ''کیلیفورنیا سے فرق نہیں پڑتا''(California Doesn't Matter)، بارنس(Barnes)۔

19۔ ''ہارپر 289 نمبر 1734(نومبر 1994)''(*Harper 289, no. 1734(November 1994)*) میں دیکھئے: ''کیلیفورنیا کی منتخب انارکی: حکومت جو عوامی ریفرنڈم سے ختم ہوئی''(*California's Elected Anarchy: A Government Destroyed by Popular Referndum*)، مصنف پیٹر شرگ(Peter Schrag)۔ پیٹر کی ''گم شدہ جنت: کیلیفورنیا کا تجربہ، امریکہ کا مستقبل''(*Paradise Lost: California's Experience, America's Future*)، مطبوعہ(Berkeley: University of California Press, 1999) بھی دیکھئے جو پورے ملک میں سیاست کی جماعتوں میں پڑھائی جانی چاہیے۔

20۔ ''نیویارک ٹائمز''(*New York Times*)، شمارہ 30 ستمبر 1990 میں دیکھئے: ''ووٹر اپنے علاقوں کا بجٹ رد کرنا جاری رکھے ہوئے ہیں''(Voter's Keep Rejecting Their Town's Budgets)۔

چھٹا باب

1۔ ''مورگن: امریکی فنانسر''(Morgan: American Financier)، مصنف جین سٹروس(Jean Strouse)، مطبوعہ(New York: Random House)، صفحہ 8۔

2۔ ''نیویارک ٹائمز''(New York Times)، شمارہ 13 ستمبر2000 میں دیکھئے: ''بینکنگ کا بڑا سودا''(Banking's Big Deal)، مصنف ساؤل ہینسل (Saul Hansell)۔

3۔ فنانشل مارکیٹ پر یہ حصہ تحریر کرتے ہوئے میں ڈونلڈ میرن (Donald Marron) کیساتھ گفتگو سے بہت مستفید ہوا ، جو ماضی قریب تک پین ویبر(Paine Webber) کے چیف ایگزیکٹو تھے۔

4۔ ''لیکسس اور زیتون کا درخت''(The Lexus and the Olive Tree)، مصنف تھامس فریڈ مین(Thomas Friedman)، مطبوعہ(New York: Farrar, Straus and Giroux, 2000)، صفحہ 50۔

5۔ ''ہمارا آئندہ صدی کا تصور''(Our Next Century Vision)، مصنف جیری فیلول(Jerry Falwell)، 12 جولائی 1998، www.trbc.org/sermons پر دستیاب ہے۔

6۔ ''نیویارک ٹائمز میگزین''(New York Times Megazine)، شمارہ 5 فروری 1995 میں دیکھئے: ''جنسی تعلق نہیں، نشہ نہیں، لیکن صرف راک این رول''(No Sex, No Drugs, but Rock 'N Roll)، مصنف نکولس داوڈف (Nicholas Dawidoff)۔

7۔ ''نیویارک ٹائمز''(New York Times)، شمارہ 24 دسمبر 1985 میں دیکھئے: (TV Minister Calls His Resort 'Bait' for Christianity)، مصنف ولیم ای شمڈ (William E. Schmidt)۔

۔ ''جیری فیلول کی کتاب: بنیاد پرستوں کی زبان اور سیاست''(The Book of Jerry Falwell: Fundamentalist Language and Politics)، مصنف سوزن فرینڈ ہارڈنگ(Susan Friend Harding)، مطبوعہ(Princeton:

Princeton University Press, 2000)، صفحہ 260۔

9۔ "Ministers and Marches"، 21 مارچ 1965، مصنف جیری فیلول (Jerry Falwell)، بحوالہ "جیری فیلول کی کتاب" (*The Book of Jerry Falwell*)، ہارڈنگ (Harding)، صفحہ 22۔

10۔ "سیکرز چرچ: روایتی مذہب کی ترویج غیر روایتی انداز سے" (*Seekers Churches: Promoting Traditional Religion in a Non-Traditional Way*)، مصنف کیمون ہاؤلینڈ سارجنٹ (Kimon Howland Sargeant)، مطبوعہ (New Brunswick, N.J.: Rutgers University Press, 2000)، صفحات 1, 4-5۔

11۔ "کتابوں کے لئے جذبات: دی بک آف دی منتھ کلب، ادبی ذوق اور متوسط طبقہ کی خواہش" (*A Feeling for Books: The Book-of-the-Month Club, Literary Taste, and Middle-Class Desire*)، مصنف جینس ریڈوے (Janice Radway)، مطبوعہ (Chapel Hill: University of North Caroline Press, 1997)، صفحہ 161۔

12۔ "نوبرو" (*Nobrow*)، مصنف جان سیبروک (John Seabrook)، مطبوعہ (New York: Knopf, 2000)۔

13۔ "نیوری پبلک" (*New Republic*)، شمارہ 19 جون 2000 میں دیکھئے: "فن ہاؤس میں خوش آمدید" (Welcome to the Funhouse)، مصنف جڈ پرل (Jed Perl)۔

14۔ "اکتسابی سماج" (*The Acuisitive Society*)، مصنف آر ایچ ٹاؤنی (R. H. Tawny)، مطبوعہ (New York: Harcourt Brace, 1920)، صفحہ 92۔

15۔ ''نئے اسقفِ اعلیٰ: خانہ جنگی کے بعد کے امریکہ میں وکلا'' (*The New high Priests: Lawyers in Post-Civil War America*)، مرتبہ گیرڈ ڈبلیوگالٹ (Gerard W. Gawalt)، مطبوعہ (Westport, Conn.: Greenwood Press, 1984) میں دیکھئے ''قانون میں تصوراتی اور حقیقی: نیویارک کے وکلا کے خیالات 1870-1920'' (The Ideal and Actual in Law: Fantasies of New York Lawyers, 1870-1920)، مصنف رابرٹ گورڈن (Robert Gordan)؛ اور گورڈن کی ''امریکہ میں پیشے اور پیشہ وارانہ نظریے'' (*Professions and Professional Ideologies in America*) مطبوعہ (Chaper Hill: University of North Caroline Press, 1983)، مرتبہ گیرالڈ ایل گیسن (Gerald S. Geison)، مطبوعہ (Chapel Hill: University of North Caroline Press, 1983) میں دیکھئے ''امریکی انٹرپرائز کے دور میں قانون اور قانونی فکر'' (Legal Thought and Legal Practice in the Age of American Enterprise, 1870-1920)۔ ''گم شدہ وکیل: وکالت کے ناکام ہوتے ہوئے آدرش'' (The *Lost Lawyer: Failing Ideals of the Legal Profession*)، مصنف انتھونی کرونمین (Anthony T. Kronman)، مطبوعہ (Cambridge, Mass.: Harvard University Press, 1993)۔

16۔ ''آنیوالا: مستقبل واقع ہو گیا'' (*Next: The Future Just Happened*)، مصنف مائیکل لوئس (Michael Lewis)، مطبوعہ (New York: Norton, 2002)، صفحہ 5۔ لوئس نے جمہوریت اور بالخصوص قانون اور فنانس پر انٹرنیٹ کے اثرات کا بیان بہت شاندار انداز سے کیا ہے۔

17۔ ''وال سٹریٹ جرنل'' (*Wall Street Jouna*l) شمارہ 14 مارچ 2002 میں دیکھئے: ''کیا آپ نے اکاؤنٹنٹ کا قصہ سنا'' (*Did You Hear the One About the*

Accountant?)مصنف آئینتھ جین ڈیوگن(Ianthe Jeanne Dugan)۔

18۔ ''امریکی جمہوریت کا معضلہ: ایلیٹ، مخصوص مفادات اور عوامی اعتماد سے دغا''(*The Paradox of American Democracy: Elites, Special Interests, and the Betrayal of the Public Trust*)، مصنف جان جودیس(John Judis)، مطبوعہ (New York: Random House, 2000)، صفحہ 21۔

19۔ ''اٹلانٹک منتھلی''(*The Atlantic Monthly*)، شمارہ جنوری 1986 میں ''نظریات قوموں کو حرکت دیتے ہیں''(Ideas Move Nations)، مصنف گریگ ایسٹر بروک(Greg Easterbrook)۔

20۔ ''میں نے اس کا بہترین دیکھا ہے''(*I've Seen the Best of It*)، مصنفین جوزف الپس (Joshph Alsop) اور ایڈم پلٹ (Adam Platt)، مطبوعہ (New York: Norton, 1992)۔ گروٹن پر دیکھئے: ''ایچیسن: وزیر خارجہ جس نے امریکی دنیا تخلیق کی''(*Acheson: The Secretary of State Who Created the American World*)، مصنف جیمز چیس(James Chace)، مطبوعہ(New York: Simon and Schuster, 1998)؛ اور دیکھئے: ''پر حکمت لوگ: چھ دوست اور دنیا جو انہوں نے بنائی''(*The Wise Men: Six Friends and the World They Made*)، مصنف والٹر آئزک سن(Walter Isaacson) اور ایون تھامس (Evan Thomas)، مطبوعہ(New York: Simon and Schuster, 1986)۔

21۔ جس کا بہت کم حوالہ ملتا ہے؛ ''پروٹسٹنٹ اسٹیبلشمنٹ: امریکہ میں اشرافیہ اور کاسل
''*The Protestant Establishment: Aristocracy and Castle in*
America)، مصنف ای ڈگبی بیزل (E. Digby Baltzell)، مطبوعہ (New York:
Random House, 1964)۔ اس کی دوسری کتابیں پڑھنے کے لائق ہیں،
خصوصاً ''فلاڈلفیا کے باؤ: نیشنل اپر کلاس کی تشکیل'' (*Philadelphia Gentleman:*
The Making of a National Upper Class) مطبوعہ (New Brunswick, N.
J.: Transaction Publisher, 1989)؛ اور اسکی دلچسپ آخری کام ''کھلاڑی باؤ:
مردوں کا ٹینس، عزت کے دور سے سپر سٹار کی عقیدت تک'' (*Sporting Gentlemen:*
Men's Tennis from the Age of Honor to the Cult of Superstar)،
مطبوعہ (New York: Free Press, 1995)

22۔ یہ قول اکثر سٹینلے بالیڈون (Stanley Baldwin) سے منسوب کیا
جاتا ہے مگر لگتا ہے پہلی مرتبہ کپلنگ (Kipling) نے استعمال کیا تھا۔

23۔ ''بڑا امتحان: امریکی میرٹوکریسی کی خفیہ تاریخ'' (*The Big Test:*
The Secret History of the American Meritocracy)، مصنف نکولس
لیہمن (Nicholas Lehman)، مطبوعہ (New York: Farrar, Straus, and
Giroux, 1999)، صفحہ 14۔

24۔ یہ مثال وائن کریگ ویڈ (Wyn Craig Wade)، کی ''دی
ٹائٹینک'' (*The Tatnic*)، مطبوعہ (New York: Rawson, Wade, 1979)۔

نتیجہ

1۔ ''فارن افیئرز'' (*Foriegn Affairs*)، شمارہ نومبر، دسمبر 1997 میں
دیکھئے: ''کیا حکومت بہت سے زیادہ سیاسی ہے'' (Is Government Tool

Political)، مصنف ایلن بلینڈر(Alan Blinder)۔

2۔ اس موضوع پر وسیع اور دلچسپ ادب موجود ہے۔ تاہم اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام کا خلاصہ بہتر نقطہ آغاز ہوسکتا ہے: (*Human Development Report 2002: Deeping Democracy in a Fragmented World*)، مطبوعہ (New York: Oxfor University Press, 2002)، صفحہ 56۔ اسمیں حوالے کے طور پر ملنے والی کتابیں پڑھنے کے قابل ہیں، خصوصاً دیکھیے: ''جمہوریت اور ترقی: سیاسی ادارے اور دنیا میں فلاح 1950-1990'' (*Democracy and Development: Political Instiutions and Well-Being in the World, 1950-1990*)، مصنفین ایڈم پروزسکی (Adam Przeworski)، مکائیل ای ایلورز (Michael E. Alvarez)، جوز اینٹنیو (Jose Antonio) اور فرنینڈو لیمونگی (Fernando Limongi)، مطبوعہ (New York: Cambridge University Press, 2000)۔

....